احمد فراز شخصیت اور فن

مقالہ برائے

پی، ایچ، ڈی (اردو)

ریسرچ اسکالر

محمد فضیل اختر

نگران

پروفیسر رفعت النساء بیگم

شعبۂ اردو یونیورسٹی آف میسور،

میسور کرناٹک

مئی 2019

Ahmad Faraz Shakhsiyath Aur Fan

Ph.D Thesis (Urdu)

By
Mohammed Fuzail Akhtar

Guide

Prof. Rafathunnisa Begum
Dept. of Studies in Urdu,
University of Mysore
Mysore, Karnataka.

May 2019

PDF By :

Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell Number : +92 307 2128068

Facebook Group Link :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/

فہرست

پیش لفظ

احمد فراز کا شمار عالمی شہرت یافتہ ادباء و اشعراء میں ہوتا ہے ، انھوں نے اپنے شعری سرمایہ کی بدولت نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ احمد فراز بیسویں صدی کے بین الاقوامی سطح کے شعری منظر نامے میں خوبصورت ، منفرد اور توانا آواز کے حامل شعراء کی صفِ اوّل میں شمار کیے جاتے ہیں، انھوں نے نہ صرف رومان اور معاملات حسن و عشق کو موضوع سخن بنایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی معاشرتی ناہمواریوں ، جبر و تشدد کے ماحول، غاصب اور استحصالی قوتوں، نااہل حکمرانوں، مارشل لائی آمریت، غریب عوام کی حق تلفی اور بین الاقوامی سطح پر مطلق العنانی کے خلاف بھرپور احتجاج اور مزاحمت کا اظہار کیا۔ انھوں نے روایت کا احترام کیا اور انھیں نئے سانچوں میں ڈھال کر پیش کرنے کا عمل بھی جاری رکھا، انھوں نے انسانی نفسیات کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا اور پھر ان نفسیات کو اپنی غزلوں اور نظموں میں پیش کیا۔

2014ء میں جب میں نے اپنے پسندیدہ موضوع، "احمد فراز شخصیت اور فن" کے ایک بسیط خاکے کو اپنی نگران کار کے سامنے پیش کیا تو نہ صرف اجازت مرحمت فرمائی بلکہ حوصلہ افزائی کرتے ہوئے یونیورسٹی سے اس موضوع پر باقاعدہ کام کرنے کی سفارش بھی کی۔ چنانچہ پروفیسر رفعت النساء بیگم کی نگرانی میں تقریباً پانچ سال کی کاوش کے بعد اب یہ مقالہ تکمیل کو پہنچا، اس مقالے میں احمد فراز کی شخصیت اور فن کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے عہد کا خاص خیال رکھا گیا اس سلے میں ہندوستان اور پاکستان سے شائع شدہ فراز نمبر اور رسائل میں چھپنے والے مضامین و خاکوں کے ساتھ فراز پر لکھی گئی کتب سے رہنمائی حاصل کی گئی تاکہ احمد فراز کی شخصیت اور فن کو ایک بڑے کینوس پر پھیلا کر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جاسکے۔ اس مقالے کو کل چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا باب: احمد فراز، حالات زندگی، شخصیت اور ماحول ہے، باب کے شروع میں اُس سیاسی، سماجی و ادبی پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں احمد فراز کی شخصیت اور شاعری پروان چڑھی، اس کے بعد احمد فراز کی سوانح اور شخصیت کا احاطہ کیا گیا ہے، اس باب میں احمد فراز پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا گیا اور ان کی زندگی کے کئی نیے پہلو تلاش کیے گیے ہیں۔

دوسرا باب: احمد فراز کی شاعری میں ترقی پسندی۔ اس باب کے تحت احمد فراز کی ایسی نظموں اور غزلوں سے بحث کی گئی ہے جن میں ترقی پسند خیالات نمایاں ہیں، فراز کی ترقی پسندی کے تحت ضیائی عہد اور ان کے مارشل لاء کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

تیسرا باب: احمد فراز بحیثیت جدید شاعری ہے، اس باب کے تحت احمد فراز کی شاعری کے ان گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے، جن میں ان کی جدید شاعری کا رنگ نظر آتا ہے ساتھ ہی ساتھ ایسی نظموں اور غزلوں سے بحث کی گئی ہے جو اپنے اندر روایتی انداز رکھتے ہوئے بھی جدیدیت سے قریب ہیں۔

چوتھا باب: احمد فراز اور ان کے معاصرین۔ اس باب کے تحت احمد فراز کے معاصرین کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے ، خصوصاً، ناصر کاظمی ، باقر مہدی، ابن انشا، خلیل الرحمن اعظمی، منیر نیازی، حبیب جالب، وحید اختر، شہریار، ندا فاضلی، کشور ناہید، امجد اسلام امجد، پروین شاکر، شکیب جلالی، مخمور سعیدی ، مظفر حنفی، اور بشیر بدر وغیرہ کی شاعری کا مختصر تجزیہ کیا گیا ہے۔

پانچواں باب: احمد فراز کی شاعری کا عمومی جائزہ۔ اس باب کے تحت احمد فراز کی شاعری کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے، اس سلسلے میں احمد فراز کے تقریباً تمام شعری مجموعوں کو تاریخی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے ، ساتھ ہی ساتھ ہر شعری مجموعے کے بارے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کس مجموعے میں فراز کی کتنی غزلیں اور کتنی نظمیں ہیں۔ اور ہر مجموعے کی اہم اہم نظموں اور غزلوں کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے مزید یہ کہ فراز نے کس مجموعے کو کس کے نام منسوب کیا ہے اور کس نے فراز کے مجموعوں پر تبصرہ کیا ہے۔

چھٹا باب: احمد فراز کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ۔ اس باب کے تحت احمد فراز کی پوری شاعری کا مکمل تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں ماحصل کے عنوان سے پورے مقالے کا نچوڑ پیش کیا گیا
۔

اس مقالے کی تکمیل میں بہت سوں کا تعاون شامل ہے، ان میں سے بعض خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں ۔ سب سے پہلا شکریہ میری مربیہ پروفیسر رفعت النساء بیگم کے لیے جنھوں نے اس مقالہ کو دقتِ نظری سے بالتفصیل دیکھا، قدم قدم پر میری اصلاح کی، مفید مشورے دیے اور منزل کی راہ سمجھائی، یہ

صرف رسمی شکریہ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کی خصوصی توجہ حاصل نہ ہوتی اور وہ مجھے بار بار کمال مہربانی سے مقالہ مکمل کرنے پر نہ اکساتیں تو شائد یہ کام مزید کئی برسوں میں بھی پورا نہ ہو پاتا۔

دوسرا خصوصی شکریہ ہمارے دوست توصیف خان (ریسر اسکالر دہلی یونیورسٹی) کا ادا کرنا ہے جنھوں نے رسائل و کتب کی فراہمی کے ساتھ ساتھ دہلی یونیورسٹی اور جے این یو یونیورسٹی سے کتب کی تلاش میں میرا ساتھ دیا مزید جو مواد ہندوستان میں مہیا نہ ہو سکا اس کو بیرون ممالک سے حاصل کرانے میں مدد کی، ٹائپنگ اور پروف ریڈینگ کے ضمن میں جویریہ بتول اور اویس اختر کا شکریہ بھی لازم ہے۔

اس کے علاوہ میرے اہل خانہ، والدہ محترمہ، بڑے بھائی مولانا جاوید اختر قاسمی، مولانا عمیر اختر قاسمی اور چھوٹے بھائی اویس اختر کا بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے ہر موقع پر حوصلہ افزائی اور رہنمائی فرمائی۔

ان سب احباب کے ساتھ میری بیگم عائشہ کامران بھی شکریہ کی مستحق ہیں، جنھوں نے مسلسل یاد دہانی کرا کے مجھے اس کام کی طرف راغب رکھا، بیٹی مائشہ ذکی اور سب سے چھوٹے بھائی سہیل اختر کو ڈھیر سارا پیار۔

اس مقالے کو میں نے اپنی استطاعت کے مطابق تکمیل تک پہنچایا اور اس کی تکمیل کے موقع پر والد مرحوم کی روح کو ہزارہا درود و سلام کے ساتھ اللہ رب العزت کے حضور سر بسجود ہوں۔

محمد فضیل اختر

پہلا باب

احمد فراز، حالاتِ زندگی: شخصیت اور ماحول

پاکستان کا سیاسی و سماجی منظر نامہ :

پاکستان جب معرضِ وجود میں آیا تو بد قسمتی سے آغاز ہی میں کئی مشکلات کی زد میں رہا ۔ پہلی بات یہ کہ انگریزوں نے پاک بھارت سرحدوں کی ایسی تقسیم کی کہ یہاں امن قائم ہونے کے دور دور تک آثار نظر نہیں آئے۔ کبھی مسئلہ کشمیر اور کبھی پانی کی تقسیم کا مسئلہ سر اٹھانے لگا۔ ہندوستان میں پارلیمانی نظام تو بن گیا تاہم پاکستان میں نہیں بن سکا۔ کئی سالوں تک دستور نہ بن سکا اور جب بن گیا تو جمہوریت ملوکیت میں بدل گئی۔ تعلیم میں ہندوستان سے بہت پیچھے رہ گیا۔ یہاں مستحکم نظامِ حکومت قائم نہیں رہ سکا دوسرے معنوں میں اس کو مستحکم ہونے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا موقع ہی نہیں دیا گیا، جس کی سب سے بڑی وجہ آئے دن حکومت میں تبدیلیاں ہوتی رہیں تھیں۔

پاکستان کے مسلمانوں نے آزادی سے پہلے کچھ خواب دیکھے تھے۔ جینے کے خواب، من پسند زندگی بسر کرنے کے خواب، آزادی اور خود مختاری کے خواب، مضبوط سیاسی استحکام کے خواب، روٹی کپڑا اور مکان کے خواب۔ ان مسلمانوں کو ایسے دورِ حکومت کا انتظار تھا جہاں خلقِ خدا، راج کرے گی ۔ جہاں مذہبی آزادی ہو گی، جہاں تقریر و تحریر پر کوئی قدغن نہ ہو گا۔ جہاں غلامی کے اندھیرے ہمیشہ

کے لیے چھوٹ جائیں گے۔ جہاں سُکھ کا سانس نصیب ہو گا، مظلوم کی حمایت ہو گی، غریب کو اس کا حق ملے گا، سر مایہ داری اور جاگیر داری کا خاتمہ ہو گا، انگریز سامراج کی غلامی سے نجات مل جائے گی۔ جہاں زندگی بسر کرنے کے سنہرے اصول ہوں گے۔ اپنی حکومت اور مستحکم زندگی کا دور دورہ ہو گا۔ اس منزل کی تلاش میں مسلمانوں نے جان ومال کی قربانیاں پیش کیں، لیکن ان بد قسمت لوگوں کے آزادی کے باوجود یہ تمام خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے۔ سیاسی آزادی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا اور معاشرتی و سماجی اور شخصی آزادی کی طرف سے توجہ ہٹ گئی۔ اس حوالے سے کنیز فاطمہ اپنے مضمون "چھ ستمبر اور اس کے بعد" میں لکھتی ہیں:

"پاکستان بنانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمان ہندوں کے اثر سے اقتصادی طور پر بھی آزاد ہونا چاہتے تھے، مگر ہوا یہ کہ ہندو صنعت کار کی جگہ مسلمان صنعت کار نے لے لی جو چند وجوہات کی بنا پر تو مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں یا بمبئی یا بہار یا یو۔پی کے مہاجرین ہیں جو تقسیم ملک کے بعد مشرقی پاکستان میں جا کر آباد ہوئے؛ لہٰذا وہاں اقتصادی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی اور یہی وجہ ہے کہ عام آدمی کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ گویا جس مقصد کے لیے انھوں نے پاکستان مانگا تھا وہ پورا نہیں ہوا۔ [1]

کسی بھی قوم کے لیے ضروری ہے کہ وہ زمانے کے ساتھ چلے۔ نئے تصورات و نظریات اپنائے۔ لیکن پاکستان بد قسمتی سے ترقی کے بجائے انحطاط کی طرف چلا گیا۔ وہاں کے سیاست دانوں نے برطانوی نظریات اپنائے اور نظریہ پاکستان کو بھول گئے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بن تو گیا، لیکن اس کا نام اسلامی جمہوریت کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔

محمد علی جناح کی موجودگی تک انتظام کو کسی نہ کسی طرح خلوص اور نیک نیتی سے چلایا جارہا تھا، لیکن اُن کی رحلت کے بعد سیاسی ڈھانچہ تبدیل کر دیا گیا۔ ملک بے شمار مسائل کا شکار ہو گیا۔ سیاسی عدم استحکام شروع ہوا اور اس کے بہت برے اثرات مرتب ہوئے۔ دورِ غلامی اور موجودہ حالات میں یکسانیت کو عوام نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ اس بارے میں فرمان فتح پوری اپنی کتاب " اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ" میں یوں رقم طراز ہیں:

> **"جمہوری سیاسی نظام جو ان مسائل کا حل تلاش کرتا ہے وہ خود متزلزل و غیر مستحکم بلکہ بیشترا وقات معدوم رہا۔ جمہوریت، مساوات اور عدل کے لفظ کاغذ پر لکھے گئے، ان کی تعبیریں بھی بتائی گئیں، مگر عملاً مفہوم و معنی سے محروم رہے ۔ دینداری، مذہبی رواداری، اخوت، مساوات، کشادہ نظری ،حریت قلم اور آزادی فکر و نظر کے ڈھول پیٹے بہت گئے ،لیکن عملی زندگی میں ان کے نشانات کہیں نظر نہ آئے، بلکہ ان کے برعکس تنگ نظری، جانب داری ،سفارش ،کینہ پروری، طبقاتی منافرت، رشوت، چور بازاری اور زبان بندی کی لعنتیں نہ صرف یہ کہ برقرار رہیں بلکہ ان کا دائرہ اثر روز بروز بڑھتا گیا اور ماحول کو حد درجہ بے رنگ و بے کیف کر گیا**
>
> [2]"

محمد علی جناح کو ابھی کافی نو آموز ملک پاکستان کے لئے بہت سارے کام کرنے تھے مگر زندگی نے وفا نہ کی چنانچہ پاکستان کی آزادی کی خوشی میں سوگ کا پہلا مرحلہ اس وقت آیا جب محمد علی جناح 11 ستمبر 1948 کو اس جہاں سے رحلت کر گئے ان کی رحلت سے پاکستانی قوم یتیم سی ہو گئی ، ان کے بعد پاکستان میں لیڈر شپ کا خلا پیدا ہو گیا تاہم لیاقت علی خان نے کسی نہ کسی طرح محمد علی جناح کے عہدے کو سنبھالا، لیاقت علی خان کی حکمت عملی نے قوم کے مزاج میں تبدیلی پیدا کی لیکن سماج دشمن عناصر کو

ان کا منصب جلیلہ بھایا نہیں اور ان کو 16 اکتوبر 1951 کو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے گولی مار کر قتل کر دیا گیا، لیاقت علی خان کے قتل نے ملک کو ہلچل سے دور چار کیا۔ ملکی حالات بگڑ گئے۔ بیوروکریسی نے اقتدار پر قبضہ جمالیا۔ سیاسی خلفشار اور عدم استحکام نے سر اٹھالیا۔ کر سئہ اقتدار کے لیے کوششیں تیز تر ہونے لگیں۔ ملکی مفاد کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا اور ذاتی مفادات کے لیے حکمرانی کے خواب دیکھے جانے لگے۔ عوام کا پرسانِ حال کوئی نہ رہا۔ آزادی سے پہلے کیے گیے وعدوں پر پانی پھر گیا۔ روٹی، کپڑا، مکان کی بات صرف نعروں کی حد تک محدود رہی۔ عوام کی بے چینی اور ذہنی انتشار میں اضافہ ہو گیا۔ عوام نے آزادی کے جو سنہرے خواب دیکھے تھے وہ شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے۔ اُن کو محسوس ہوا کہ انھوں نے داغ داغ اجالے میں قدم رکھا ہے۔ یہاں صرف زمین بدل گئی، نظام حکومت نہیں بدلا۔ حکمران اپنی تجوریاں بھرنے کے لیے تگ ودو میں مصروفِ عمل دکھائی دیے۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات اب بھی نہیں ملی۔ لوگوں پر عیاں ہو گیا کہ صرف جسمانی آزادی سے کچھ نہیں ملنے والا، جب تک ذہنی غلامی سے نجات نہ ملے، لیکن یہاں ذہنی غلامی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا، اس حوالے سے، پروفیسر فتح محمد ملک اپنی کتاب ا"حمد فراز کی شاعری نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار" میں لکھتے ہیں:

> **"بدنصیبی سے پاکستان میں شہیدِ ملت لیاقت علی خان کے فوراً بعد افسر شاہی مسندِ اقتدار پر فائز ہو گئی۔ برطانوی استعمار کی تر تبیت یافتہ افسر شاہی نے آزاد اور غیر جانبدار خارجہ پالیسی تر ک کر کے سرد جنگ میں مغربی سرمایہ دار کیمپ کی پیروی کا راستہ اختیار کر لیا۔۔۔۔۔ چنانچہ وطن عزیز میں عدل وانصاف اور حریت ومساوات کے اصول واقدار پر مبنی ایک جدید اور ترقی پسند معاشرے کے قیام کے خواب رفت گز شت ہوئے اور امریکی تابعداری نے عبادت کا درجہ حاصل کر لیا۔"**[3]

دوسرا ستم یہ کہ کسی کی جان ومال محفوظ نہیں تھی۔ حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ شہر میں کسی کی عزت وآبرو محفوظ نہیں تھی۔ بھرے بازاروں میں دن دہاڑے گولیاں چلتی تھیں۔ لوگ بے گناہ قتل ہوتے، عورتیں اغوا کرلی

جاتیں۔ غنڈہ گردی زوروں پر تھی۔ سیاسی نمائندے غنڈوں کی پشت پناہی کرتے، بلکہ مخالف گروہوں پر حملے کرواتے۔ جلسے توڑنا، کارکنوں کو قتل کرنا معمول بن گیا تھا۔ غنڈوں کے ذریعے جعلی ووٹ ڈلوائے جاتے حتیٰ کی کئی غنڈے اسمبلی کے ممبر بھی بن گئے۔ ناجائز اسلحے کی بھرمار جاری وساری نظر آتی اور پولیس دیکھتی رہتی۔۔۔ پولیس بھی بے بس تھی کیونکہ جب وزراء اور سیاست دان غنڈوں کے سرپرست بن جائیں تو پولیس والے کیا کریں۔ علاوہ ازیں پولیس پر قانوں شکنی، رشوت خوری، ناجائز زدوکوب اور قتلِ عام کے الزامات لگے۔ پولیس اپنے اختیارت کا

ناجائز استعمال کرتے۔ امن عامہ اور تحفظ ذات کے مسائل روز بروز بڑھتے گئے۔ معمولی سی بات پر قتل وغارت گری معمول بن گیا تھا۔ عوام تو انگریزی قانون کی بالادستی سے نالاں تھے ہی، ملک میں برطانوی پارلیمانی نظام اور وزراء کی کارکردگی کو خود صدرِ پاکستان نے تنقید کا نشانہ بنایا۔ صدرِ پاکستان سکندر مرزا نے اپنے خطاب میں فرمایا:

> **" ہمارے وزراء کو اپنے عہد اقتدار میں اپنی ساری صلاحیت**
> **اور قوت**
> **پارلیمنٹ کے ارکان کو خوش رکھنے میں صرف کرنی ہوتی ہے**
> **۔خواہ اس میں انھیں نظم ونسق کے بنیادی تقاضوں کو نظر**
> **انداز کیوں نہ کرنا پڑے "**[4]

اُس وقت صدرِ پاکستان سکندر مرزا نے جمہوریہ کے وزراء کے چہروں سے خود نقاب الٹ دیے ۔اور قوم کو بتایا کہ پاکستان کی ترقی کے لیے کتنا کام ہو رہا ہے۔ اُنھوں نے جمہوریت کے چہرے سے نقاب ہٹا کر عوام کے جزبات کی ترجمانی کی۔ انھوں نے خود اس بات کی تصدیق کی کہ ہمارے ملک میں برطانوی پارلیمانی نظام نہیں چل سکتا۔ ان کا مدعا تو یہ تھا کہ اس کو ملک کے حالات کے مطابق ڈھالا جائے

، لیکن عوام نے اس کی حمایت نہیں کی۔ علاوہ ازیں وزیر اعظم صاحبان وعدے کر کے عہد شکنی کے مرتکب ہوتے گئے۔ مختلف کالے قوانین کے نفاذ نے عوام کی تشویش کو بڑھا دیا۔ اس حوالے سے کنیز فا طمہ اپنے مضمون "چھ ستمبر اور اس کے بعد" میں یوں رقم طراز ہیں:

"پاکستانی قیادت امیر طبقے سے پیدا ہوئی تھی۔ امیروں کے مقابلے میں غریبوں کی وہی حیثیت تھی جو زمیندار کے مقابلے میں مزدوروں کی ہوتی ہے کہ بیگار کے بعد بھی کسی مزدوری کا اہل نہیں سمجھا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لیڈر اور عوام ایک دوسرے کے قریب نہ آسکے، ان کے نظریات میں ایک بعُد قائم رہا۔ مغربی تعلیم سے بھی مغربی طبقہ ہی آراستہ ہوا اور اسی طبقے کے ذہن میں اسلام سے بُعد بھی پیدا ہوا۔ لہٰذا پا کستان کے امیر اور غریب طبقوں میں سیاسی شعور بھی مختلف ہے۔ امیر قومیت کا حامی ہے اور غریب اسلام کو اپنی تمام مشکلات کا حل سمجھتا ہے اور اسلام کے نام پر ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہے "[5]

چنانچہ سب نے محسوس کیا کہ پہلے انگریز یہاں بنفسِ نفیس حکومت کرتا تھا، لیکن اب یورپ میں بیٹھ کر پاکستان کے حکمرانوں کو اپنے اشاروں پر نچوا رہا ہے۔ علاوہ ازیں جاگیرداری و سرمایہ داری کا جا دو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ غریب اپنے حقوق کے لیے ترس رہا ہے۔ انصاف نام کی کوئی چیز ملک میں مو جود نہیں۔ آئے دن حکومتیں ٹوٹ رہی ہیں۔ اپنے اپنے مفادات کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ قیام پاکستان سے لے کر 1957ء تک کئی بار حکومت کی بساط اُلٹ گئی جس سے ملکی حالات انتہائی بگڑ گئے۔ ان حالات میں عوام کی خبر گیری کے لیے کوئی موجود نہیں۔ 1956ء میں پہلی بار آئین تشکیل پایا، جس میں ملکی امور اور سیاسی و سماجی بہتری کے لیے کئی اقدامات کی منظوری دی گئی لیکن ان اصولوں پر عمل نہیں کیا گیا ۔ ان سب حالات کے پیشِ نظر سکندر مرزا نے مناسب یہی سمجھا کہ اب مزید

پارلیمانی نظام میں وزراء مخلص نہیں ہیں اس لیے اُنھوں نے مارشل لاء کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ رہی سہی کثر اس وقت پوری ہو گئی جب 1957ء میں پہلا مارشل لاء نافذ کیا اور ٹوٹی پھوٹی جمہوریت بھی آمریت میں بدل گئی۔

پاکستان میں جنرل ایوب خان کے مارشل لاء کے ساتھ ملک کے سیاسی وسماجی حالات میں یکسر تبدیلی واقع ہوئی۔ عوام جو اس سے پہلے ٹوٹی پھوٹی جمہوریت میں سانس لے رہے تھے اور ہزار ہا شکوے لبوں پہ لے کے جی رہے تھے۔ اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کی اصل آزمائش تو اب شروع ہو گئی۔ اس مظلوم عوام نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آمریت وہ تاریکی ہے جس سے جمہوریت کا ٹمٹماتا چراغ صد ہا درجے بہتر ہے۔ چنانچہ فوجی آمریت میں قدم رکھتے ہی ان کو جمہوریت کی یاد ستانے لگی۔ آمریت کے آتے ہی ملک میں وسیع پیمانے پر ماحول میں ہر طرف دھواں بھر گیا۔ دل و دماغ سب کچھ آمریت کی زد میں آ گیا ۔لوگوں کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ انسان جب اپنی جبلتوں سے مغلوب ہو

جاتا ہے تو وہ انسانیت کے اعلیٰ ورافع مقام سے گر جاتا ہے اور حیوانیت کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ پھر انسان بھی اس کے لیے محض حیوان بن جاتا ہے اور ان سے حیوانوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ جس معاشرے میں اظہارِ رائے کی آزادی، جمہوری سوچ اور خود مختاری پر قدغن لگ جائے، فردِ واحد کی حکمرانی شروع ہو جائے، بھلا وہاں انسانیت کیسے پنپ سکتی ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر ساجد امجد "اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات" میں لکھتے ہیں۔

> **" افسوس کہ پاکستان کی زمین آنکھ کھولتے ہی سیاسی انتشار کا شکار ہو گئی۔وزارتوں کی جلد جلد تبدیلی، بار بار مارشل لاء کا نفاذ، آئین سازی میں تاخیر، سیاسی قتل وغیرہ نے صوبائیت اور اقتدار پرستی کو فروغ دیا۔ خاص طور پر 1951ء سے 1957ء تک ملک سیاسی بدحالی کا شکار رہا اور دنیا میں اس کا وقار بالکل گر گیا۔**[6]

اگرچہ جنرل ایوب خان کے دور میں معاشرتی ترقی کے لیے چند بہتر کام بھی ہوئے۔ مثلاً بجلی کی مقدار بڑھانے کے لیے ڈیم تعمیر کیے گئے، لیکن دوسری طرف فرد واحد کی حکمرانی نے لوگوں کا چین سکون غارت کر دیا تھا۔ اُن کی من پسند پالیسیوں سے پورے سماج میں انتشار اور افراتفری پھیلتی گئی۔ سر کاری اذیت گاہیں بڑھ گئیں۔ آمریت پر تنقید کرنے والے کو کڑی سزائیں دی جانے لگیں۔ عوام کے ساتھ وحشیانہ طرزِ عمل اختیار کیا جانے لگا۔ اصول و نظریات خواب بن کر رہ گئے۔ انسانی جانوں کا تحفظ قصۂ پارینہ بن گیا۔ سرکاری مال و مشینری پر سرمایہ داری کا قبضہ جم گیا۔ اعلٰی ترین عہدوں پر من پسند لو گوں کو بٹھایا گیا۔ تعلیم کی ذمہ داریاں پوری نہیں کی گئیں، عوام کو کھانے پینے اور صحت کی سہولتوں سے محروم کیا گیا۔ بجٹ کا بیشتر حصہ فوجی امور کے لیے مختص کیا گیا جس سے عوام کی محرومی مزید بڑھ گئی۔ مہذب اور شائستہ معاشرے کے اثرات دور دور تک نظر نہیں آرہے تھے۔ سماجی حالات روز بروز بگڑنے لگے۔ ہر شعبے میں وحشت، درندگی اور بربریت کا راج قائم ہونے لگا۔ شیخ محمد رفیق کہتے ہیں:

> **"جلد ہی آمریت کے نقصانات سامنے آنے لگے۔ جرا ئم پیشہ لوگ جو وقتی طور پر دب گئے تھے نئی سفارشیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے، فوج کے جن افسران کا عوام کے ساتھ رابطہ ہوا ان میں اسی طرح کی برائیاں سرایت کرنے لگیں جس طرح کہ سول افسران میں تھیں۔ فوجی حکومت نے سول افسران کا اپنا مشیر و مد دگار بنایا تو بیوروکریسی کی تمام قباحتیں سامنے آ گئیں ۔ صرف بیوروکریسی کی صفوں میں ایک نئی کلاس، فوجی بیوروکریسی کا اضافہ ہو گیا۔ رفتہ رفتہ مصنوعی طریقے سے کم کی گئی قیمتیں چڑھنے لگیں۔ سمگلنگ پہلے سے بھی زیادہ وسیع پیمانے پر شروع ہو گئی اور اب برائی کی سرپر**

ستی کرنے والوں کا احتساب کرنے والا بھی کوئی نہ تھا

۔"7

سیاسی خلفشار بڑھتا گیا۔ جمہوریت کے علمبرداروں نے آمریت کے حامیوں کے خلاف محاذ کھول دیا۔ جمہوریت پسندوں اور آمریت پسندوں نے ایک دوسرے پر الزامات کی بھرمار شروع کر دی ۔اندر ہی اندر آمریت کے خلاف شدت بڑھتی جارہی تھی۔ سرکاری طاقت غالب قوت بن گئی تو عوام کا احتجاج بھی شدت اختیار کر گیا۔

بالآخر لوگوں کے احتجاج اور مزاحمت کے پیش نظر جنرل محمد ایوب خان کو مستعفی ہونا پڑا۔ بد قسمتی سے پاکستان میں جمہوریت کم اور آمریت زیادہ فعال رہی ہے۔ جنرل ایوب خان کے بعد جنرل یحیٰ خان آگئے، جن کے دورِ حکومت میں سیاسی و سماجی ناہمواری نے پاکستان کے وجود کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ بنگلہ دیش پاکستان سے الگ ہو گیا۔ 1971ء کی جنگ سے سماجی طور پاکستان کو بہت سے مسائل کا سامنا رہا، جس کی وجہ سے پاکستانی عوام شدید انتشار کا شکار رہی۔ سیاسی عدم استحکام کے سماجی حالات پر خطرناک اثرات مرتب ہوئے۔ انتشار اور افراتفری بڑھ گئی۔ معاشی بدحالی کا دور دورہ ہونے لگا۔ روٹی، کپڑا ،مکان سب کچھ صرف خواب بن کر رہ گیا۔ غریب کا حق سرمایہ دار

لے گیا اور غریب اپنے حقوق کے لیے ترس گئے۔ یہی وہ حالات تھے جن سے علم و دانش کا طبقہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ فرمان فتح پوری "اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ" میں لکھتے ہیں۔

"پاکستانی معاشرہ بارہ پندرہ سال جس قسم کی بد نظمی، اقتصادی بے سمتی۔ بے مقصدیت، انفعالیت، سیاسی درماندگی اور آمرانہ سیاست سے دوچار رہا اسے باشعور و حساس شہری کی حثیت سے اُردو کے شعراء نے محسوس کیا، جو کچھ محسوس کیا ہے اور جس طرح محسوس کیا ہے اسے اپنے اپنے انداز میں بیان کر دیا ہے۔"8

پاکستان میں جنرل ایوب خان اور جنرل یحیٰی خان کے مارشل لاؤں کے بعد رہی سہی کسر جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء نے پوری کر دی۔ پاکستان کی تاریخ میں ضیائی مارشل لاء ملک میں انتہائی تاریکی کا دور تھا۔ اس دور میں عوام اتنے بدحال ہوئے کہ وہ ایوب خان اور یحیٰی خان کے مارشل لائی سختیوں کو بھول گئے۔ ضیائی دور کے حوالے سے طاہر محمد خان اپنے مضمون " احمد فراز کا سماجی شعور اور مزاحمتی شاعری" میں لکھتے ہیں۔

"ملک میں مارشل لاء لگا تھا عسکریوں نے شہریوں کو یرغمال بنا دیا تھا، نعروں پر قید اور تعزیریں تھیں۔ جلسہ کرنے پر کوڑے تھے، ہزاروں

جوانوں نے انصاف کا دروازہ کھولنے کے نام پر اور جمہوری حقوق طلب کرنے پر زندان اور تعزیر دیکھے۔"[9]

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران شہریوں کی جان و مال محفوظ نہیں تھے۔ سماج کی ترقی تو دور کی بات ایک عام شہری اپنے جائز حق کے لیے حکومت وقت کے سامنے زبان نہیں کھول سکتا تھا۔ حکومتِ وقت کے خلاف بولنا گناہ قرار دیا جاتا تھا۔ میڈیا پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ آمر وقت کی پالیسیوں پر احتجاج کرنے والے باغی قرار دیے جاتے اور اُن کو مختلف بہانوں سے گرفتار کرکے جیلوں میں بھیج دیا جاتا۔ لوگوں پر جبر و ظلم کا ایک ناختم ہونے والا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ ہر قسم کی یونینوں پر پابندی عائد کی گئی تھی انسانیت کی فلاح و بہبود کا کسی کو خیال تک نہیں تھا۔ ملک میں ہر طرف لاقانونیت کا راج تھا ۔ معمولی سی خطا پر ستم رسیدوں کو کوڑوں کی سزا دی جاتی تھی۔ اس حوالے سے عابد حسن منٹو لکھتے ہیں:

"ملک میں چاروں طرف دہشت کا دور دورہ تھا۔ جگہ جگہ قائم سرسری سماعت کی فوجی عدالتیں احتجاج کرنے والے کارکنوں کو سربازار کوڑوں کی سزائیں دے رہی تھیں۔ سیاسی جماعتوں اور مزدور یونینوں پر پابندی تھی۔"[10]

جنرل ضیاء الحق کی تمام پالیسیاں اُن کے ذاتی مفاد کے لیے وضع کی گئی تھیں۔ بد قسمتی سے دوسرے حکمرانوں کی طرح جنرل ضیاء الحق بھی امریکہ کے ایما پر چل پڑے تھے۔ اُنھوں نے روس کو افغانستان سے نکالنے کے لیے امریکہ کا ساتھ دیا، جس کی وجہ سے اس جنگ میں ملک کا اندرونی نظام غیر مستحکم ہوتا چلا گیا۔ جنرل ضیاء کی ساری توجہ امریکہ روس جنگ کی طرف رہی اور ملک اندھیروں کے اندھے غار میں ڈوبتا چلا گیا۔ ڈاکٹر رشید امجد کہتے ہیں:

" قیام پاکستان سے 1957ء کے مارشل لاء تک اور 1967ء کی عوامی تحریک، پھر 1977ء کے مارشل لاء اور پھر 1988ء میں اسمبلیوں کی برطرفی تک آمریت اور جبر واستبداد کا وہی ڈرامہ مختلف شکلوں اور کرداروں کے توسط سے کھیلا جاتا رہا۔ انگریز چلے گئے لیکن ان کے گماشتے سامراج کی حفاظت کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں معاشرہ سماجی، تہذیبی اور اخلاقی انحطاط سے ہمکنار ہے "[11]

علاوہ ازیں جنرل ضیاء الحق نے اسلام پسندی اور اسلامی قوانین نافذ کرنے پر زور دیا، جو کہ ایک ڈرامے کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ سارا ڈراما امریکہ کے ایما پر روس میں جہاد کے نام پر نوجوانوں کو ذہنی طور پر تیار کروانا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے درباری مولویوں کا استعمال کیا گیا۔ سرکاری دفاتر میں با جماعت نماز لازمی قرار دی گئی، اور نماز نہ پڑھنے والوں کو سزائیں دی جاتی تھیں۔ چونکہ یہ ساری کاروائی انگریزوں کے لیے کی جاری ہی تھیں۔ اس لیے پاکستانی عوام اس صورت حال سے عاجز آ گئی۔ عوام کے مسائل کچھ اور تھے، جن کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی، غربت اور مہنگائی بڑھ رہی تھی۔ سانحہ اوجڑی کیمپ جیسے واقعات نے ملک کو سماجی طور پر مزید غیر مستحکم کر دیا۔ انصاف کی دور دور تک کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ سرمایہ دار اور سیاست دان عیاشی میں، جبکہ عام آدمی ظلم وستم کی وجہ سے نڈھال تھا۔ مختصر یہ کہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں سماجی حوالے سے پاکستانی معاشرے میں کوئی ضیا دیکھنے کو

نہیں ملی، بلکہ صرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا رہا۔ دوسری طرف جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد جو خواب دیکھا تھا کہ اس کے بعد پی پی کا اقتدار سنبھالنے والا کوئی نہیں رہیگا، بد قسمتی سے وہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور

ذو لفقار علی بھٹو کی بیٹی بے نظیر بھٹو نے فوراً عملی سیاست میں حصہ لیکر پاکستان پیپلز پارٹی کی گرتی ہوئی دیواروں کو مضبوط بنا دیا، جس کی توقع نہ تو جنرل ضیاء کو تھی اور نہ ہی ان کی آمریت کو۔ بے نظیر بھٹو نے آمریت کے ایوانوں میں ہلچل مچادی قیوم نظامی اپنی کتاب " جرنیل اور سیاست دان تاریخ کی عدالت میں " میں لکھتے ہیں۔

1988ء کے انتخابات میں فوجی جرنلیوں کو بڑا خوف یہ تھا کہ اگر پاکستان
پیپلز پارٹی کامیاب ہو گئی تو بے نظیر بھٹو پاکستان کی وزیر اعظم منتخب ہو جائیں گی اور فوج کے جنرلیوں کو ایک خاتون وزیر اعظم کو سلیوٹ کرنا پڑیگا جرنیل اس صورت حال سے بچنا چاہتے تھے، خفیہ ایجنسیوں نے علماء سے فتوے جاری کرائے کہ اسلام میں خاتون وزیر اعظم نہیں بن سکتی "[12]

تمام کوششوں کے باوجود پی پی اقتدار میں آئی 17 اگست 1988ء میں جنرل ضیاء طیارہ حادثے کے شکار ہوئے 16 نومبر 1988ء کو عام انتخابات ہوئے جس میں پاکستان پیپلز پارٹی اکثریت کے ساتھ حکومت میں آئی اور یکم دسمبر 1988ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کو پاکستان کا وزیر اعظم بنایا گیا، بے نظیر بھٹو کے اقتدار میں آتے ہی مخالف پارٹیوں نے محاذ کھول دیا اور نو ماہ کے اندر ہی اکتوبر 1989ء میں ان کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر دی تاہم ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا مگر مخالف پارٹیاں سکون سے بیٹھنے والی نہیں تھیں، چنانچہ انھوں نے پورے ملک کے حالات خراب کر دئے حکومت کی پالیسیوں کے خلاف مسلسل مخالفت کی وجہ سے صدرِ مملکت غلام اسحاق خان نے 16 اگست 1990ء کو قومی اسمبلی تحلیل کر دی اور ملک میں ایمر جنسی نافذ کر دی گئی 27 اکتوبر 1990ء کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا علان کیا

گیا جس کے نتیجے میں اسلامی جمہوری اتحاد پارٹی اقتدار میں آئی جس کے سربراہ نواز شریف تھے، صدر پاکستان غلام اسحاق خان نے نواز شریف کو وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کی دعوت دیدی اس بارے میں قیوم نظام کہتے ہیں

"پی پی پی نے 1990ء کے انتخابی نتائج کو مسترد کر دیا تھا کیوں کہ خفیہ
ایجنسیوں نے آئی جی آئی کو کامیاب کرانے کے لئے پی پی پی مخالف امید
واروں میں چودہ کروڑ روپے تقسیم کئے تھے جس کا اعتراف ڈی جی آئی
ایس آئی نے اپنے حلفیہ بیان میں کیا"[13]

6۔ نومبر 1990ء کو نواز شریف نے وزیر عظمی کا حلف اٹھایا، وزیر اعظم بننے کے بعد انھوں نے پاکستان کے باشندوں سے پہلا خطاب کرتے ہوئے ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے مختلف اقدامات کرنے کا وعدہ کیا۔ مشرف نے اقتدار میں آکر سات نکاتی ایجنڈہ پیش کیا۔ 17 اکتوبر کو قوم سے خطاب کر کے اُنھوں نے اپنے سات نکاتی ایجنڈے کی تفصیل پیش کی۔

1۔ قوم کے اعتماد اور مورال کی تعمیر نو

2۔ وفاق پاکستان کو مستحکم بنانا، بین الصوبائی ہم آہنگی کا فروغ، اور قومی یکجہتی کا احیاء

3۔ معیشت کی بہتری اور سرمایہ داروں کے اعتماد کی بحالی

4۔ امن وانصاف کی فوری فراہمی کو یقینی بنانا

5۔ ریاستی اداروں کو سیاست سے پاک کرنا

6۔ اقتدار کی گراس روٹ لیول تک منتقلی

7۔ بے لاگ اور غیر جانبدارانہ احتساب کو یقینی بنانا

اس ایجنڈے کی تکمیل کے لیے اُنھیں ماحول بھی ساز گار ملا۔ طاقت کا سر چشمہ وہ خود تھے۔ آئین نہیں تھا۔ کوئی باضابطہ صدر یا قانون ان کی راہ میں روکاٹ نہیں تھا۔ اگر وہ چاہتے تو اس ماحول سے فائدہ اٹھاسکتے تھے اور اپنے ایجنڈے کو عملی جامہ پہنا سکتے تھے لیکن ایسا کچھ دیکھنے کو نہیں ملا۔ 2003ء میں انتخابات کرائے لیکن جو حکومت بن گئی اس کی حثییت کٹھ پتلی کی طرح تھی۔ اختیارات تمام کے تمام جنرل پرویز مشرف کے پاس تھے۔ جنرل مشرف کے دورِ حکمرانی میں قوم کو مایوسیوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔ قوم کو بے یقینی کے اندھیروں میں جھونک دیا گیا۔ پورا ملک انتشار وافراتفری کا شکار تھا۔ قبائلی علاقہ جات میں پاکستان مخالف جذبات بھڑک اُٹھے تھے۔ کہیں پانی کی تقسیم کا مسئلہ، کہیں گیس کی را ئلٹی کا مسئلہ، کہیں ڈیموں کی تعمیر کا تنازعہ، غربت اور مہنگائی میں اضافہ، غربت کی وجہ سے خود کشی کا رجحان بڑھ گیا تھا۔

بنیادی ضروریاتِ زندگی عام آدمی کے لیے میسر نہیں تھیں۔ مقامی انڈسٹری زاول کا شکار، امن وامان کی فراہمی مفقود، عدم تحفظ کا احساس بڑھ گیا، لوگ گھروں میں خود کو غیر محفوظ سمجھتے تھے۔ پاکستان میں پہلی بار خود کش حملوں کا آغاز ہوا۔ مساجد اور امام بارگاہیں محفوظ نہیں تھیں۔ انصاف کے لیے لوگ مارے مارے پھرتے تھے۔ مظلوم کی دادرسی نہیں ہورہی تھی۔ عدالتیں بھی فردواحد کی حکمرانی کے ما تحت تھیں، اس لیے انصاف کی توقع بے کار تھی۔ چینی کا بحران پیدا ہوگیا۔ قیمت بیس روپے سے بڑھ کر چالیس ہوگئی۔ سیاست دانوں اور جرنیلوں نے قرض معاف کرائے۔ اس بارے میں منیر احمد "پرویز مشرف فوجی آمریت سے جمہوری آمریت تک" میں لکھتے ہیں:

> **"پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں وفاق اور صوبوں کے درمیان نفرت میں کمی کے بجائے اضافہ ہوا، خصوصی طور پر دہشت گردی کی خلاف پاکستان نے جو پالیسی اپنائی اس کے با عث صوبہ سرحد میں موجود افراد کے دل میں مرکزی حکومت کے ساتھ ساتھ پاکستان کے خلاف بھی نفرت میں اضافہ ہوا۔ اور خصوصاً ملک کے قبائلی علاقے بدامنی کا شکار ہوگئے"** [14]

اسی دور میں معاشی بحران نے سر اٹھالیا۔ فرد واحد کی حکمرانی اور من پسند فیصلوں نے لوگوں کو ایک بار پھر ضیاء دور کی تاریکی یاد دلا دی۔ سب سے پہلے پاکستان کا نعرہ لگایا گیا، لیکن یہ آبادی نہیں بر بادی کی طرف اشارہ تھا۔

جنرل پرویز مشرف دہشت گردی کی جنگ میں امریکہ کے زبردست اتحادی بن گئے۔ امریکہ کے لیے جنرل مشرف سے زیادہ کوئی اس کے مفاد کا آدمی نہیں تھا۔ جنرل پرویز مشرف کا وجود امریکہ کے لیے نا گزیز تھا- کیونکہ وہ امریکہ

کے ایما پر عمل پیرا تھے۔ مرتضٰی انجم اپنی کتاب "کون کیسے گیا" میں لکھتے ہیں:

"جس ملک میں لاء اینڈ آرڈر کی صورتحال انتہائی خراب ہو،

بیروزگاری

اور مہنگائی کا دور دورہ ہو، لوگ خودکشیاں کر رہے ہوں، خود

کش حملے ہو

رہے ہوں، ایک طاقتور ملک کے دباؤ کے نتیجے میں "دہشت

گردی" کے خلاف جنگ کا سامنا ہو۔ جہازی سائز کابینہ کر

پشن کے سابقہ ریکارڈ توڑ رہی ہو، سربراہِ مملکت محض اپنی حکو

مت کو استحکام بخشنے کے لیے ارکان سینٹ و اسمبلی ممبران کی

مراعات میں اضافہ کرتا چلا جائے اور معاشی انصاف کا کہیں

نام ونشان تک نہ ملے، تو اس ملک، حکومت اور حکمران کو

کس وقت کیا صورتحال پیش آجائے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ

مختصر سی تصویر صدر جنرل پرویز مشرف کے دور حکومت کی

ہے۔"[15]

دینی مدارس پر چھاپے، عدلیہ پر شب خون، لال مسجد آپریشن، بے نظیر بھٹو کا قتل اسی تاریک دور کی یاد گار ہے۔ مختصر یہ کہ جنرل پرویز مشرف کا دور سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی حوالے سے مکمل بحران کا شکار تھا۔

ادبی پس منظر

پاکستان دو قومی نظریوں کی بنیاد پر عمل میں آیا۔ پاکستانی مسلمانوں کو طویل جد و جہد کا ثمر 14 اگست 1947ء کی صورت میں ملا۔ تقسیم گرچہ سیاسی اتفاق رائے کا نتیجہ تھی۔ لیکن دونوں ملکوں میں انتہائی ہولناک فرقہ وارانہ فسادات چھڑ گئے۔ ان فسادات میں لاکھوں انسان نہایت بے داری سے مار ے گئے۔ بے شمار عورتیں اور لڑکیاں اغوا کی گئیں، ہزاروں بچے اپنی ماؤں کی گود سے محروم ہو گئے۔ لو گوں کو اپنے آبائی مکانات چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ رشتے ناتے ٹوٹ گئے۔ بستیوں کی بستیاں اجڑ گئیں ۔ غرضیکہ، آگ خون المیہ اور قربانی کی صورت میں تاریخ کا ایک منفرد باب رقم ہوا۔ یہ وہ حادثات وصدمات تھے جو پاکستانی شاعر و ادیب کو ورثے میں ملے۔ گویا تقسیم کے بعد۔۔۔

پاکستانی ادب نے فسادات کی آگ میں نیا جنم لیا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی شاعری میں شروع میں غالب رجحان فسادات کے خلاف ردِ عمل دکھائی پڑتا ہے۔ چونکہ ہجرت کی صورت میں ہندوستان سے مختلف خطوں کے لوگ یہاں کچھ نئے خوابوں کے ساتھ آئے تھے۔ جن کی تعبیرات کڑوی اور کسیلی ثابت ہو ئیں،۔ چنانچہ ہجرت کے کڑوے تجربے، اور خوابوں کی شکست وریخت بھی پاکستانی شاعری کے اولین رجحانات ہیں۔ بقول سلیم اختر:

> **"1947ء کے فوراً بعد افسانوں اور شاعری کے اہم ترین مو ضوعات کچھ اس طرح تھے۔ فسادات ، مذہب کے نام پر انسان کے ظلم، تشدد اور جبر سے جنم لینے والے المیے، ان کی متوازی (یا پھر ردِ عمل کے طور پر) انسان دوستی، محبت اور**

بھائی چارے کے مظاہرے۔ نئی زمین میں بے جڑ ہونے کا احساس، نئے وطن کے مسائل، انفرادی دکھ، اجتماعی کرب، برصغیر کی تقسیم، ماضی سے کٹ جانے کا احساس اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی
ماضی پرستی، نئی مملکت میں اقتدار کا ٹکراؤ ہجرت سے جنم لینے والا اعصابی تناؤ۔ اور جذباتی گھٹن، اور ان پر مستزاد رزق خاک بنے افراد، یتیم بچے اور مغویہ عورتوں کے المیے یہ سب موضوعات چوتھی دہائی تک ہی محدود نہ رہے بلکہ آنے والی تین دہائیوں تک اہل قلم ان مسائل اور موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے رہے۔"[16]

برصغیر ہندوپاک کی تقسیم ایک ایسا حادثہ ہے، جس کا اثر برصغیر ہندوپاک میں آج تک محسوس کیا جارہا ہے، تقسیم کی وجہ سے دنیا کی سب سے بڑی آبادی مذہب و نسل کے نام پر نقل مکانی پر مجبور ہوئی، جس کے نتیجے میں ہجرت کے دوران بدترین فسادات عمل میں آئے، انسانیت حیوانیت میں تبدیل ہو چکی تھی، پورا برصغیر بدترین دور میں داخل ہو چکا تھا یہ عہد ترقی پسند تحریک کے شباب کا زمانہ تھا اور اس کے اثرات ادب کے علاوہ سیاست، ثقافت اور سماج پر بھی مرتب ہو رہے تھے، مذکورہ دور پاکستان کے لئے ایک مبسوط پاکستانی قوم کی تشکیل کا دور تھا، چونکہ ایک نیا ملک جو دنیا کے نقشے پر ابھی ابھی ابھرا تھا، وہ قومی خدوخال مرتب کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ ابھی بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکا تھا کہ اس کی بدقسمتی کے دن شروع ہو گئے، سیاسی افراتفری اور ملکی سطح پر پھیلی بدامنی اور بے چینی کی ایسی کیفیت تھی جس کا فائدہ اٹھا کر وہاں 1958ء میں تربیت پا رہی جمہوریت کا گلا گھونٹ کر مارشل لا نافذ کر دیا گیا، جس کا ردعمل ملا جلا رہا معاشرے کے ایک طبقے نے یہ امید قائم کر لی کہ شائد پاکستان اب کسی نہ کسی راستے کا انتخاب کر ہی لیگا، حالانکہ یہ محض خوش فہمی تھی۔ اس موقع پر کچھ ادیب حضرات تو

مصلحت کی خاطر خاموشی اختیار کر گئے۔ کچھ بک گئے، جھک گئے۔ڈر کے مارے دل کی بات زبان پر
لانے سے کترانے لگے۔ لیکن کچھ شاعر وادیب ایسے بھی
سامنے آگئے کہ ہمت اور حوصلے کے ساتھ اس دور کے تمام نا قابلِ قبول امور کے خلاف احتجاج اور
مزاحمت کا اظہار کرنے لگے۔ فرازؔ جیسے حساس دل رکھنے والے شاعر بھی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر
نہ رہ سکے۔ اُنھوں نے اس دور حکومت کی ناقص پالیسیوں، سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کی بے حسی،
برائے نام جمہوریت، عدم مساوات، ظلم وستم، انسانی حقوق کی پامالی اور آمریت کے خلاف زبردست
احتجاج کیا۔انھوں نے ہر طرح سے اس سیاسی انارکی، کی مخالفت کی ان حضرات نے احتجاج کی آواز بلند
کی جن میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی حبیب جالب، احمد فراز اور احسان دانش وغیرہ اہم ہیں، جو
اپنے مخصوص لہجے میں جبر واستبداد کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
(فیض احمد فیض)

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے

پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے

جسم و زباں کی موت سے پہلے

بول کہ سچ زندہ ہے اب تک

بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

(فیض احمد فیض)

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے

کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

(فیض احمد فیض)

حتیٰ کہ یہ تک کہا کہ

"ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے"

اردو شاعری بالخصوص ترقی پسند ادب میں فیض کا ایک مرتبہ اور مقام ہے، انھوں نے اپنی شاعری میں سیاسی جبر و استبداد کی بڑی فنی خوبی اور کلاسکی لب و لہجہ کے ساتھ ادا کیا ہے جس میں اس عہد کی سیاست، سماج اور تہذیب بڑی خوبی سے ابھرتے ہیں، اسی طرح حبیب جالب کا انداز اور لب و لہجہ باغیانہ ہے، وہ کسی بھی سیاسی جبر و استبداد کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں، جراتِ اظہار اور حکومت کے دستور کو وہ اس طرح چیلنج کرتے ہیں

ایسے دستور کو، صبح بے نور کو،

میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

(حبیب جالیب)

کیا حماقت کہ گردِ راہ کے پیچھے پڑے
اس طرف چلتے، جدھر آثار منزل دیکھتے

(احسان دانش)

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

(احمد ندیم قاسمی)

مزکورہ شعرا فکری اور ذہنی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور مارکسی نظریہ رکھتے تھے، تقریباً ساٹھ کی دہائی میں جب کہ ابھی پاکستان کی سیاسی فضا کہر آلود تھی، نئی شاعری یعنی جدیدیت کے رجحان نے سر اٹھانا شروع کیا پاکستان میں جدیدیت کے اس رجحان کو ترقی پسندی کے رد عمل کے طور پر نہ دیکھ کر سیاسی ادبا اور مارشل لا کے رد عمل کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ ابرار احمد اپنے مضمون "مزاحمتی پاکستانی ادب" میں لکھتے ہیں:

"اظہار پر قدغن لگی، فرد کو معاشرے کی غالب رو سے الگ کیا گیا، تقدیر پر آدمی کا جو تھوڑا بہت اختیار ہوتا ہے، وہ بھی جاتا رہا تو ادیب نے کھلے لفظ کا چلن ترک کیا، ابہام نے راہ پائی، لسانی تجربات کئے گئے اور تجریدیت اور علامت نگاری پر اصرار نے ادب برائے ادب والی صورت حال پیدا کر دی"[17]

ان موضوعات کی صورت میں پاکستان کے جو نقوش ابھر کر آتے ہیں۔ ان میں امید اور مایوسی، خواب اور شکستِ خواب، احساسِ زیاں اور کھوئے ہوؤں کی جستجو پر مبنی المناک صورتِ حال پائی جاتی ہے۔ گویا حصول پاکستان کا جو مقصد تھا وہ مکمل نہ ہو سکا اسی لیے فیض نے "صبح آزادی" میں کہا تھا۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

(فیض احمد فیض)

نظم کے یہ اشعار مذکورہ المناک صورتِ حال ہی کے غماز ہیں۔ گویا جس منزل کی تلاش تھی اس کے درمیان یہ حادثات وفسادات اس کے عدمِ تکمیل پر دال ہیں۔ اس وقت کی شاعری پر فسادات کی صاف چھاپ سنائی دیتی ہے۔

کچھ اس طرح سے بہار آئی ہے کہ بجھنے لگے

ہوائے لالہ و گل سے چراغِ دیدہ و دل

(حفیظؔ ہوشیار پوری)

دیکھو تو فریب موسم گل

ہر زخم پر پھول کا گماں ہے

(باقیؔ صدیقی)

ابھی گلوں کی نظر سے نظر نہیں ملتی

ابھی فضائے چمن میں دھواں دھواں سا ہے

(صوفیؔ تبسم)

ہر آنسو میں آتش کی آمیزش ہے

دل میں شاید آگ کا دریا بہتا ہے

(ظہیرؔ کاشمیری)

ایسی سونی تو کبھی شام غریباں بھی نہ تھی

دل بجھے جاتے ہیں اے تیر گئی صبح وطن

(مصطفیٰ زیدی)

غزل کی ریزہ خیالی اور باطن بینی چونکہ کسی بڑے مقصد کے لئے مؤثر نہیں ہوسکتی تھی اس لئے اس زمانے میں نظم پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی۔ ایسا نہیں کہ غزل میں ان خیالات کا اظہار نہیں کیا گیا۔ مذکورہ اشعار غزل سے ہی ہیں اور ان میں اس وقت کے حالات پورے آب و تاب سے جلوہ گر ہیں۔ ویسے اس وقت کی غزلوں میں میرؔ سا انداز پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ میر کے زمانے کے حالات اور قیام پاکستان کے بعد کے حالات میں غایت درجہ مشابہت
پائی جاتی ہے۔ دونوں ہی زمانے نہایت افراتفری کے شکار تھے۔ انتشار کا بازار گرم تھا۔ انسانی زندگی غیر محفوظ ہو کر رہ گئی تھی۔ لہٰذا لوگوں کو میرؔ کا شاعرانہ لہجہ بہت راس آیا۔ ناصر کاظمی، مختار صدیقی اور ابن انشاء جیسے شعراء پر میرؔ کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

انھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

(ناصرؔ کاظمی)

میرؔ سے بیعت کی تو انشاء میر کی طبعیت بھی ہے ضرور
شام کو رو رو صبح کرو اب صبح کو رو رو شام کرو

(ابن انشاؔء)

جن کی ہتھیلی گہری تلخی خوں میں رچ رچ جاتی ہے
جزو حیات بنانے پڑتے ہیں وہ اشعار میرؔ ہمیں

(مختارؔ صدیقی)

غزل کے یہ اشعار نہ صرف اس وقت کے حالات کے پیدا شدہ ہیں بلکہ غزل نے بھی روایت اور دروں بنی چھوڑ کر عصری صورتِ حال کی ترجمانی کی سعی کی۔ اگرچہ شعراء کی ایک نسل غمِ جاناں کی منزل سر کرنے میں ہی مصروف رہی۔ اس کے باوجود جدید طرز احساس کے حامل شعراء نے غزل کی روایت اور مسلمات سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ قدیم استعارات سے نئے تلازمات وابستہ کر کے ابلاغ میں گہرائی پیدا کی گئ۔ مزید نئ تمثلیں اور استعارات وضع کئے گئے۔ آج کی پاکستانی غزل جو طرزِ احساس اور طرزِ ادا کی غماز ہے سب اسی روایت کا نتیجہ ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ نظم کسی بڑے مقصد کے ابلاغ کے لئے غزل کے مقابلہ میں زیادہ مؤثر صنف سخن ہے۔ اس لئے قیام پاکستان کے بعد غزل کے مقابلہ میں نظم کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ جوش ملیح آبادی ،حفیظ جالندھری، احسان دانش، فیض احمد فیض، میرا جی، ن م راشد، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، ظہیر کاشمیری، مختار صدیقی، یوسف ظفر، مجید امجد، ضیاء جالندھری اور قیوم نظر وغیرہ نے نظم نگاری میں خصوصی مہارت کا ثبوت دیا۔ ان میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند تمام شعراء شامل ہیں۔

دراصل قیام پاکستان کے بعد دو تخلیقی پلیٹ فارم نظر آتے ہیں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند۔ غیر ترقی پسند میں حلقہ ارباب ذوق کے علاوہ رومانیت اور حسن عسکری کا بھی گروہ تھا جو ادب میں جمود کا قائل تھا۔

ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں نے پاکستانی ادب (قومی ادب اور اسلامی ادب) کی بحث شروع کی مگر یہ کافی متنازع ثابت ہوئی۔ اور کیوں نہ متنازع ثابت ہوتی کیوں کہ پاکستانی ادب یا اسلامی ادب، اردو ادب کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ جس سے ادب کے محدود ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اس لئے یہ نظریہ پنپ نہ سکا۔ ترقی پسند مصنفین جو کہ انسان دوستی اور انسانیت کے احترام کے قائل تھے۔ اس وقت کے بیشتر نام اسی تحریک سے وابستہ تھے۔ اور جو وابستہ نہیں تھے وہ بھی کسی نہ کسی طرح اس تحریک سے متاثر ضرور تھے کیوں کہ قیام پاکستان کے وقت یہ تحریک خاصی فعال تھی۔ حفیظ جالندھری، پطرس بخاری اور تاثیر گرچہ تحریک کے نظریہ کے قائل نہ تھے مگر تحریک کے ادب سے دلچسپی ضرور رکھتے تھے۔ مگر جب ترقی پسندوں نے غیر ترقی پسندوں پر شدت پسندانہ رویہ اختیار کیا تو اس کے ادیبوں اور

جرائد کا مقاطعہ کیا۔ جس کے نتیجہ میں تحریک پر پابندی عائد کردی گئی۔ تحریک کے سکریٹری احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض اور دیگر عہدے داروں کو نظر بند کر دیا گیا۔ اس کے باوجود پاکستان کے مخصوص صورتِ حال کے تحت یہ تحریک نظریاتی سطح پر فعال رہی ۔ کیوں کہ جب جبر ، گھٹن ، احتساب اور آ مریت کا دور دورہ ہوتو۔۔۔۔ ترقی پسندانہ سوچ ضروری ہو جاتی ہے۔ پاکستان کے جاگیر دارانہ اور آمرانہ حالات کا تحریک سامنانہ کر سکی اس لئے بظاہر تحریک پابندی کا شکار رہی مگر آج بھی پاکستان کی تحریروں میں یہ تحریک زندہ ہے ڈاکٹر سلیم اختر نے

پاکستان میں تحریک کے نہ پنپنے کے سوال کا جواب ڈاکٹر کریم الدین کے ایک مضمون کے حوالے سے نہایت خوبصورتی سے دیا ہے:

> **"سوال یہ ہے کہ پاکستان میں تحریک کیوں نہ پنپ سکی۔ ڈاکٹر کریم الدین احمد نے اپنے مضمون "ترقی پسند تحریک کا ایک جائزہ" میں سوال کا جواب دیا ہے۔ ان کے تجزیہ کے مطابق پاکستان بنانے والی سیاسی پارٹی کانگریس کے مقابلے میں بہت کمزور تھی۔ اس پر زمینداروں، جاگیر داروں کا اثر بہت زیادہ تھا اور اسی لحاظ سے وہ پسماندہ بھی تھی۔ حکومت چلانے کے لئے اسے نوکر شاہی کی مدد لینی پڑی اور آخر یہی نوکر شاہی پاکستان کی نفس ناطقہ بن گئی۔ اس کے کچھ کارندوں (قدرت اللہ شہاب ، ممتاز حسن ،الطاف گوہر، جمیل الدین عالی) نے ادیبوں کی نکیل سنبھال لی ۔ایسے حالات میں ترقی پسند تحریک کا پروان چڑھنا تقریباًناممکن تھا"**۔18

ظاہر سی بات ہے جو تحریک جاگیر داروں، اور آمروں کے بے جا تسلط کے خلاف کھڑی کی گئی ہو وہ پاکستان جیسے مخصوص جابرانہ ماحول میں کیسے پنپ سکتی ہے۔ مگر عوامی سطح پر اس کی کافی پذیرائی ہوئی ۔ کیوں کہ عوام خود اس ماحول سے عاجز تھے سوائے اسلامی ادب اور کچھ رجعت پسند ادب کے حاملین

نے مجموعی طور پر اسی تحریک کو بہت سراہا۔ کیوں کہ ہر زمانے میں تغیر پسندی مستحسن عمل ہے۔ تغیر پسندی ترقی پسندی کی اساس ہے۔ مردہ روایات کو مسترد کرنا، کہنہ مسلمات کو مسترد کرنا، ان شعبوں کو مسترد کرنا جو جاگیر دار، آقا، ملا اور حاکم کی صورت میں معاشرہ کو تباہ کر کے خود اونچے مقام پر فائز ہیں۔ اس لحاظ سے ہر زمانے میں پاکستان میں ترقی پسندی کی خاص ضرورت رہی ہے اور ادباء وشعراء نے اس کا زندہ ثبوت بھی پیش کیا۔ اس حوالے سے جوش، فیض احمد فیض، حبیب جالب، احمد فراز، ن م راشد، احمد ندیم قاسمی، مجید امجد، انیس ناگی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔۔۔ اور شاعرات میں کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر وغیرہ کے نام اہم ہیں ہیں جنھوں نے پاکستان میں ہمیشہ جابرانہ وآمرانہ اور استحصالی صورتِ عمل کے خلاف آواز بلند کی۔ ان میں سے جوشؔ، فیضؔ، ندیمؔ، ساحرؔ تو ترقی پسند سوچ کے حامل تھے۔ جبکہ بقیہ کا کوئی سیاسی مسلک نہ تھا۔

پاکستانی ادب کے پس منظر میں حلقۂ ارباب ذوق کی کافی اہمیت ہے اس کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کا کوئی مسلک نہ تھا اس کے پلیٹ فارم پہ ہر کوئی شرکت کرنے اور اپنی تخلیقات پیش کرنے کے لئے آزاد تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی پابندی سے حلقہ کے ہفت روزہ پروگرام منعقد ہوتے رہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق ترقی پسندوں کے خلاف بطور محاذ عمل میں نہیں آیا بلکہ ہوا یہ کہ ترقی پسند تحریک سے غیر متفق یا ناوابستہ حضرات کے لئے اس نے ایک پلیٹ فارم جیسی صورت اختیار کرلی، حلقۂ اربابِ ذوق کی ادبی خدمات نا قابل فراموش ہیں میراجی ,ن۔م۔راشد، مجید امجد اور ان کے متبعین نے آزاد نظم میں ہیئت اور اسلوب کے جو تجربات کئے اس سے اردو شاعری میں مزید تنوع پیدا ہوا۔ ان کا میاب کوششوں کا سہرا حلقۂ ارباب ذوق کے ہی سربند ھتا ہے۔

ترقی پسند اور غیر ترقی پسند سے قطعِ نظر، پاکستانی شاعری ہر زمانہ میں معاشرتی انصاف، رواداری ،اور جمہوریت کے قیام کے لئے مصروف کار نظر آئی ہے۔۔ مگر پاکستان کی شاعری کے سفر کا جائزہ لینے پر سب سے پہلے ترقی پسند شعراء سامنے آتے ہیں۔

فیض احمد فیض ایک ایسے شاعر ہیں جو ترقی پسند اور غیر ترقی پسند حلقوں میں یکساں مقبول ہیں اگر چہ ملک کے بدلے ہوئے سیاسی حالات کے مطابق ان کی شخصیت سے وابستہ نزاعی باتوں کی کمی بیشی

ہوتی رہی۔ لیکن ان سے فیض کی شخصیت کسی طرح بھی متاثر نہ ہو سکی۔ بلکہ ان چیزوں نے فیض میں مزید تخلیقی تحریک پیدا کی، فیض ایک درویش منش انسان تھے،۔ کبھی کوئی بھی مخالف ردِ عمل ان پر رو نما نہیں ہوا۔ راولپنڈی کیس کے بعد مسلسل بنیاد پرستوں اور دائیں بازو کے دانشوروں نے ہدف ملامت بنایا مگر فیض پر یا ان کی شاعری پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوا ترقی پسند ہونے کے باوجود انہوں نے قدیم شعری روایت کو مسترد نہیں کیا بلکہ اسی میں نئے معانی و مفاہیم پیدا کئے۔ یہی وجہ ہے کہ صبا، قفس، گل چیں، رقیب اور اس قسم کی متعدد کلاسکی اصطلاحوں کے مفاہیم کا اردو شعر و ادب کے قاری پر از سر نو انکشاف ہوا۔

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی
غرض تصور شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفت سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

فیض احمد فیض نے وطن کو محبوبہ سے تعبیر کیا۔ شاید اس رویّے کو اردو شاعری میں اختیار کرنے کا اولین سہرا بھی فیض احمد فیض کے ہی سر جاتا ہے۔ ان کے کل آٹھ مجموعے شائع ہوئے۔ نقش فریا دی (1941ء) دستِ صبا (1957ء) زنداں نامہ (1956ء) دست تہہ سنگ (1965ء) سر وادئی سینا (1971ء) شام شہر یاراں (1978ء) مرے دل مرے مسافر (1981ء) اور غبار ایام (1986ء)۔

فیض کے پہلے مجموعہ کلام کا پہلا حصہ رومانی شاعری پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کے دوسرے حصے میں "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" سوچ، رقیب سے، کتے، موضوع سخن، ہم لوگ، بو ل وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو رومانیت سے ہٹ کر ہیں جن میں سیاسی مسائل کو چھیڑا گیا ہے۔ اور اس کے بعد کے تمام مجموعوں میں یہ چیز بدرجہ اتم موجود ہے۔ فیض رومان سے حقیقت کی طرف آئے مگر اپنی شا

عری کا سحر کسی طور کم نہیں ہونے دیا۔ یہی فیض کا شعری امتیاز ہے۔ پاکستانی شاعری کے تمام منظر نامہ پر فیض ایک منفرد شاعر کی حیثیت سے ابھرتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے کئی اصناف میں کامیاب طبع آزمائی کی۔ احمد ندیم قاسمی ایک رومانی شاعر تھے مگر ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باعث سماجی حقیقت نگاری کی راہ پر گامزن رہے۔ بقول سلیم اختر:

"احمد ندیم قاسمی کو ترقی پسندی نے بچالیا ورنہ وہ زیادہ سے زیا دہ نیاز فتح پوری کا پاکٹ ایڈیشن ہوتے" [19]

احمد ندیم قاسمی نے ترقی پسندانہ حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ شعری حسن سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اپنی شاعری کو نعرہ بازی سے بچائے رکھا۔ اور اس میں فکر کے گہرے موتی سموئے۔ انہوں نے جمالیات کے ذریعہ قاری تک رسائی حاصل کی۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں انسان پورے آب و تاب سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان کی مشہور نظم "دردِ وطن" کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذنِ کلام
ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں

غزل کا شعر:

اس حوالے سے کہ شہپارہ تخلیق ہے وہ
مجھ کو انسان سے خوشبوئے خدا آتی ہے

جلال و جمال، محیط، دوام، لوحِ گل، دشت وفاء، رم جھم، شعلہ گل ان کے مقبول شعری مجموعے ہیں۔

احمد فرازؔ نے غزل سے زیادہ شہرت پائی۔ مگر ان کی نظمیں بھی خوب ہیں۔ بعض نظموں کو چھوڑ کر انھوں نے اپنی نظموں کو نعرہ میں نہیں تبدیل ہونے دیا۔ فراز نے اپنے دل پذیر اسلوب سے بطور خاص کام لیا۔ اس لئے فراز کا سیاسی شعر بھی شعر ہی رہتا ہے۔ فراز نے کسی آمر سے سمجھوتہ نہیں کیا اور آزادانہ طور پر ادب تخلیق کیا۔ انہوں نے ضیاء جیسے آمر کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا۔ ان کی بیشتر عمدہ سیا سی نظمیں ضیاء اور تقسیم پاکستان کے وقت کی یادگار ہیں،

فراز گرچہ طبعاً رومانی شاعر تھے لیکن ان کی رومانیت اختر شیرانی سے بہت مختلف تھی۔ ویسے تو بیشتر نظموں میں وہ ایک باغی شاعر نظر آتے ہیں مگر حبیب جالب اور جوش جیسا اسلوب نہیں پایا جاتا۔ بلکہ رو مانیت اور بغاوت کے امتزاج سے انہوں نے نیا رنگِ سخن پیدا کیا اس لحاظ سے وہ فیض احمد فیض کے کافی قریب ہو جاتے ہیں۔ فراز پر آئندہ صفحات میں تفصیلی بحث کی جائیگی کیوں کہ ہمارا تحقیقی مقالہ ہی فراز کی شخصیت اور شاعری پر ہے اس لئے یہاں اس حوالے سے زیادہ تفصیل بیان کرنا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

ظہیر کاشمیری نے ترقی پسند تحریک کی روشنی میں عظمتِ آدم کے گیت گائے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں اجالے اور روشنی کو امید کے معنی میں استعمال کیا۔ ظہیر کاشمیری نے اپنی شاعری میں انقلابی جذبوں کو راسخ و مستحکم رکھا، سلیم اختر لکھتے ہیں

> **" ظہیر کاشمیری نے عظمتِ آدم سے جس تخلیقی آدرش کے ساتھ شعری سفر کا آغاز کیا وہ آخری وقت تک اسی پر گامزن رہا۔ ظہیر کاشمیری نے ترقی پسندانہ سوچ کو کلیشے کے طور پر استعمال نہ کیا بلکہ اسے زندہ نعرہ حیات جانا"۔20**

ترقی پسند شعراء کے ساتھ ساتھ ن۔م۔ راشد اور میراجی ایک الگ دبستان کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ترقی پسندوں نے خارجیت اور حقیقت نگاری پر زور دیا جب کہ ن م راشد اور میراجی نے بالترتیب دروں بینی اور جنسی محرومی کو اجاگر کیا۔ جو بظاہر ترقی پسندوں کے خلاف ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختار صدیقی، یوسف ظفر اور قیوم نظر کے بھی نام لئے جاسکتے ہیں۔ ویسے تو ترقی پسند شعراء نے پابند نظم، معریٰ، اور آزاد نظم تینوں سے کام لیا ہے۔ ان کی
نظموں کی زبان نہایت آسان ہے۔ اور ان میں کسی نہ کسی حد تک خطیبانہ انداز پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ بیشتر صورتوں میں ان کے مخاطب عوام تھے۔ عوامی شاعری کے لحاظ سے حبیب جالب نہایت اچھوتا نام ہے ان کی تمام تر توجہ عوام ہی کی طرف رہی یہی وجہ ہے کہ نظیر اکبر آبادی کے بعد وہ سب سے بڑے عوامی شاعری کہلائے۔ انھیں مخاطبین کا بہت بڑا مجمع بھی نصیب ہوا۔ وہ مخاطبین کے لحاظ سے مکمل ایک

دبستان کا درجہ رکھتے ہیں۔ مگر خطیبانہ لہجے کی وجہ سے ان کی شاعری عدمِ توازن کا شکار ہوئی۔ اس کے بر عکس غیر ترقی پسند شعراء کی نظموں میں خارجی معاملات و مسائل سے زیادہ ذاتی جذبات و احساسات کا اظہار ان کے یہاں نظم کی ہیئت کے تجربے کی طرف زیادہ دھیان پایا جاتا ہے۔

شاعری کی عام روش سے ہٹ کر نئی زبان، نئی تشبیہات واستعارات کا استعمال زیادہ ہے۔ یہ لوگ ن۔م۔ راشد اور میر اجی کے قائم کردہ شعری روایات پر چل رہے تھے۔

ن۔م۔ راشد نے ہیئت پرستی، اور روایت سے بغاوت کے باوجود زبان وبیان کے لحاظ سے اپنی نظموں کا تانا بانا مشرقی

روایات سے بنا تھا۔ وہ یورپ سے بغاوت کی اشاریت پسندی سے بے حد متاثر تھے۔ لیکن انہوں نے بیشتر اشارات ایران کی تہذیبی انداز اور فارسی زبان وادب کے الفاظ وتراکیب سے اخذ کئے۔ انہوں نے اردو نظم کے مروج پن کو ترک کر کے اس میں طرزِ احساس، اسلوبِ فکر، رنگ و آہنگ، ہیئت و تکنیک، غرض ہر اعتبار سے نئی تبدیلیاں لائے۔ اور اسے جدت سے آشنا کیا۔

میر اجی نے اپنے وسیع مطالعہ کے پیش نظر اردو زبان کے جامد اسالیب کو مسترد کر کے علامت، استعارے اور تمثیل کے علاوہ دیگر الفاظ کی بھی نئی قدر وقیمت متعین کی اور اردو نظم کو جدید تر نظم بنا ڈالا ۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کے واضح مقصدیت کے رنگ کو قبول کرنے کے بجائے داخل کی انفرادی سوچ کو ایمائیت کے انداز میں پیش کیا۔

پاکستان میں شعراء کا ایک گروہ وہ تھا جس نے کسی خاص فارمولے کے تحت نظم تخلیق نہیں کی وہ گروہ نہ ترقی پسندوں کی طرح موضوعات کا اور نہ حلقہ ارباب وذوق کی طرح تجربوں کا قائل تھا بلکہ ان شاعروں کی شاعری کی بنیاد جذبہ اور تجربہ پر تھی۔ ان میں مجید امجد، منیر نیازی اور وزیر آغا وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

مجید امجد کی نظم کا بنیادی نقطہ فرد اس کی ذات اور اس کی محرومیاں ہیں۔ ان کا فرد راشد کی طرح الجھنوں کا شکار ہے جو کہ اپنے ماحول سے متنفر ہے اس کی بڑی محرومی یہ ہے کہ اس جہاں کی عمر مختصر ہے جیسے

اگر میں خدا اس زمانہ کا ہوتا

تو عنوان کچھ اس فسانہ کا ہوتا

عجب لطف دنیا میں آنے کا ہوتا

مگر ہائے ظالم زمانے کی رسمیں

ہے کڑواہٹیں جن کی امرت کی رس میں

نہیں میرے بس میں نہیں مرے بس میں

مری عمر بیتی چلی جا رہی ہے

دو گھڑیوں کی چھاؤں چلی جا رہی ہے

اس کے علاوہ وہ اپنی محرومیوں کو فطرت کے ساتھ ملاتے ہیں وہ ماضی کے شاعر ہیں، ان کی نظم "مقبرہ جہاں گیر" بہت خوبصورت نظم ہے۔

تم نے دیکھا نہیں آج بھی محلوں میں

قہقہے جشن مناتے ہوئے نادانوں کے

جب کسی ٹوٹتی محراب سے ٹکراتے ہیں

مرکز شاہ کے ایوان لرز جاتے ہیں

منیر نیازی کی نظم میں جدید دور کے مسائل موجود ہیں جب کہ ان کی نظم تنہائی، خوف اور آسیب سے تشکیل پاتی ہے، وہ اندر کی تنہائی کو باہر کی طرف منتقل کرتے ہیں اور باہر کی تنہائی کو اندر کی طرف اور اندر کی تنہائی کو فطرت سے وابستہ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں رومانیت کے ساتھ ساتھ ایک پرا سرار قسم کی فضا بھی ملتی ہے ان کی نظم "صحرا بہ صحر" میں یہ کیفیات بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں، کچھ حصہ ملا حظہ ہو:

چاروں طرف ہے خوب اندھیرا اور گھٹا گھنگھور

وہ کہتی ہے کون میں کہتا ہوں میں

کھولو یہ بھاری دروازہ

مجھ کو اندر آنے دو

ڈاکٹر وزیر آغاز کا شمار بھی عبوری دور کے شعرا میں ہوتا ہے ، ان کی نظموں میں عرضیت نظر آتی ہے، خاص کر دیو مالائی اور اساطیری حوالے ان کے یہاں زیادہ ملتے ہیں۔ مٹی کی مہک اور فرد کا اندرونی تعلق فطرت کے خارج کے ساتھ ان کے نظم کا ایک خصوصی پہلو ہے۔

جدید نظم کا آغاز 1960ء کے بعد ہوا، جدید شعرا کے یہاں یہ سوالات پائے جاتے ہیں کہ کائنات کیا ہے ؟زندگی کیا ہے ؟ معاشرہ کیا ہے ؟ میں کون ہوں ؟ سب کا آپس میں رابطہ کیا ہے ؟ اس کے علاوہ جدید شعراء کے یہاں روح کے تحفظ سے زیادہ جسم کے تحفظ کا حوالہ کافی مضبوط ہے اور جدید شاعری اپنی شنا خت چاہتی ہے۔ ان شعرا میں سے کچھ تشکیلی گروپ میں شامل ہیں۔ تشکیلاتی گروپ کے شعراء نے نئے الفاظ کو رواج دینے کی کوشش کی لہذا نامانوس الفاظ نظم کا حصہ بن گئے، ان شاعروں کے خیال میں بنیادی اہمیت لفظ کی ہے، خیال لفظ کے واسطے سے آگے بڑھتا ہے۔

ان شعراء نے لسانی تشکیلات کے نام پر ماضی سے منہ موڑا، زبان کے مروج سانچے سے روگردانی کی، بحر و قوافی، ردیف اور وزن وغیرہ بھی متروک قرار پائے۔ یہ لوگ مستعمل سانچوں سے ہٹ کر نیا شعری آہنگ اختراع کرنے میں مشغول رہے۔ مگر کوئی ارفع تخلیقات سامنے نہ آسکی، اس لئے ان شعرا کی کافی مخالفت ہوئی اور یہ تجربات کوئی خاص افادیت ثابت نہ کر سکے، ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ نثری نظم اسی لسانی تشکیل کی ضمنی پیداوار تھی۔

ستر کی دہائی میں لسانی تشکیلات کی بحثیں تو ختم ہو گئیں البتہ نثری نظم کا سلسلہ شروع ہوا، نثری نظم کی ابتدائی علم برداروں میں زیادہ تر شاعرات نمایاں ہیں، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، شائستہ حبیب، عذرا عباس اور فاطمہ حسن جب کہ ان کے ساتھ ساتھ شعرا میں احمد ہمیش، مبارک احمد، انیس ناگی، قمر جمیل، عبد الرشید اور ساقی فاروقی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان لوگوں کی مشترکہ کوششوں کے بموجب نثری نظم کو اس کے نام میں تضاد کے باوجود بحیثیت صنف تسلیم کیا گیا۔ چنانچہ تشکیلاتی گروپ کے چند شعرا کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:

افتخار جالب: اردو زبان میں لسانی تشکیلات کی تحریک کے بانی شاعر ہیں۔ افتخار جالب کی بنائی ہوئی منفرد زبان صحافت کی بیانیہ زبان اور روایت کی کلاسیکی اور رومانوی زبان سے مختلف ہے۔ انہوں نے ادب کی

لسانی بنیادوں کو اہمیت دی اور یہ تصور پیش کیا کہ ادب اور شاعری زبان سازی کے عمل سے وجود میں آتی ہے۔ افتخار جالب کی نظمیں پر سکون جذبات کی نظمیں نہیں ہیں۔ بلکہ خیالوں، حقیقتوں اور خوابوں کے کارزار کی عکاس ہیں جن میں پیچیدہ استعاروں کے ذریعہ ایک بحرانی صورت حال کو بیان کیا گیا ہے۔ نظم "وقنا عذاب النار" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

درون آدم کہ راستی احتجاج کرتی ہے
ہمیں نہیں چاہئے، خدارا ہمیں نہیں چاہئے
ہمیں مکمل سکوت دے دو،
ہم جہنم کی سختیوں سے رہائی بخشو!

گرچہ آگے چل کر افتخار جالب کی شاعری میں تبدیلی آئی اور انہوں نے سیدھے سادے اسلوب میں منظم جذبات کی شاعری کی اور شاعرانہ تخیل کی جمالیاتی اختصار سے بھی کام لیا۔ جیلانی کامران، تبسم کاشمیری، ظفر اقبال، انیس ناگی اور کئی دوسرے شعرا ان کی تحریک سے کافی متاثر ہوئے۔

انیس ناگی: کی نظموں میں مکروہ، مغموم اور نامانوس الفاظ بکثرت نظر آتے ہیں، ان کی نظم میں انتشار، بے سمتی اور ابہام سے پر تصورات موجود ہیں۔ ان کی نظم کا فرد بے سمتی کا شکار ہے۔

جیلانی کامران: ایک نقاد اور نظم نگار ہیں ان کے یہاں ملک کی محبت کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب کی بازیافت بھی ملتی ہے۔ انہوں نے روحانیت اور روح سے انحراف کیا ہے۔ ان کے خیال میں ہمارا نیا شاعر جسم کے بچاؤ کے لئے فطرت کی پرستش کرتا ہے۔ ان کی نظم "بے سباب دنیا" میں بھی یہی کیفیات نظر آتی ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

بے سباب کی دنیا موسموں میں اتری ہے
پھول بن کے آئی ہے گلشنوں میں اتری ہے
تو اگر ہمیں ملتا عمر کی مسافت میں
ہم ترے درختوں کے پھول بن گئے ہوتے

جیلانی کامران کو نئی نظم اور نئے موضوعات کے شعرا میں خاص مقام حاصل ہے جس میں اختر حسین جعفری، ساقی فاروقی اور فہمیدہ ریاض وغیرہ شامل ہیں۔

اختر حسین جعفری: کی نظم رنگوں سے تشکیل پاتی ہے ان کی شاعری کا فرد اپنے تصورات میں گم ہو چکا ہے، اس کی اکائی کہیں رہ گئی ہے۔ اب وہ فرد، خوف، تنہائی اور آسیب کے حصاروں میں گھرا اپنی معنو یت کو تلاش کرتا ہے۔ وہ کبھی اپنے آپ سے مکالمہ کرتا ہے اور کبھی فطرت سے مکالمہ کرتا ہے۔ ان کی ایک نظم "ایک خط آشنا ورثوں کے نام" میں یہی کیفیت موجود ہے۔

میں اپنے چہرے سے منحرف ہوں

میں اپنے ورثوں سے دست کش ہوں

ساقی فاروقی: کی نظموں میں زندگی کی منعویت کو تلاش کرنے کا عمل ملتا ہے۔ انہیں یہ تلاش انسا نوں سے لے کر نباتات تک لے جاتی ہے۔ ان کے خیال میں زمین کا مرکز انسان ہے لیکن دوسری چیزوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نظم میں خوف اور انتشار کی کیفیت بھی ہے۔ دراصل وہ ہر چیز کے باطن میں اتر کر اس کی حقیقت تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کی نظم کا فرد کائنات اور دنیا کے بارے میں نہیں پوچھتا بلکہ اپنے بارے میں سوال کرتا ہے کہ میں کیا ہوں؟ اور میرا رتبہ اس زمین پر کیا ہے؟ مثلاً

میں کون ہوں، تو کون ہے، سب لوگ ہیں بچھڑے ہوئے

دن زہر ہے، بے مہر ہے، سب شہر ہیں اجڑے ہوئے

ساقی فاروقی نے چونکہ ساری عمر مغرب میں بسر کی لہذا ان کی شاعری میں مغرب کی زندگی سے متعلق حو الے اور اسلوب میں مغربی امیجری شامل ہو گئی ہے۔

فہمیدہ ریاض: کی نظموں میں یہ سوچ غالب ہے کہ فنکار ہر حوالے سے آزاد ہونا چاہئے اس لئے اپنی نظموں میں وہ حقوق نسواں کی تحریک کی کبھی لیڈر نظر آتی ہیں اور کبھی جنسی محبت کرنے والی بے باک لڑکی۔ دراصل جو انہوں نے سوچا وہ بیان کر دیا۔ خصوصاً عورت کے حوالے سے۔ جس طرح معاشرے

میں عورت کا جنسی استحصال ہوتا ہے، ان سب کا بیان ان کے یہاں موجود ہے۔ انہیں کسی مشرقیت اور نظام سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اس سسٹم کو ختم کر کے ایک نئے نظام کی بات کرتی ہیں " آرڈن کے نام" ایک نظم میں یہی کیفیات موجود ہیں۔

یہ سچ ہے میرے فلسفی میرے شاعر
وہ وقت آگیا ہے کہ بوڑھے فریبی معلم کا جبہ پکڑ کر
نئے لوگ کہہ دیں، کتابیں بدل دو
کتابیں جو صدیوں سے ہم کو پڑھاتے چلے آرہے ہو
جلادو کتابیں، جو کہتی ہیں دنیا میں حق جیت تا ہے
کہ ہم جانتے ہیں کہ جھوٹ اور سچ میں ہمیشہ ہوئی جنگ
اور جھوٹ جیتا ہے
کہ نفرت ہے، امر ہے، کہ طاقت ہے بر حق
کہ سچ ہار تا ہے

پاکستانی شاعرات میں ادا جعفری، کشور ناہید، نوشی گیلانی، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر کافی اہم نام ہیں۔

مجموعی طور پر قیام پاکستان سے لے کر دور حاضر تک پاکستانی شاعری کے سارے رجحانات کو ایک ہی نقطے پر سمیٹا
جاسکتا ہے اور یہ نقطہ ہے پاکستانی معاشرہ۔ یہ تمام رجحانات کسی نہ کسی طرح پاکستانی معاشر کے پیدا کردہ ہیں۔

حالت زندگی:

احمد فراز 14 جنوری 1931ء کو صوبئہ سرحد میں واقع نوشہرہ (پشاور) میں پیدا ہوئے انکی زندگی کے ابتدائی دن پشاور کے ایک کوچے "چڑی ماراں" میں گزرے بعد میں وہ کوہاٹ منتقل ہوگئے۔21

احمد فراز کے والد کا نام سید شاہ آغا برق کوہاٹی تھا، آغا برق کوہاٹی اردو اور فارسی کے بڑے شاعر تھے برق کوہاٹی ایک بھاری بھرکم اور وضع دار شخصیت کے حامل تھے۔ اُردو فارسی کا خوبصورت کلام موزوں کرتے تھے 1963ء میں "آل پاکستان اردو لیٹریری سوسائٹی": کے پہلے صدر منتخب کئے گئے۔ ان کے اردو کلام کا کچھ کلام ملاحظہ کیجئے

بخت میرا اگر رسا ہوتا

درد حق میں مرے دوا ہوتا

مجھ کو حسرت کی بندگی ہو نصیب

اس کو خواہش کہ میں خدا ہوتا

حضرت خضر بھی ہیں ناواقف

عشق میں کون رہنما ہوتا

آغا برق کوہاٹی کے دو فارسی شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں

- فروغ جاوداں (فارسی شاعری)
- گلبانگ پریشاں (فارسی شاعری)

احمد فراز کی والدہ کا نام سیدہ امیر جان تھا فراز اپنی والدہ سے بے حد محبت کرتے تھے، جب وہ اسکرپٹ رائٹر کے طور پر اپنی والدہ سے دور تھے تو ان کو اپنی والدہ کی بہت زیادہ یاد آتی تھی، حتیٰ کہ وہ کبھی کبھار راتوں میں اُٹھ اٹھ کے روتے تھے۔

احمد فراز کے تین بھائی تھے، سید محمود شاہ سب سے بڑے بھائی، جنھوں نے برٹش ائیر ویز میں ملازمت کی، اور دوسرے بھائی سید حامد شاہ (مرحوم) تھے جنھوں نے لندن میں تعلیم حاصل کی اور وہیں ملازمت بھی کی۔ دوران ملازمت ہی 34 سال کی کم عمری میں ہے اللہ کو پیارے ہو گئے اور تیسرے خود احمد فراز۔ احمد فراز کی صرف ایک بہن افتخار ناہید ہیں جو راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ احمد فراز کی دو شادیاں ہوئیں پہلی شادی اوائل عمر ہی میں ہو گئی تھی جو کسی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی، دوسری شادی 1956ء میں ریحانہ فراز سے ہوئی وہ ایک سول سرونٹ تھیں جن سے فراز کے تین صاحبزادے ہوئے پہلے بیٹے، سعدی فراز، دوسرے بیٹے شبلی فراز اور تیسرے بیٹے سرمد فراز۔

احمد فراز کی ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول کوہاٹ میں ہوئی اس کے بعد ایڈورڈ سکول پشاور سے میٹرک کیا، اس دوران ان کا پہلا شعری مجموعہ """تنہا تنہا""" شائع ہوا تو وہ بی۔ اے میں تھے ایڈورڈ کالج پشاور یونیورسٹی سے ایم اے کیا ایڈورڈ کالج (پشاور) میں تعلیم کے دوران ریڈیو پاکستان کے لیے فیچر لکھنے شروع کیے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد ریڈیو سے علیحدہ ہو گئے اور یونیورسٹی میں لیکچر شپ اختیار کر لی۔ اسی ملازمت کے دوران ان کا دوسرا مجموعہ "درد آشوب" شائع ہوا جس کو پاکستان رائٹرز گلڈز کی جانب سے "آدم جی ادبی ایوارڈ" عطا کیا گیا۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے بعد پاکستان نیشنل سینٹر (پشاور) کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ انہیں 1976ء میں اکادمی ادبیات پاکستان کا پہلا سربراہ بنایا گیا۔ بعد ازاں جنرل ضیاء کے دور میں انہیں مجبوراً جلاوطنی اختیار کرنی پڑی۔

فراز 2006ء تک "نیشنل بک فاؤنڈیشن" کے سربراہ رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ٹی وی انٹرویو کی پاداش میں انہیں "نیشنل بک فاؤنڈیش" کی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ احمد فراز نے 1988ء میں "آدم جی ادبی ایوارڈ" اور 1990ء میں "اباسین ایوارڈ" حاصل کیا۔ 1988ء میں انہیں ہندوستان میں "فراق گورکھ پوری ایوارڈ" سے نوازا گیا۔ اکیڈمی آف اردو لٹریچر (کینڈا) نے بھی انہیں 1991ء میں ایوارڈ دیا، جب کہ ہندوستان میں انہیں 1992ء میں "ٹاٹا ایوارڈ" ملا۔ سنہ 2004ء میں جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف کے دورِ صدارت میں انہیں ہلالِ امتیاز سے نوازا گیا لیکن دو برس بعد انھوں نے یہ تمغا سرکاری پالیسیوں پر احتجاج کرتے ہوئے واپس کر دیا۔

احمد فراز کے تاحال چودہ شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں

1. تنہا تنہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۹۵۸
2. دردِ آشوب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۹۶۶
3. نایافت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۹۷۰
4. شب خون۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۹۷۱
5. میرے خواب ریزہ ریزہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۹۷۲
6. جاناں جاناں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۹۷۶
7. بے آواز گلی کوچوں میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۹۸۲
8. نابینا شہر میں آئینہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۹۸۴
9. سب آوازیں میری ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۹۸۵
10. پس انداز موسم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۹۸۹
11. بودلک (ڈرامہ منظوم)۔۔۔۔۔۔۔۱۹۹۴
12. خوابِ گل پریشاں ہے۔۔۔۔۔۔۔۱۹۹۴
13. غزل بہانہ کروں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۹۹۹
14. اے عشق جنوں پیشہ۔۔۔۔۔۔۔۲۰۰۷

"شہر سخن آراستہ ہے" کے نام سے 2004 میں ایک کلیات بھی شائع ہوا جس میں احمد فراز کے ایک مجموعے "اے عشق جنوں پیشہ" کے علاوہ باقی تیرہ مجموعے شامل ہیں۔

ابتدا میں احمد فراز کا نام ان کے والدین نے احمد شاہ رکھا تھا بعد میں احمد فراز کے نام سے مشہور ہوئے، احمد فراز کا پہلا تخلص شرر برقی تھا، ایک بار کسی دوست نے کہا" آج رات بھر نیند نہیں آئی نل کا کھلا ہوا تھا اور ساری رات پانی" شرر شرر" بہتا رہا فراز کی حس لطیف کو" شرر" کی آواز ایسی بری لگی کہ اگلے ہی دن شرر برقی سے احمد فراز بن گئے۔

احمد فرازؔ کا تعلق کوہاٹ کے ایک معروف اور کثیر التعداد خانوادے میاں خیل سے تھا جو ایک معزز سید خاندان سمجھا جاتا ہے، ان کے آباؤ واجداد میں حاجی بہادر نامی ایک صوفی منش بزرگ گزرے تھے آپ کے پر دادا کا مزار کوہاٹ شہر کے وسط میں آج بھی خاص وعام کی زیارت گاہ ہے اور اس سے متصل ایک قبرستان ہے جو ان کا آبائی قبرستان ہے جس میں صرف آپ کے گھرانے کے لوگ مدفون ہیں۔

فراز بچپن سے ہی ضدی بچے کی طرح تھے من پسند چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے مچل جایا کرتے تھے اور اپنی خواہشات کے پورا نہ ہونے پر احتجاجی رنگ اختیار کر لیا کرتے تھے ، ان کے مزاج میں احتجاج بچپن سے ہی تھا جس کا اندازہ ان کے پہلے شعر سے لگایا جا سکتا ہے کہ بچپن کے زمانے میں ایک دن ان کے والد نے ان کے بڑے بھائی کے لئے جو اس وقت ایف اے کے طالب علم تھے سوٹ لائے اور فراز کے لئے کشمیری اچک لے آئے جو انھیں بالکل کمبل کی طرح لگی انھوں نے اس موقع پر اپنے جذبات کی ترجمانی شعر کے ذریعہ اس طرح کی۔

جب کہ سب کے واسطے لائے ہیں کپڑے سیل سے
لائے ہیں میرے لئے قیدی کا کمبل جیل سے

اپنے پہلے شعر کے بارے میں فراز خود کہتے ہیں

"گو کہ فنی لحاظ سے یہ شعر اتنی اہمیت کا حامل نہیں
، مگر طبقاتی ناہمواری کے بارے میں میرے اختلافی
جذبات کا ترجمان ضرور تھا جو کہ میں نے احتجاج
کے طور پر کہا تھا" 22

انھوں نے اپنے والد کو اپنا پیغام پہنچانے کے لئے ایک کاغذ پر مذکورہ بالا شعر لکھ کر اس کشمیری اچک کے ساتھ ان کے سرہانے رکھ دیا، اس پر والد صاحب کے رد عمل کے بارے میں فراز خود کہتے ہیں

"والد صاحب بہت خوش ہوئے اور ہنسے بھی اور فوری
طور پر بازار جا کر میرے لئے مختلف قسم کے کپڑے
خرید لائے ، اس سے مجھے شاعری کی تاثیر کا احساس ہوا
اور یہ بھی علم ہوا کہ شاعری احتجاج کا مؤثر ترین ذریعہ
ہے" 23

1942-43 میں جب فراز سکول میں پڑھتے تھے تو اکثر اوقات ہوم ورک کر کے نہیں لاتے تھے جس پر انھیں اپنے استاد اورکلاس انچارج "گرلکھ سنگھ "سے سخت سردی میں ہاتھوں پر بید کھانا پڑتے ، فراز ان سے انتقام لینے کے لئے مختلف حربوں سے کام لیتے ، ایک انتقامی حربے کے بارے میں توصیف تبسم اپنی کتاب "بند گلی میں شام" میں کہتے ہیں ۔

"کلاس انچارج گر لکھ سنگھ کی عادت تھی کہ وہ پیریڈ کے
دوران کلاس میں ڈیسکوں کے درمیان گھومتا رہتا تھا، وہ
جب فراز کے پاس سے گزرتا تو وہ فاؤنٹین پین اٹھا کر
روشنائی اس کے پتلون یا قمیص کے پچھلے حصہ پر چھڑک
دیتا" 24

والدین نے احمد فراز کو بہت لاڈ اور پیار سے ان کی پرورش کی اور ہمیشہ ان کی پسند کا خیال رکھا۔ان میں انا کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا ، وہ ہر معاملے میں اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے تھے، کسی کا بھی لحاظ نہیں کرتے تھے لبوں پر آئی بات وہ کبھی روک نہیں سکتے تھے ، چاہے مخاطب برا کیوں نہ مان جائے ، غالبا زیادہ چاہنے والوں کی کثرت نے انھیں کسی حد تک خود پسند بنا دیا تھا زہرہ نگاہ اپنے مضمون "دعائے یافراواں" میں کہتی ہیں

"جسے اتنا لوگ چاہیں اور مانیں اسے " انا "کا بھی حق حاصل ہونا چاہیئے" [25]

احمد فراز کا شمار عالمی شہرت یافتہ ادباء و اشعراء میں ہوتا ہے ، انھوں نے اپنے شعری سرمایہ کی بدولت نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے ان کی شاعری مختلف رنگوں سے ملکر تخلیق پاتی ہے فراز انسانیت کے حقوق کے علمبردار تھے ، انھوں نے ہمیشہ غریب اور بے بس عوام کے حقوق کی جنگ لڑی وہ اپنے سینے میں معاشرتی نا انصافی ، سیاسی خلفشار ، عدم استحکام ، جبر و تشدد ، ظلم و ستم ، عد مساوات غربت اور طبقاتی اونچ نیچ اور تڑپ اٹھنے والا دل رکھتے تھے انھوں نے نہ صرف ملکی بلکہ عالمی سطح پر بھی ظلم و زیادتی کا نشانہ بننے والے لوگوں کے حق میں آواز اٹھائی سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف خوب جم کے لکھا، آمریت کے بدترین دور میں بھی اپنے آپ کو خاموش نہ رکھ سکے جب کہ پاکستان میں ادیبوں کو ملک بدر کیا جا رہا تھا اس وقت بھی فراز حرف حق لکھنے سے پیچھے نہیں ہٹے اور مسلسل قلم کی حرکت کے امین بنے رہے ۔

احمد فراز نے ادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں ، فراز کے والد اردو اور فارسی کے بڑے ادیب تھے جس کی وجہ سے ان کے یہاں شیخ سعدی شیرازی ، بیدل ، حافظ شیرازی ، اور مرزا غالب کے چرچے بچپن سے وہ سنا کرتے تھے ، فراز کے والد آغا برق کوہاٹی کی بزم سخن کے نام سے خود ایک ادبی انجمن تھی جہاں ادب کی بڑی بڑی مجلسیں اور مشاعرہ ہوا کرتے

تھے فراز گاہے بہ گاہے ان مجلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے جس سے فراز کی شاعرانہ صلاحیت کو جلا ملتی تھی بقول رضا ہمدانی

"سید احمد شاہ نے جس ماحول میں شعری زندگی کا آغاز کیا وہ ادبی ماحول تھا، پھر جس گھر میں اس نے جنم لیا اور پرورش پائی وہ بھی شعری نعمت سے خالی نہ تھا۔ اس کے والد آغا محمد شاہ برق فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے پشاور کی قدیم انجمن "بزم سخن" پشاور کے سکریٹری بھی تھے، حضرت علامہ تاجور نجیب آبادی کے ہونہار تلامذہ میں شمار ہوتے تھے "پیش ماہ کہ بنشیں کہ ماہ شوی" کے مصداق احمد شاہ بھی اس روشنی میں کھو گئے اور جب اس چاند کی کرنوں نے اسے گد گدیا تو وہ احمد شاہ سے گوہر اور پھر شرر برقی بن گیا"[26]

فراز کو شاعری ورثے میں ملی تھی ، فراز کی شاعرانہ قد و قامت میں ان کے والد کا بڑا ہاتھ ہے ، برق کوہاٹی پشاور کے محلہ ناصر طاہر وردی عرف کوچہ رسال دار عقب قصہ خوانی میں جنم لینے والی اس خطے کی اولین ادبی انجمن "بزم سخن "کے لئے سرگرم عمل تھے اس زمانے میں برق کوہاٹی کے ادبی حریف ضیاء جعفری " دائرۂ ادبیہ " چلاتے تھے ، برق کوہاٹی " بزم سخن "کے اور ضیا جعفری " دائرۂ ادبیہ " کے صدر نشین تھے ، فراز کا شاعری کے ابتدائی دور میں " بزمِ سخن "میں اٹھنا بیٹھنا تو تھا ہی اس کے ساتھ ساتھ وہ دائرۂ ادبیہ میں بھی شرکت کرتے رہے ۔مذکورہ بالا دونوں انجمنوں کے اختتام پر پشاور کی ادبی محفلیں فارغ بخاری کے قائم کردہ ان کے مکان کی بیٹھک میں منعقد ہونے لگیں ، پشاور کے شعر و ادب کی ترقی و ترویج میں اس بیٹھک کا بڑا ہاتھ ہے یہ ادبی بیٹھک قصہ خوانی ،پشاور کے

محلہ خدا داد میں واقع تھی ، تقریبا پچیس برس تک یہ بیٹھک علم وفن کا مرکز بنی رہی اس بیٹھک میں احمد فراز کی ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے فارغ بخاری اپنے البم میں لکھتے ہیں ۔

"احمد فراز کی تربیت و تہذیب اسی بیٹھک میں ہوئی یہیں پر اس نے شاعری کے اسرار و رموز سیکھے نقد و نظر سے آگاہی حاصل کی ادبی مباحثوں میں حصہ لیا" 27

یہاں اُن کو ایسی شخصیات کی صحبت میسر آئی جو اپنے وقت کے مانے ہوئے شاعر و ادیب تھے ۔ ضیاء جعفری ۔ نذیر برلاس ، مظہر گیلانی ، مرزا محمود سرحدی ، خاطر خانوی ، ملک اختر جعفری ، امیر حمزہ شنواری ، قاضی عبد الحکیم اور تاج سعید ، وغیرہ کی صحبت و رفاقت نے فراز کی چھپی ہوئی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھرنے کا موقع فراہم کیا ، اس کے علاوہ ملکی و غیر ملکی ادباء و شعرا بھی اس ادبی بیٹھک کی محفلوں کو شرف شمولیت بخشتے ، لاہور ، کراچی، لندن، روس اور ہندوستان سے بھی اہل قلم پشاور جاتے تو اس بیٹھک میں کچھ دن ضرور گزارتے ، ن ، م راشد ، انصار ناصر ، الیاس عاشق، اور سید ذوالفقار علی بخاری بھی جب پشاور جاتے تو اس بیٹھک میں ضرور حاضری دیتے رضا ہمدانی اس حوالے سے کہتے ہیں

"سینیر اہل ذوق و ادب کے اس ہجوم میں احمد فراز اس وقت جونیئر سہی مگر ایک نمایاں حیثیت سے ابھرا ہوا فرد لگتا تھا" 28

فراز کی شاعرانہ زندگی کی شروعات اسی بیٹھک سے ہوئی ، یہاں انھوں نے چھوٹے بڑے مشاعروں میں شرکت کی اور بہت جلد شہرت کے زینے چڑھنے لگے ، فراز کی شہرت میں ان کی باغ و بہار شخصیات کا بھی بڑا ہاتھ ہے ، وہ اپنی خوش طبعی ، بزلہ سنجی ، چٹکلوں ، لطائف اور فقرے بازی سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے ، وہ بہت ذہین واقع ہوئے تھے بڑے بڑے منہ پھٹ حضرات کا قافیہ تنگ کر دیا کرتے تھے ، اپنے منفرد لہجے اور جاذب

شخصیت کی بدولت بہت جلد مقبول ہوگئے اور دور دور تک ان کی شہرت پہنچ گئی فراز اپنی شاعری کی ابتداء کے حوالے سے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں ۔

"جب شعر و شاعری کا شوق یا بیماری لگی تو پھر ہم نے والد کی محفلوں سے علحدہ محفلوں میں جانا شروع کر دیا اور اس طرح ان سے کبھی کبھی بحث بھی کرتے تھے" 29

انھیں دنوں علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک کا بھی دور دورہ تھا اس تحریک کی شہرت پشاور کی فضاؤں میں گونج رہی تھی ، بچے جوان بوڑھے اور خواتین ہر قسم کے لوگ اس تحریک کی طرف کھنچے چلے آرہے تھے اس تحریک نے عام لوگوں میں زندگی کی نئی امنگ اور جینے کا ولولہ پیدا کیا تھا ، دیگر مکتب فکر کے ساتھ ساتھ قلم قبیلہ بھی اس تحریک سے وسیع پیمانے پر متاثر تھا ، جن میں رضا ہمدانی ، فارغ بخاری ، ضیاء جعفری ، مظہر گیلانی ، عشرت سرحدی وغیرہ شامل تھے ، یہ تمام ادبا و شعراء اس تحریک کے لئے نظمیں اور ترانے تخلیق کیا کرتے تھے ، خاکسار تحریک کا قیام لاہور میں علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کے ایماء پر اپریل 1931 ء کو وقوع پذیر ہوا ، علامہ مشرقی نے خاکسار تحریک کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ ان کے مطابق ہندوستان کی آزادی اور بالخصوص مسلمانوں کی فلاح کے لئے کام کرنے والی تمام سیاسی جماعتیں ،ناکام ہو چکی تھیں انتشار کے اس موقع پر مسلمانوں کی رہنائی کے لئے کسی قابل لیڈر کی ضرورت تھی اس ضرورت کو مد نظر رکھ کر انھوں نے اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی خدمات پیش کیں، خاکسارو ں پر مشتمل ٹولے کی قیادت سنبھالی اور ہندوستان کی آزادی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ، اس تحریک کا مقصد قومی اور بین الاقوامی سطح پر عوام کی فلاح و بہبود کے کام اور انگریز سامراج کی ظلم و زیادتی ، سرمایہ داری اور سماج دشمن عناصر کے خلاف آواز اٹھانا تھا، ا اس کی مقبولیت نے اس دور میں انگریز سامراج کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا اور اسے باغی ٹولہ قرار دیا تھا اس

تحریک میں بچے اور نو عمر جوان بھی شامل تھے ، نو عمر خاکساروں کا ایک دستہ بیلچے اٹھائے مارچ کرتے نظر آتا چونکہ اس تحریک کی بنیاد بھی احتجاج،مزاحمت اور حق کے حصول پر مبنی تھی جو احمد فراز کی سرشت کا خاصہ تھا اس لئے ان کی شخصیت پر اس تحریک کے گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے ، نو عمر فراز کو بھی اس تحریک کے نو عمر دستے کا بیلچے اٹھائے مارچ کرنے کا انداز بہت پسند آیا اس لئے انھوں نے بھی نو عمروں کے اس دستے میں شمولیت اختیار کرکے اس تحریک کی قیادت کی ذمہ داری سنبھال لی، اس حوالے سے محبوب ظفر اپنی کتاب "احمد فراز شخصیت اور فن" میں کہتے ہیں ۔

"بچپن سے ہی آپ کو خاکسار تحریک کے نعروں اور ولولوں کی گونج سنائی دی جس نے آپ میں ایک مجاہدانہ جذبہ پیدا کیا ، احمد شاہ جب خاکی وردی پہنے نو عمر بیلچہ برداروں کو پشاور کی سڑکوں پر پریڈ کرتے دیکھتا تو اس کا جذبۂ جانسپاری عود کر آتا "[30]

احمد فراز نہایت شرمیلے واقع ہوئے تھے پڑھائی میں کوئی خاص نہیں تھے ریاضی میں تو کافی کمزور تھے یہی کمزوری فراز کی شاعری کی پہچان بن گئی اس کا واقعہ کچھ یوں ہوا کہ فراز ریاضی میں کمزور تھے جس کی وجہ سے ان کے والد نے ریاضی کے لئے ٹیوشن لگا دی ، فراز کی ریاضی کی ٹیوشن کے لئے ایک لڑکی آیا کرتی تھی ایک دن اس نے فراز سے بیت بازی کے بارے میں معلوم کر لیا، جس سے فراز بالکل ناواقف تھے ، فراز نے نفی میں جواب دیا تو اس نے پوچھا کہ شعر یاد ہیں ، فراز نے کہا میرے والد خود ایک بڑے شاعر ہیں مجھے شعر کیوں نہیں یاد ہونگے ، پھر اس لڑکی نے فراز کو بیت بازی کے بارے میں بتایا کہ بیت بازی کیا ہوتی ہے ، بالآخر اس لڑکی اور فراز کے درمیان بیت بازی شروع ہوئی مگر بس شروع ہی ہو سکی تھی کہ ختم بھی ہوگئی کیوں کہ دو تین اشعار کے بعد فراز کا خزانہ خالی خالی نظر آنے لگا تو فراز کو اس بات کا احساس ہوا کہ شعر یاد ہونا الگ بات ہے ، موقع پر شعر کہنا الگ

، اب فراز اپنے آپ کو بیت بازی کے لئے تیار کرنے لگے اور گھر میں موجود پرانے شعراء کے مجموعے اٹھاکر ورق گردانی کرنے لگے چند دنوں کے بعد فراز نے پھر بیت بازی کا مقابلہ کیا تاہم اس بار بھی فراز اس میدان میں نو سکھیا ہی نظر آئے لیکن فراز نے ہار نہیں مانی اور با قاعدہ اشعار یاد کرنے میں لگ گئے اس طرح کئی بار اس لڑکی سے بیت بازی ہوئی تاہم فراز کے پاس اشعار کا خزانہ کم ہی پڑتا نظر آیا جب فراز کے پاس اشعار کم پڑ جاتے تو خود سے اشعار بنانے کی کوشش کرتے تاکہ ہار کا منہ نہ دیکھنا پڑے ، اس کے لئے فراز تک بندی سے کام لیتے اور کسی نہ کسی طرح اس لڑکی سے مقابلہ کرتے رہتے ۔

احمد فرازؔ کی شخصیت میں بلا کا سحر تھا اور اُن کی آنکھوں میں ایک عجیب شوخی ہر دم رقصاں رہتی تھی۔بقول رحیم گل مرحوم'' فراز ہنستا ہے تو اُس کی آنکھوں سے سات سُر نکلتے ہیں'' ۔بے ساختہ اور بھرپور طنز کی حس اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ہر وقت تبسم برلب رہتے تھے اور کسی بھی لمحے مزاح یا طنز سے بھرپور جملہ داغ دیا کرتے تھے،احمد فراز کو ساری زندگی اپنے ہم عصر شعراء و ادباء سے یہ گلہ رہا کہ جب بھی حرف حق کہنے کا وقت آیا ان کے تمام ہم پیشہ و ہم مشرب خاموشی کی چادر اوڑھ کر کنارہ کش ہو گئے فراز نے ہر لمحہ ظالم و جابر کو للکارا اورباقی ہم عصر شعرا سے بھی یہی توقع رکھی کہ سارے مل کر ظلمت کا خاتمہ کے لئے جنبش قلم کریں ، لیکن ان کے دوستوں میں کچھ ایسے بھی نکل آئے جنھوں نے مصلحت کا دامن پکڑ کر ظالم کا ساتھ دیا ، فراز کے خیال میں ادیب آزاد ہے اور اظہارِ رائے کی آزادی اس کا حق ہے ۔ ان کی اقدارِ حیات میں حریت کی پاسداری ،ضمیر اوراظہار کی آزادی، قلم کی حرمت اور انسانی حقوق کے تحفظ کا مقام بہت ارفع ہے۔

1958ء میں پاکستان میں مارشل لگا دیا گیا یہ پاکستانی تاریخ کا پہلا فوجی قانون تھا،جو میجر جنرل ایوب خان کے ہاتھوں نافذ ہوا،اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہا اور تاریخ پاکستان میں مختلف اوقات میں وقفے وقفے سے فوجی قوانین نافذ ہوتے رہے۔پاکستان کے ابتدائی ناگفتہ بہہ حالات وواقعات سے مایوس عوام کی طرح احمد فراز نے بھی فوجی بندوبست کو کارستان میں تازہ ہوا کا جھونک

سمجھالیکن بہت جلد یہ خیال خام خام نکلااور فوجی حکومت پاکستانی عوام پر جبر مسلسل کی اگلی کڑی ثابت ہوئی جس سے روشنی کی امید تھی وہ فرد واحد خدا بن بیٹھااور عوام کو روشنی کے بجائے تاریکی کے اندھے غار میں ڈھکیل دیا فراز کے اندر جہاں ہم وطنوں سے محبت وعقیدت تھی وہیں علم کی شمع کے پروانوں کے لئے بھی دل میں محبت وخلوص کا جذبہ تھا۔ دیگر ظلم و جبر کے ساتھ ساتھ ان سے طلباء کی حق تلفی بھی برداشت نہیں ہوتی تھی1952 ء کا واقعہ ہے کہ کراچی میں طلبہ پر فائرنگ کی گئی ، اور طلبہ کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا ، بہت سوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا اسی واقعہ سے متاثر ہوکر فراز نے اپنی نظم جانشین لکھی تھی فراز ایک سچے انقلابی تھے اور انقلاب کا تصور ان کے ذہن میں صرف سیاسی نہیں تھا بلکہ سماجی انصاف اور مساوات پر مبنی ایک صحت مند نظام کا قیام تھا ، انھوں نے انسانی طبقات کے درمیان کشمکش پر خاصی توجہ دی اور آغاز شاعری میں ہی عدمِ مساوات کے خلاف آواز اٹھائی ۔ وہ آزادی کے پرستار ، مساوات کے حامی اور سرمایہ داری کے دشمن تھے ، محبت اخوت اور انسان دوستی ان کا مذہب تھا۔ ان ہی کے الفاظ میں ۔

"ہمارے یہاں تو لوگوں کو انصاف اور نظام عدل پر
اعتماد ہی ختم ہو گیا ہے ، اصولوں اور انصاف کے بغیر
نہ تو ملک بنتے ہیں اور نہ ہی چلتے ہیں" [31]

فراز بھرپور سیاسی شعور کے مالک تھے ، وہ پاکستانی سیاست اور سیاست دانوں کی نفسیات سے خوب واقف تھے ، قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں ہونے والے سیاسی اتار چڑھاؤ پر شروع سے ہی ان کی نظر گہری تھی چونکہ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا اس لئے بھی عوام دشمن سیاست دان اور سرمایہ دار زیادہ ان کے زیر عتاب رہے ، دوسرے یہ کہ جو لوگ شریک سفر نہ تھے زمام کار کا ان کے ہاتھوں میں آنا سب کے لئے پریشانی اور غم وغصے سے خالی بات نہیں تھی ۔

فراز نے 1971ء کی جنگ میں بحیثیت شاعر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور ملک و قوم کی عوام اور فوج کو
ہمت حوصلہ عطا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی سقوطِ ڈھاکہ کے موقع پر وہ قوم کے غم میں پوری طرح شریک تھے اور حوصلہ دے رہے تھے ، انھوں نے پاکستانی ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے پروگراموں کی ترتیب میں بھی حصہ لیا، اور خود اپنے تحریر کردہ ڈرامے " سپاہی اور موت " میں بطور اداکار کام بھی کیا ، فراز حالات کے پیش نظر قومی ترانے اور گیت تحریر کرتے جو راولپنڈی سینٹر سے گلوکارہ طاہرہ سید کی آواز میں نشر کئے جاتے ، اس حوالے سے آغا ناصر کہتے ہیں :

"احمد فراز نے اس مشکل وقت میں ہمارا بہت ساتھ نبھایا وہ ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار رہتے اور قومی اہمیت کے حوالے سے ترتیب دئے جانے والے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ۔۔۔ وہ پشاور سے ٹیلی فون پر اپنے نئے نغمے اور نئی نظمیں ہمیں لکھاتے اور ہم جلدی جلدی ان کی دھنیں بنوا کر انھیں نشر کرتے" [32]

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے زمانے میں فراز نے مختلف ادباء و شعرا کو ظلم وجبر کے خلاف آواز اٹھانے کی ترغیب دی ، انھوں نے نہ صرف ببانگِ دہل آواز بلند کی بلکہ دوسروں کو بھی حرف حق کہنے پر مجبور کیا ان کے خیال میں ادیب کا فرض ہے کہ وہ جبر کے ماحول میں حق کا ساتھ دے ۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں ۔

"ادیب کو اظہارِ رائے کی آزادی ہونی چاہئے اگر ایک ادیب آزادانہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا تو اس کے وجود کی

کیا ضرورت ہے" 33

آمر وقت کی طرف سے دھمکیوں کے باوجود انھوں نے حق کا ساتھ نہیں چھوڑا، اگرچہ بہت مصلحت کوشوں نے انھیں حرف حق کہنے سے منع کرنے کی کوشش کی لیکن وہ خاموش نہیں رہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک کہتے ہیں۔

"اس فراز کے رفقاء کرام اور بزرگانِ شفیق نے خونخوا ر آمریت سے در گزر کرتے رہنے کے بہت سے مشورے دئے مگر احمد فراز نے ایک نہ مانی" 34

جب احمد فراز کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو انھوں نے فوج کے خلاف محاذ کھول دیا اور پہلا ہتھیار استعمال کرتے ہوئے " پیشہ ور قاتلو "نظم لکھی جس کا ایک ایک لفظ جنرل ضیاء الحق پر قہر بن کر گرا اس بارے میں جمیل یوسف اپنے مضمون "فراز کی شہرت اور مقبولیت کاراز" کہتے ہیں ۔

"اس کی عزت اور شہرت میں اگر کوئی کمی باقی تھی تو وہ جنرل ضیاء الحق کے دورِ آمریت میں " پیشہ ور قاتلو "جیسی نظم لکھنے پر اس کی گرفتاری اور حراست نے پوری کردی"35

پیشہ ور قاتلو " نظم کے منظرِ عام پر آتے ہی جنرل ضیاء الحق کے اوپر برہمی اور بے چینی طاری ہوگئی وہ انتقام کی آگ سینے میں لیکر اٹھے اور فراز کے خلاف کاروائی شروع کی ، جس کی وجہ سے زندگی میں پہلی بار فراز کو انتہائی اذیت اور قید تنہائی کا سامنا کرنا پڑا ، یہ بھٹو کا دور تھا اور جنرل ٹکا خان وزیر دفاع تھے ضیائی دور میں فوج نے جو کچھ کیا اس کے خلاف فراز نے یہ نظم لکھی تھی ۔ اس کے پس منظر کے حوالے سے فراز خود کہتے ہیں ۔

جب لاہور میں کچھ نوجوان مارے گئے میں نے " پیشہ ور قاتلو "لکھی اور گرفتار کرلیا گیا" 36

1977" میں جب فوج نے عوام پر گولی چلائی تو میرا دل ٹوٹا، فوج کا کام اپنے لوگوں پر گولی چلانا نہیں ہے ۔ میں نے کہا ہم فوجیوں کو اتنی مراعات اور سہولتیں فراہم کرتے ہیں تاکہ جب ملک اور قوم پر آزمائش کا وقت آئے تو ہماری حفاظت کریں اور اپنی جان قربان کردیں ، یہ نہیں کہ اپنے ہی لوگوں پر گولیاں چلائیں"[37]

1977 "میں خاکی وردی والوں نے لاہور میں چار بے گناہ لڑکوں کو (طالب علموں کو) مار دیا تھا ، میں ان کے اس عمل کی مذمت کئے بغیر نہ رہ سکا میں نے ان کے خلاف ایک نظم لکھی، جس سے اعلیٰ فوجی حکام برہم ہوئے ، جس کے نتیجے میں مجھے انھوں نے قید تنہائی میں رکھا" [38]

غرض 1977 میں ضیاء الحق کے دور میں فوج نے جو کچھ کیا ان کے خلاف فراز نے مزکورہ نظم لکھی ضیاء الحق جیسے ڈکٹیٹر کے دور میں فوج کے خلاف اس قسم کی نظم لکھنا کوئی معمولی بات نہیں، فراز نے ہر محبت اور جمہوریت پسند کے دل کی صحیح معنوں میں ترجمانی کی تھی ۔ نظم کا منظرِ عام پر آنا کیا تھا کہ ہر طرف اس کی شہرت کے چرچے ہونے لگے ، پابندی کے باوجود یہ نظم جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک پاکستان میں پھیل گئی ، فراز نے صدیق سالک اور کرنل محمد خان کے توسط سے یہ نظم جنرل ضیاء الحق تک پہنچائی تھی اس کے بعد فراز کے خلاف فوجی کاروائی شروع ہوئی، خبر اُڑی کہ احمد فراز نے ایک نظم لکھی ہے جس پر فوج کے بعض حضرات ناخوش ہیں ۔ فراز کو آئی اے رحمٰن اور ایوب مرزا نے خبر دار کیا کہ ملٹری انٹلی جنس والے ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، لہٰذا محتاط رہیں اسی طرح ایک دن فراز اوران

کے دوست سیف الدین سیف شالیمارریکارڈ نگ کمپنی سے واپس آئے اورجب گاڑی سے اترےتو چاروں طرف سے پولیس نے گھیر لیا ،ایک میجر نے ان سے جان پہچان کے بارے میں پوچھا اورتصدیق ہونے پر بتایا کہ آپ زیرِ حراست ہیں اورگرفتاری کا وارینٹ سامنے دکھا دیا ، فراز کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور راولپینڈی میں جائیگ ایریا نامی ایک جگہ پہنچا دیا گیا جہاں فوجی مجرموں اور جاسوسوں کو رکھا جاتا تھا ، فراز کی گرفتاری سے کچھ دن پہلے ہی ملکی و سیاسی حالات کی سنگینی کے باعث ہنگامی حالات کو کنٹرول کرنے کے لئے حکومت نے نیا قانون منظور کروایا تھا جس کے تحت عام شہری پر بھی فوجی انداز میں مقدمہ چلایا جا سکتا تھا یعنی غیر فوجیوں کا بھی کورٹ مارشل ہو سکتا تھا ، فراز کو بھی اس نئے قانون کے تحت گرفتار کیا گیا ، فراز کو جائنک ایریا میں لے جاکر نیم تاریک ایک چھوٹے سے تہہ خانے میں بندکر دیا گیا جہاں تشدد کرنے کے آلات اور ٹوٹی پھوٹی کرسیاں پڑی تھیں ، فراز کی آنکھوں سے جب پٹی اُتاردی گئی تو وہ اپنی آنکھوں کے سامنے صرف دیواریں ہی دیواریں اور سنا ٹا ہی سناٹا تھا ، فراز نے پوری رات ایک ٹوٹی کرسی پر اونگھ کر گزاری،اگلی صبح انھیں کمرےسے نکال کراوپر سیڑھیاں چڑھا کر لے جایا گیا ، جہاں ان کو کھلی فضا میں چند لمحوں کے لئے طبیعت میں بحالی کا احساس ہوا اسی وقت فراز نے کہیں دور فاختہ کی آواز سنی تو فوراً یہ شعر کہا

دور اک فاختہ بولی ہے بہت دور کہیں
پہلی آواز محبت کی سنائی دی ہے

اگلے دن پھر ان کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور ایک ٹرک میں بٹھا کر تقریبا ڈھائی گھنٹے کی مسافت

کے بعد اٹک کے قریب فوجی مرکز کے مانسر کیمپ میں پہنچا دیا گیا ، جہاں انکو قید تنہائی میں رہنا تھا ،فراز کہتے ہیں۔

"اسی دوران کیمپ کمانڈینٹ جو ایک میجر تھا ، میرے
پاس آیا اور مجھے کافی دیر عجیب سی نظروں سے دیکھتا
رہا ، پھر کہنے لگا ، آپ احمد فراز ہیں ؟ میں نے کہا آپ
کو یہ تو بتایا گیا ہو گا کہ کون نیا مہمان آرہا ہے ، تو ا
سنے بتایا کہ مجھے کہا گیا ہے کہ ہندوستان کا ایجینٹ بھیج
رہے ہیں"[39]

فراز نے یہاں تنہائی کی قید کاٹی، بڑے ہی اذیت کے دن گزارے ، اگرچہ ان پر کسی قسم کا کوئی جسمانی تشدد نہیں کیا گیا ۔ لیکن ان کے نزدیک تنہائی سے زیادہ اذیت ناک چیز کوئی نہیں اس حوالے سے شہزاد احمد لکھتے ہیں ۔

"اس (فراز)نے چھوٹتے ہی مجھ سے کہا " تمھیں کیا
معلوم قیدِ تنہائی کیا ہوتی ہے انسان کے اندر تمام اذیتیں
اور ڈراؤنے خواب کس طرح اسے گھیر لیتے ہیں " میں نے
اس سے کہا " کیا انھوں نے تمھیں کوئی جسمانی اذیت
بھی دی تھی ؟۔ وہ بولا سب سے بڑی جسمانی اذیت تنہائی
ہوتی ہے انسان کا تنہا اکیلے رہ جانا سب سے بڑی جسمانی
سزا ہے" [40]

جس وقت فراز کو گرفتار کیا گیا اس وقت سیف الدین سیف ان کے ساتھ تھے اس لئے ان کے توسط سے ان کے عزیز احباب تک ان کی گرفتاری کی اطلاع پہنچ گی تھی ، قید تنہائی میں کسی کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی یہاں تک کہ ان کی اکیلی بہن اور دوست ضیاء بھی ان سے ملے بغیر واپس کر دئے گئے فراز کے خلاف کورٹ ماشل کی کاروائی کرنے کے لئے مسعود مفتی کو بطور گواہ استغاثہ مقرر کیا گیا ۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں ۔

"فراز کے خلاف فوجی فوجی عدالت نے کورٹ مارشل کی کاروائی شروع کر دی گئی اور میرے علم کے بغیر مجھے اس میں استغاثہ کا گواہ نامزد کر دیا گیا ، کاروائی آگے بڑھی تو میں نے فراز کے خلاف شہادت دینے سے انکار کر دیا خوش قسمتی سے ہم دونوں کسی نقصان سے بچ گئے کیوں کہ چند ہفتوں بعد حکومت نے خود ہی وہ مقدمہ واپس لے لیا" 41

مسعود مفتی اپنے ایک مضمون" اور پھر وہ بھی زبانی میری"میں اس حوالے سے کہتے ہیں ۔

"کورٹ مارشل کی کاروائی میں میرا نام بطور گواہ استغاثہ شامل ہے ۔۔۔ جی ایچ کیو سے فون آیا کہ ایک کرنل صاحب تفتیش کے لئے مجھے ملنے دفتر آرہے ہیں ، خوش قسمتی سے ان کا تعلق قانون کی برانچ سے تھا وہ سارے معاملے کے قانونی پہلوؤں کو سمجھتے تھے اس لئے منجملہ اور ساری باتوں کے میں نے ان سے کہا کہ میرے علم اور مشورے کے بغیر میرا نام بطور گواہ استغاثہ ڈالا گیا ہے غالباًاس وجہ سے کہ میں سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے فوجی رپورٹ کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا ورنہ ملازمت جانے کا خطرہ ہے اور استغاثہ کو ایک معتبر گواہ مل جانے سے فراز کی سزا یقینی ہوجاتی لیکن میرا موقف یہ ہے کہ میں بطور گواہ اشتغاثہ پیش نہیں ہونگا اگر عدالت مجھے طلب کریگی تو میں عدالتی گواہ کے طور

پر پیش ہو جاؤں گا اور فوجی عدالت میں جاکر بھی یہی پوزیشن لونگا" [42]

فراز کے بقول تین ہفتے کے بعد ہائی کورٹ کے حکم کی وجہ سے میری رہائی ممکن ہوئی ، مگر کورٹ مارشل کی کاروائی ابھی باقی تھی کہ حکومت نے خود ہی ان کا مقدمہ واپس لے لیا۔ گرفتاری کے بعد کسی کو خبر نہیں تھی کہ فراز کہاں ہیں اس لئے ان کے دوست سیف الدین سیف نے حکومت کے خلاف مقدمہ درج کر دیا ، تین چار روز کی سماعت کے بعد حکومت کو مجبوراً عدالت کے حکم پر فراز کو عدالت میں پیش کیا گیافراز کو بیان کے لئے لاہور لے جایا گیا، جہاں انھیں جسٹس افضل ظلہ کی عدالت میں پیش کیا گیا، بند کمرے کی اس خفیہ سماعت کے موقع پر احمد ندیم قاسمی، کشور ناہید سیف الدین سیف، اور یوسف کامران وغیرہ موجود تھے۔جج نے ان کو بتایا کہ کیس کے فیصلے تک وہ حراست میں رہیں گے ۔ اسی دوران میڈیا پر ان کی سماعت کی خبر چلی۔ فراز نے یہ خبر سلاخوں کے پیچھے ایک اخبار "پاکستان ٹائم "میں پڑھی جو ان کو جیل میں فراہم کی گئیں۔ جس دن فیصلہ ہوااس دن اخبار نہیں مل سکا تو انھوں نے ایک ہاکر کے ذریعہ اخبار منگایا، جس میں فیصلے کی خبر چھپی تھی کہ عدالت نے فراز کی رہائی کا حکم سنادیا ہے فراز نے فوراً کیمپ کمانڈینٹ کو بلایااور اس کے بارے میں آگاہ کیا کہ آپ نے اس حوالے سے مجھے کیوں نہیں بتایا اور خبر دار کیا کہ اب آپ توہین عدالت کے مرتکب ہو رہے ہیں، اس لئے انھوں نے فراز کو جی ایچ کیو راولپینڈی بھیج دیا جہاں ان سے اقراری بیان پر دستخط لئے گئے ، جس میں لکھا تھا بہ وقت ضرورت عدالتی حکم کے مطابق فوجی حکام کو دستیاب ہونگے۔

اس سلسلے میں 30 جون 1977 کو انھیں فون پر خبر دی گئی کہ جی ای کیو حاضر ہو جائیں، آرمی چیف جنرل ضیاء الحق آپ سے ملنا چاہتے ہیں، چنانچہ فراز پہنچ گئے جنرل ضیاء الحق کسی میٹنگ میں مصروف تھے ، فراز نے تین گھنٹے کے انتظار کے بعد دریافت کیا" مجھے بتائیں میں آزاد ہوں یا زیر حراست " تھوڑی دیر بعد انھیں بتایا گیا کہ جنرل صاحب کی میٹنگ تھوڑی طویل ہو گئی ہے ،وہ یہاں نہیں آسکتے ہیں، آپ کو ان کی رہائش گاہ لے جاکر ملاقات کرائی جائے گی ، بریگیڈیر راحت لطیف اور کرنل قیوم اُنکو چیف آف

آرمی سٹاف کے گھر لے گئے اس ملاقات کے وقت جنرل کے پاس دو تین اور بریگیڈیر بھی موجود تھے جن میں جنرل کے ایم عارف بھی موجود تھے، جو فراز کا ایڈورڈ کالج پشاور میں کلاس فیلو رہ چکے تھے لیکن بقول فراز "وہ وہاں اتنالا تعلق بنا بیٹھا ہوا تھا کہ جیسے مجھے جانتا ہی نہ ہو" جنرل ضیاء الحق نے اس ملاقات کے آخر میں فراز کو یہ مژدہ سنایا کہ آپ کو وزیر اعظم کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے ہمیں آپ کے خلاف مقدمہ واپس لینے کے لئے کہا ہے، اس ملاقات کے دوران فراز نے ایک موقع پر ضیاء الحق سے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ جنرل یہ جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے وہ ٹھیک ہے، فراز کہتے ہیں اس وقت اس کی آنکھوں میں جو مکر تھا وہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا، کہنے لگا "نہیں سب تو ٹھیک نہیں ہو رہا" ٹھیک پانچ روز بعد ہی بھٹو حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا۔

اس ملاقات میں فراز کی وہ نظم جس پر ان کو قیدِ تنہائی کی اذیت برداشت کرنی پڑی تھی بھی سنانے کی پیش کش کی گئی تھی، فراز نے جواب دیا کہ وہ مجھے یاد نہیں، اس پر دو بریگیڈیروں نے اپنے بریف کیس کھول کر نظم کی کاپی سامنے رکھ دی، جس پر جابجا سرخ نشان لگے ہوئے تھے فراز نے وہ نظم پڑھ کر سنائی۔ نظم پڑھنے کے دوران جنرل ضیاء الحق کے تاثرات کے بارے میں فراز کہتے ہیں، وہ بہت بڑا عیار دشمن تھا، سنتا رہا اور اس دوران ہوں ہوں کر کے سر ہلاتا رہا، ملاقات کے اگلے ہی دن اخبارات میں خبر آگئی کہ وزارت دفاع نے فراز کے خلاف مقدمہ واپس لے لیا، کیوں کہ ان کو فراز کے خلاف بغاوت کا کوئی ثبوت نہیں ملا، مقدمہ واپس لینے کی وجوہات مختلف ہو سکتی ہیں عدالت کو بغاوت کا کوئی ثبوت نہیں ملا، فراز کا خود نظم کی تخلیق سے انکار، علاوہ ازیں ذوالفقار علی بھٹو نے وزیر دفاع ٹکا خان کو مقدمہ واپس لینے کے لئے مجبور کیا اس حوالے سے عابد حسن منٹو اپنے مضمون "فراز" میں کہتے ہیں۔

> **"کئی ہفتے گزر جانے کے باوجود فوجیہ حکومت بغاوت کے اس نام نہاد مقدمے کو اپنی ہی بنائی ہوئی عدالت میں بھی پیش نہ کر سکی کیوں کہ انھیں کوئی شہادت میسر نہیں آرہی تھی اور یہ کہ بہر حال یہ نظم بغاوت کے نہیں صرف احتجاج کے جذبات کا اظہار کرتی ہے"**[43]

جب عدالت میں فاضل منصف نے فراز سے سوال کیا کہ مذکورہ نظم آپ ہی نے تخلیق کی ہے تو انھوں نے صاف

انکار کر دیا، اس حوالے سے عابد حسن منٹو کہتے ہیں۔

"کھلی عدالت میں سماعت کے بعد جج نے فراز کو اپنے کمرے میں بلایا اور اس سے نظم کے بارے میں استفسار کیا، فراز نے کہا کہ وہ نہیں جانتا کہ نظم کس کی ہے۔۔۔۔۔ کچھ روز بعد میں نے سیف صاحب سے اس بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ فراز صاحب کو بیان دینے کا مشورہ انھوں نے ہی دیا تھا کہ ان کا خیال تھا کہ فراز کا اقبالی بیان فوجی حکومت اس کے خلاف استعمال کر سکتی تھی"[44]

اب سوال یہ ہے کہ فراز کو گرفتار کس نے کروایا اور رہا کس نے کرایا؟ کشور ناہید کے مطابق فراز کی گرفتاری بھٹو کی مرضی سے عمل میں آئی تھی کیوں کہ بھٹو کے خیال میں تمام اہلِ قلم ان کے حمایتی ہیں اور فراز نے اس صورتِ حال میں ان کو مشکل میں ڈال دیا ہے، کشور ناہید کہتی ہیں۔

"1977 کے اس ہنگامہ خیز دور میں جب آپ اٹک کے قلعہ میں گرفتار تھے ایک دن میں نے بیگم نصرت بھٹو سے بات کی، کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ آپ کی گرفتاری بھٹو صاحب کی رضامندی سے ہوئی تھی"[45]

اس موقع پر اہل قلم مصاحبین نے ان کی رہائی کے لئے کوششیں شروع کر دیں، کشور ناہید کہتی ہیں۔

" ایک دن میں اور مسعود اشعر ملکئہ ترنم نور جہاں سے ملاقات کرنے گئے، ہمیں معلوم تھا کہ وہ بھٹو صاحب کو بہت پسند کرتی ہیں اور اسی کے ساتھ وہ اس دور کی ایک مشہور خاتون بلیک کوئین کی گہری دوست بھی ہیں کئی دن تک بحث و

مباحثہ کے بعد ملکہ ترنم نور جہاں کراچی جانے پر رضا مند ہو
گئیں تا کہ بلیک کوئین سے ملاقات کی جائے انھوں نے بلیک
کوائین کو
اس بات پر قائل کر لیا کہ وہ بھٹو صاحب سے احمد فراز کی
رہائی کے لئے درخواست کریں گے یہ بڑی ہمت کا کام تھا جس
کو بلیک کوئین نے اپنے توبہ شکن حصن سے سرانجام دیا"[46]

مسعود اشعر اور کشور ناہید کی درخواست پر ملکہ ترنم نور جہاں نے بلیک کوئین کے حکم سے ذوالفقار علی بھٹو نے وزارتِ دفاع (جنرل ٹکا خان) کو مقدمہ واپس لینے پر مجبور کیا اور اس طرح فراز کی رہائی عمل میں آئی، رہائی کے فوراً بعد فراز کی بھٹو سے کی گئی گفتگو کے بارے میں فراز کہتے ہیں۔

"بھٹو صاحب سے بات ہوئی وہ کہنے لگے فراز میں نے تمھیں دو
بارہ بچایا اور اس بار تمھاری خوش قسمتی ہے کہ تم زندہ بچ گئے ہو
۔میں نے کہا سر دو بار نہیں کئی بار مجھے بچایا ہے"[47]

جس طرح فراز کو "پیشہ ور قاتلو" پر قید تنہائی کا سامنا کرنا پڑا تھا اسی طرح نظم "محاصرہ" پر صوبہ سندھ بدری کی سزا دی گئی، فراز نے جب" محاصرہ لکھی تو حکمرانوں کے دل دہل گئے ، اور احمد فراز کی جان کے دشمن بن گئے ،انوار فیروز اپنے مضمون "احمد فراز کی زندہ شاعری" میں کہتے ہیں۔

"کراچی میں احمد فراز نے ایک نظم پڑھی تو آمریت کے ماتھے پر
بل پڑ گئے اور اسے صوبہ بدر کر دیا گیا"[48]

فراز نے کراچی کے ایک مشاعرہ میں یہ نظم پڑھی جس میں حبیب جالب بھی موجود تھے یہ مشاعرہ انفارمیشن
ڈیپارٹمینٹ کی عمارت، سندھ سینٹر میں منعقد ہوا تھا،ڈاکٹر فاطمہ حسن کہتی ہیں۔

"یہ مشاعرہ انجمن تجارت ، ملازمت زراعت پیشہ خواتین نے منعقد کیا تھا جس کی صدر شمیم کاظم تھیں اور میں اس انجمن کی پبلیسٹی سکریٹری تھی"[49]

حبیب جالیب نے بھی اس وقت کے حکمرانوں کے خلاف مشاعرہ پڑھا تھا، اس لئے جیسے ہی مشاعرہ ختم ہوا تو مشاعرہ گاہ سے ہوٹل پہنچتے ہی سرکاری کارندوں نے دونوں کو سندھ بدری کا نوٹس دے دیا، فراز کے ساتھ حبیب جالیب کو بھی ایک پروانہ ہاتھ میں تھما دیا گیا، جس میں راتوں رات کراچی چھوڑنے کا حکم دیا گیا تھا، فراز نے اس رات سامان کی پیکنگ سرکاری اہل کاروں سے کروائی اور واپسی کا ٹکٹ بھی ان ہی سے لیا اور کراچی کو خیر باد کہہ کر روانہ ہوئے، فراز خود اس حوالے سے کہتے ہیں:

"1980 میں کراچی کے ایک مشاعرہ میں گیا، وہاں میں نے اپنی معروف نظم "محاصرہ" پڑھی مشاعرہ ختم ہوا تو میں میٹروپول واپس آیا جہاں میں ٹھہرتا تھا، یہ سستا لیکن اچھا ہوٹل تھا، وہاں پولیس بیٹھی ہوئی تھی لیکن مجھے علم نہیں تھا کہ میرے لئے آئے ہیں، میں استقبالیہ پر گیا تو وہاں لڑکی نے مجھے اشاروں کنایوں میں کچھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں سمجھ نہیں پایا اسی اثنا عقب سے آواز آئی، فراز صاحب میں ڈی ایس پی نذر حسین ہوں اور یہ سب انسپکٹر عباس ہیں۔ آپ سے ہمیں ایک کام ہے۔۔۔ انھوں نے میرے ہاتھ میں ایک پروانہ پکڑا دیا کہ آپ کو فوری طور پر سندھ بدر کیا جاتا ہے۔"[50]

ڈی ایس پی نذر حسین نے فراز کو سندھ بدری کا پروانہ تھمایا تو اس وقت ڈھائی بجے تھے، فراز کو بتایا گیا کہ وہ صبح پانچ بجے ان کو لینے آئیں گے اور ٹھیک سات بجے کی پہلی پرواز سے پشاور بھجوانا ہے، جب ڈی ایس

پی چلا گیا تو فراز نے دوستوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے رابطے کاٹ دئے گئے تھے، فراز کی نگرانی کرنے کے لئے اس رات کل چار

اہل کار بھیجے گئے تھے، جب انھوں نے استقبالیہ پر ڈیوٹی کرنے والی لڑکی سے پوچھا کہ وہ لوگ چلے گئے ہیں تو اس نے جواب دیا کہ دو آپ کے کمرے کے باہر اور دو نیچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ صبح پانچ بجے ڈی ایس پی نے انھیں جگا دیا اور تیار ہونے کے لئے صرف تیس منٹ کا وقت دیا، یہاں تک کہ ان کے اہلکاروں نے فراز کا سامان پیک کرنے میں مدد بھی کی، اس کے بعد رخصت کر دیا گیا ان کا ٹکٹ تو پشاور تک بنایا گیا تھا، لیکن وہ پشاور کے بجائے اسلام آباد پہنچ گئے۔ پشاور نہ پہنچنے پر خفیہ پولیس والے وہاں بھی پہنچ چکے تھے اور ان کے گھر نہ پہنچنے کے بارے میں ان کے بھائی سے معلوم کیا، سندھ بدری کے تین ماہ بعد فراز دوبارہ کراچی گئے اور دو تین دن قیام کر کے خود ساختہ جلاوطنی کے لئے لندن روانہ ہوئے، اس حوالے سے احمد فراز کہتے ہیں

> **"تحریری حکم نامے کے ذریعے سندھ میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا، اگر مجھے سات سال قید دیتے تو دکھ نہ ہوتا لیکن مجھے افسوس اس بات کا تھا کہ اپنے ملک کے ایک حصے سے نکالا جا رہا تھا، جرم صرف یہ تھا کہ دل کی آواز عوام کی آواز اپنی شاعری کے ذریعہ دوسروں تک پہنچائی"** [51]

فراز کا بھٹو کے ساتھ بڑا دیرینہ تعلق تھا یہ تعلق صرف وزیر اعظم پاکستان ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ دوستی اور نظریاتی حوالہ رکھتا ہے، علاوہ ازیں بھٹو نے فراز کو کچھ احسانات سے بھی نوازا تھا جن میں قید تنہائی سے رہائی اور پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کی چیر مین شپ بھی شامل ہے، بھٹو صاحب نے پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز قائم کی تھی اور فراز کو اس کا پہلا چیر مین بنایا تھا، فراز بھٹو کو بہت بڑا ہیرو مانتے تھے بھٹو فراز کے آئیڈیل اس وجہ سے بھی ٹھہرے تھے کہ فراز اور پیپلز پارٹی کے نظریات میں مماثلت تھی، فراز کی ترقی پسند ذہنیت کو اگر کسی جگہ موافقت نظر آتی تو

وہ پیپلز پارٹی کا آستانہ تھا، ترقی پسند تحریک کا نعرہ روٹی کپڑا اور مکان کا پیپلز پارٹی نے بھی اپنے منشور کا حصہ بنایا، انھیں

وجوہات کی بنا پر ، فراز نے ترقی پسند تحریک کے بعد پی پی پی میں شمولیت اختیار کر لی اور بھٹو کو اپنا ہیرو تسلیم کرنے لگے

، لیکن جب ان کو ضیاء الحق نے ایک معمولی سے واقعے کی بنیاد بنا کر جیل بھیج دیا اور پھانسی پر چھڑا دیا تو فراز کو بہت دکھ ہوا احسن عباس رضا اپنے مضمون "داستان فراز، چند فٹ نوٹس" میں کہتے ہیں

"فراز کو میں نے اپنی زندگی میں تین مرتبہ روتے دیکھا، پہلی بار اپنی والدہ کی وفات پر دوسری بار لندن میں مقیم اپنے بڑے بھائی کی رحلت پر اور تیسری بار جب بھٹو کو پھانسی کی سزا دی گئی" [52]

4 اپریل 1979ء کو پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی فراز نے اس دن کے بارے میں چند نظمیں بھی لکھیں جو ان کے مجموعے "بے آواز گلی کوچوں میں ہیں۔ فراز کے لئے بھٹو کی پھانسی کا دن ساری زندگی ایک بد نما منظر پیش کرتا رہا انھوں نے مرتے دم تک بھٹو کو یاد کیا، اگرچہ وہ آخری عمر میں پی پی پی سے بیزار ہو گئے تھے، تاہم ذوالفقار علی بھٹو کا احترام صدق دل سے کرتے تھے ، انھوں نے جلاوطنی کے زمانے میں بھی بھٹو کی شخصیت کو بہت یاد کیا، پی پی پی اور بھٹو کے ساتھ ان کے دیرینہ مراسم کا اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بھٹو کی وفات کے بعد بھی ان کے پی پی پی کے ساتھ اچھے تعلقات رہے ، جب وہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے تو بے نظیر بھٹو نے ان سے لندن میں ملاقات کی تھی، ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد ایک نعتیہ مشاعرے میں فراز

نے ان کی موت اور پھانسی دینے والوں کے حوالے سے ایک نعت پڑھی تھی جس میں اس وقت کے حالت اہل دربار کی عیاری و مکاری ، چالاکی اور ظلم و جبر کے حوالے سے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا، اس نعت پر بھی فراز کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ ان کو نوکری سے معطل کر دیا گیا۔ اس مشاعرے کی صدارت کرنل شاہد کر رہے تھے فراز نے جوں ہی نعت ختم کی تو انھوں نے فراز کے ساتھ تلخ کلامی کی اور دھمکیاں دیں، فراز خود اس حوالے سے کہتے ہیں

"انھوں نے جو کچھ بھٹو صاحب کے ساتھ کیا اس پر میں نے ایک نعتیہ مشاعرے میں ایک نعت پڑھی جو بڑی مقبول ہوئی اس کا عنوان تھا "میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے "مشاعرہ کی صدارت کرنل شاہد کر رہا تھا، وہ بہت غصے میں آگیا، اور دھمکیاں دینے لگا کہ میں یہ کروں گا، میں تمھیں دیکھ لونگا، میں نے کہا "یو آر موسٹ ویلکم" میں کبھی اتنے غصے میں نہیں آیا لیکن اس دن میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر اس نے مزید کچھ کہا تو میں اس کے منہ پر تھپڑ ماروں گا، پھر تاریخ میں یہ ریکارڈ بھی ہو جائیگا کہ ایک شاعر نے ایک جنرل کے منہ پر تھپڑ مارا تھا، پھر یہ بات جنرل ضیاء الحق تک پہونچی، مجھے معطل کر دیا گیا"[53]

معطل کرنے کے بعد فراز کا تبادلہ بلوچستان میں نیشنل سینٹر میں کر دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں فراز نے دوسری اذیتوں کے ساتھ ساتھ ایک بڑی اذیت خود ساختہ جلاوطنی کی بھی سہی۔ جنرل ضیاء الحق کی تمام پالیسیوں سے فراز کو اختلاف تھا، جب انھوں نے لمحہ لمحہ فوجی کاروایوں پر نظر رکھ کر اس پر احتجاج کرنا شروع کیا تو فوج کو بھی فراز کی یہ مداخلت پسند نہیں آئی، اس بار فوج نے بھی ان کی کڑی نگرانی شروع کی، جہاں کہیں فوج کو ان کی بات

ناگوار گزرتی کسی نہ کسی طرح برہمی کا اظہار کرتے۔ اگرچہ فراز کو فوج کے عتاب کا سامنا "پیشہ ور قاتلو " سے ہی کرنا پڑا تھا لیکن محاصرہ لکھنے کے بعد صوبہ بدری کی سزا کے ساتھ مشکلات اور زیادہ بڑھ گئیں تھیں۔ مثال کے طور پر مشاعروں میں شرکت پر پابندی، اخبارات ورسائل میں شاعری کو چھپانے پر پابندی، کسی ریڈیو، ٹی وی چینل کو انٹرویو دینے پر پابندی، میڈیا والوں یا سرکاری افسران سے ملاقات پر پابندی وغیرہ ایسے سارے حوالے تھے جن کو مدنظر رکھ کر فراز نے سوچا کہ اس قسم کی اذیتوں سے تو جلاوطنی کی اذیت بہتر ہے، اس لئے انھوں نے برطانیہ میں جاکر "مارشل لا" کے خلاف محاذ کھول دیا، اس حوالے سے وہ خود کہتے ہیں

" جہاں تک تعلق جلا وطنی کا ہے یہ اختیاری تھی ،اور اس کا
سبب یہ تھا جب انھوں نے پہلے مجھے سندھ سے نکالا تو مجھے اس
کا دکھ ہوا کہ یہ میرا ملک ہے، مجھ سے روزی چھین لی گئ کوئی
بات نہیں، مجھے میڈیا پر بین کر دیا گیا کوئی
دکھ نہیں میری چیزیں اخبار یا رسالے چھاپنے سے معذور
تھے، یہ بھی
کوئی بات نہیں میرا ذاتی مکان گورنمینٹ نے قبضے میں لے لیا،
اسے بھی در گزر کیا مگر جب "محاصرہ" نظم پڑھنے کے جرم میں
مجھے سندھ بدر کیا گیا تو مجھے بہت صدمہ ہوا کہ میں تو پہلے ہی
زخم خوردہ شہری ہوں، میرے عظیم الشان وطن کے بڑے حصے
کو الگ کر کے مجھے نسبتاً چھوٹے ملک کا شہری بنادیا گیا، اور اب
میں اس میں بھی گھوم پھر نہیں سکتا نہ ٹی وی پر مشاعرہ پڑھ سکتا
ہوں، نہ ریڈیو سے مذاکرہ میں حصہ لے سکتا ہوں، نہ کسی اخبار
میں چھپ سکتا ہوں۔ آج مجھ پر سندھ جانے پر پابندی لگی ہے۔
کل کو پنجاب یا میرے اپنے آبائی گاؤں جانے میں بھی پابندی
لگ جائے تو کیا بعید ہے"54

فراز کو حکومت نے جلاوطن نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کی تھی، انھوں نے اس غرض سے جلاوطنی اختیار کی تھی کہ جنرل ضیاء الحق کے خلاف بیرون ملک محاذ کھول کر ان کے ساتھ اپنی جنگ جاری رکھی جاسکتی ہے، فراز اپنی خود ساختہ جلاوطنی کے حوالے سے کہتے ہیں

" جہاں تک جلاوطنی کا تعلق ہے یہ ضروری نہیں کہ حکومت
ازخود کہے

تشریف لے جائے جب رزق کے دروازے بند کر دئے جائیں

اور سانس لیناد شوار کر دیاجائے تو کیاچارہ رہ جاتا ہے"[55]

اپنی جلاوطنی کے فیصلے کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں کہ "وطن بدری کا فیصلہ میں نے خود کیا" جب ان کو سندھ بدر کیا گیا تو جہاز میں بیٹھے بیٹھے ان کو جلاوطنی اختیار کرنے کا خیال آیا وہ کہتے ہیں۔

" جہاز میں بیٹھے ہوئے مجھے خیال آیا کہ آج انھوں نے مجھے سندھ بدر کیا ہے کل پنجاب اور پھر سرحد بدر بھی کر دیں گے ۔ ملازمت ہی نہیں ، بعد میں انھوں نے گھر پر بھی قبضہ کر لیا تھا، ریڈیو ٹی وی پر داخلہ ممنوع تھا تو جب ابلاغ ہی نہیں ہو گا تو کیا میں لکھ لکھ کر چولہے میں ڈالوں گا، میں نے پھر یہ فیصلہ کر لیا کہ اب ملک سے باہر چلے جانا چاہئے "[56]

صوبہ بدری کے بعد انھوں نے تین ماہ اسلام آباد میں گزارے ، تین ماہ بعد پھر کراچی چلے گئے ، وہاں ان کے دوست علی محمود اور ان کی اہلیہ نے سفر لندن کے انتظامات کئے۔ کیونکہ یہ لوگ خود بھی لندن جارہے تھے ، فراز عید کے دن کراچی ہی سے لندن کے لئے روانہ ہوئے وہاں کچھ دن علی محمود کے یہاں رہے پھر لندن میں مقیم اپنے بھائی کے گھر منتقل ہو گئے ، انھوں نے برطانیہ میں کوئی سیاسی پناہ نہیں لی وہ خود کہتے ہیں۔

"جب مجھ پر ذرائع ابلاغ اور آزادیٔ اظہار کے تمام دروازے بند ہو گئے تو میں نے اپنا ملک چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا یوں 1982 میں برطانیہ چلا گیا جہاں بلو اور علی کی فیملی نے میری میزبانی کی۔ وہاں میں نے سیاسی پناہ حاصل نہیں کی ، جس کی وجہ سے جلاوطنی کے یہ برس بڑے مشکل سے گزرے "[57]

لندن جانے کے بعد فراز نے شروع کے دن بڑے اذیت اور تنگ دستی میں گزارے ، لیکن ہمت نہیں ہاری وہ کہتے ہیں۔

"جب علی محمود سے میں اپنے بھائی کے گھر منتقل ہوا تو بڑے حالات خراب تھے، پیسے نہیں ہوتے تھے اور اکثر کھانے کے وقت میں گھر سے باہر چلا جاتا تھا کہ بھابھی یہ نہ سوچیں کہ یہ کیا ہمارے اوپر بوجھ بن کر بیٹھ گیا ہے، تو اس طرح کئی دن کئی راتیں بھوکے رہ کر گزاریں، سگریٹ تک نہیں ہوتے تھے"[58]

ان کی تنگ دستی کے دن زیادہ دن نہ رہے اور تقریباً ایک سال بعد مختلف ممالک سے مشاعروں میں شرکت کے دعوت نامے موصول ہونے لگے اور امریکہ سے نائجیریا تک ہر ملک دیکھا انھوں نے کھل کر مشاعروں میں شرکت کی اور انٹرویوز دئے اس دوران وہ دو تین دن کے لئے، مشاعرے میں شرکت کے لئے ہمارے ملک ہندوستان کے شہر انبالہ بھی آئے تھے، قرۃ العین طاہرہ اپنے مضمون "اردو شاعری میں مزاحمتی رویے" میں کہتی ہیں

"احمد فراز نے اسی ذہنی آزادی اور قلم کی سرخ روئی کے لئے وطن سے دوری اختیار کی، وطن سے اس دوری کے لئے "خود اختیار کردہ جلاوطنی" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں کہ کیا میں یہاں آزادی سے اپنی سوچ کو الفاظ کا پیراہن پہنا سکتا ہوں"[59]

سیاسی پناہ نہ لینے کی بھی کچھ وجوہات تھیں پہلی وجہ یہ کہ سیاسی پناہ لینے سے وہ حکومت کے پابند ہو جاتے اور پاکستانی گورنمینٹ اور آمریت کے خلاف منہ بند رکھتے، دوسرے یہ کہ فراز نہیں چاہتے تھے کہ وہ حکومتی سطح پر مراعات حاصل کر کے جلاوطنی کے دن عیاشی سے گزاریں، وہ خود کہتے ہیں،

" یہاں زیادہ تر لوگوں نے سیاسی پناہ لی ہوئی تھی، ان کو رہائش، گزارہ الاؤنس

یا کام کرنے کی اجازت سمیت بہت سی سہولتیں مل جاتی ہیں، میں نے اس لئے سکیم کے لئے درخواست نہیں دی کہ اس کے لئے آپ کو اپنا پاسپورٹ گروی رکھنا پڑتا ہے اور میں نے کسی قیمت پر

اپنا پاسپورٹ نہیں دینا تھا، میں چونکہ جذباتی سا انسان ہوں، اس لئے اپنا پاسپورٹ انھیں دینا خود کو پناہ گزیں کہلوانا اور گزارے کے لئے بینیفٹ لینا اچھا نہیں لگتا تھا، میرے بدترین دشمن بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے یہاں کوئی مراعات لیں"[60]

فراز نے مجبوری میں جلاوطنی اختیار تو کرلی مگر اپنے ملک پاکستان اور آبائی وطن کی یاد انھیں ہمیشہ ستاتی رہی، انھوں نے

کبھی سکون اور چین سے وقت نہیں گزارا جب تک وہ وہاں رہے انھیں ہم وطنوں اور اس کی مٹی کی خوشبو یاد دلاتی رہی، جلاوطنی کے زمانے میں دوسری مشکلات کے ساتھ ساتھ فراز کو زیادہ دکھ اس بات کا بھی ہوا کہ ان کے قریبی دوستوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا بلکہ المیہ یہ ہوا کہ ان کے دوست ان کے دشمنوں کی صفوں میں شامل ہوکر ان کے خلاف ہوگئے، اس مشکل وقت میں اجنبی لوگوں نے ان کا ساتھ دیا اس بارے میں وہ کہتے ہیں۔

"اس کڑوے وقت، میں دوستوں کی ایک تعداد نے اجنبیت اختیار کرلی اور دوسری معقول تعداد نے دشمنوں کی صفوں میں شمولیت اختیار کرکے انھیں کے تیر آزمانے شروع کر دئے، محبت، حوصلہ اور رہنمائی اجنبی دوستوں سے ملی"[61]

فراز حق گو تھے انھوں نے ہمیشہ دربار داری اور منافقت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا یقیناً ان کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا راز ان کی حق گوئی اور بے باکی کی عادت تھی کسی کی پیٹھ پیچھے کبھی کسی کی برائی انھیں گوارہ نہیں تھی۔ فراز کو سب سے زیادہ دکھ اس وقت ہوا جب احمد ندیم قاسمی بھی آمر وقت کے دام میں پھنس گئے، جب احمد ندیم قاسمی کا نام قومی ایوارڈ کے لئے منتخب ہوا تو فراز نے بارہا جنرل ضیاء الحق کے ہاتھ سے یہ ایوارڈ وصول کرنے سے احمد ندیم قاسمی کو منع کیا لیکن وہ راضی نہ ہوئے اس حوالے سے پروفیسر فتح محمد ملک اپنی کتاب "احمد فراز کی شاعری نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار" میں کہتے ہیں۔

" اس دوران فراز کسی لاڈلے ضدی بچے کے مانند احمد ندیم قاسمی سے اصرار کرتے رہے کہ وہ جنرل ضیاء الحق سے قومی ایوارڈ لینے سے انکار کردیں، احمد ندیم قاسمی جواب میں وہی پرانا استدلال کرتے رہے جو انھوں نے جنرل ایوب خان کے ہاتھ سے ایوارڈ لیتے وقت پیش کیا تھا ان کا کہنا تھا کہ یہ ایوارڈ ایک قومی اعزاز ہے اس سے انکار کرنا گویا قوم کی توہین ہے حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں مگر قوم زندہ اور پائندہ رہتی ہے "[62]

احمد فراز بھی احمد ندیم قاسمی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

" میں نے اپنے دوسرے ہمعصروں کے مانند وقت کے جابر حکمرانوں سے راہ ورسم پیدا کرنے اور انعام و اعزاز حاصل کرنے کی نسبت جلاوطنی کو بہتر جانا۔ میرا ضمیر اس وقت بھی مطمئن تھا اور آج بھی مسرور ہے "[63]

یوں تو فراز کرسئہ اقتدار پر کبھی بھی کسی فوجی ڈکٹیٹر کو دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے لیکن جب جنرل پرویز مشرف کے اقدامات سامنے آگئے تو ہر عام آدمی کی طرح احمد فراز نے بھی انھیں تازہ ہوا کا جھونکا قرار دیا اس وقت پاکستان کے حالات اس قدر ناگفتہ بہہ اور مسلم لیگ کی حکومت سے اس قدر اکتا گئے تھے کہ جنرل مشرف کی حکمرانی سب کے لئے حیاتِ نو کی حیثیت اختیار کرنے لگی، فراز نے دوسرے جنرلیوں کی طرح پرویز مشرف کے ابتدائی اقدامات کو بھی سراہا اور یہاں تک کہا کہ پاکستان کو ان جیسے فوجی حکمرانوں کی ضرورت تھی ان کے بقول، جنرل مشرف نے آتے ہی اچھا تاثر دیا اور کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی، مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا اور ان کے غیر آئینی اقدامات سامنے آنے شروع ہوئے تو فراز کی نیت میں بھی ان کے لئے تبدیلی آنے لگی فاروق اقدس لکھتے ہیں

" پھر یوں ہوا کہ جنرل پرویز مشرف کے لئے غیر آئینی اقدامات کے ساتھ ساتھ فراز صاحب کے لہجے میں ان کے لئے تلخی آنے

لگی، لب و لہجہ بدلنے لگا، شاید یہ بات چند ہی احباب کے علم میں ہو کہ انھوں نے جنرل پرویز مشرف کو ایک ذاتی خط بھی لکھا جس میں انھوں نے غیر آئینی اقدامات پر اپنی رنجشوں اور گلے شکووں کا اظہار کرتے ہوئے ان کے ساتھ اپنے تعلق کا رومانس ختم کرنے کی محبت بھری دھمکی بھی دی"

فراز نے جنرل پرویز مشرف سے لڑائی کی ٹھان لی یہاں تک کہ وہ وقت بھی بہت جلد آ پہنچا جب انھوں نے ببانگ دہل کہا، میں سمجھتا ہوں کہ جنرل مشرف صدارت کے اہل نہیں ہیں، مشرف کی ناقص پالیسیاں سامنے آتی گئیں اور فراز کا ان پر تحفظات کا اظہار ہو تا رہا، مشرف کے دور میں ان کا یہ حال رہا کہ کبھی بہت ناخوش اور کبھی بہت ناراض، جنرلیوں کے ساتھ ان کی کبھی نبھ نہیں سکی، فراز نے جنرل پرویز مشرف کے عسکری نظام کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ان کا جنرل پرویز مشرف کے ساتھ لڑائی کا یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا، ان کی پالیسیوں پر انھوں نے ہر وقت احتجاج کیا، مشرف دور میں بھی وہ سرکاری عہدے پر قائم رہے، لیکن انھوں نے اس کی مطلق پرواہ نہیں کی اور مارشل لاء کے خلاف بولتے رہے، وہ اس وقت نیشنل بک فاؤنڈیشن کے مینیجنگ ڈائریکٹر تھے لیکن اپنی سرکاری نوکری کی پرواہ کئے بغیر سچی بات کہتے رہے، فراز کی یہی سچی اور کھری باتیں مشرف کو ناگوار گزریں، جنرل پرویز مشرف کی طرف سے فراز کو پہلی سزا اور ذہنی اذیت ان کی بیگم ریحانہ سے جبری طور پر مکان خالی کروانے کی صورت میں اس وقت دی گئی جب وہ لندن میں تھے اس حوالے سے اسد مصطفیٰ اپنے مضمون "احمد فراز کچھ یادیں کچھ باتیں" میں کہتے ہیں

"فراز جب اپنے فنکشن کے لئے یو کے گئے ہوئے تھے تو ان کی بیوی سے سرکاری گھر خالی کروالیا گیا، اس دوران، ان کا سامان گھر سے باہر سڑک پر پھینک دیا گیا، یہ سب انھیں ذہنی تکلیف دینے کے لئے کیا گیا تھا" 64

اس واقعے کی مزید تفصیل کے بارے میں ندیم اُپل کہتے ہیں۔

"نومبر 2004 میں احمد فراز کی سرکاری رہائش گاہ سے ان کا سامان نکال کر سڑک پر پھینک دیا گیا اور زبردستی مکان بھی خالی کرالیا گیا۔ یہ مکان ان کی بیگم ریحانہ گل کے نام تھا جو ایڈیشنل سکریٹری کے عہدے سے ریٹائر ہو چکی تھیں، مگر نوٹس ملنے کے باوجود بھی مقررہ مدت تک مکان خالی نہیں کیا تھا"[65]

یہ بات تو سچ ہے کہ فراز کی بیگم کو ریٹائرمینٹ کے بعد سرکاری مکان خالی کر دینا چاہئے تھا، فراز اس وقت لندن میں تھے جب ان کا مکان زبردستی خالی کرالیا گیا مقررہ مدت تک مکان خالی نہ کرنے کے حوالے سے فراز کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے، ندیم اُپل کہتے ہیں۔

"جب ان سے رابطہ کیا گیا تو انھوں نے بتایا تھا کہ وہ خود سرکاری ملازم ہیں اور ایک ادارے نیشنل بک فاؤنڈیشن کے سربراہ ہیں اور ان کا حق بنتا ہے کہ اگر بیوی ریٹائر ہو گئی ہے تو مکان انھیں الاٹ کیا جائے"[66]

احمد فراز نے اس مکان کو اپنے نام الاٹ کرنے کے لئے باقاعدہ درخواست بھی دے رکھی تھی، علاوہ ازیں ہاؤسنگ کے قانون میں یہ واضح لکھا ہوا تھا کہ کسی ملازم کے رٹائرمینٹ کے بعد اگر اس کا بیٹا بیٹی یا بیوی شوہر اسی سکیل میں کام کر رہا ہو تو مکان کو قانونی طور پر اپنے نام الاٹ کرا سکتا ہے، اس قانون کے مطابق فراز اپنی بیوی کے رٹائرمینٹ کے بعد متعلقہ مکان اپنے نام الاٹ کرانے کے مجاز تھے اس لئے انھوں نے مدت مقررہ کے اختتام پر اس کو خالی نہیں کیا، اس کے علاوہ اس وقت کے وزیر اعظم شوکت عزیز نے بھی ان سے مکان خالی نہ کرانے کی یقین دہانی کرائی تھی۔ ندیم اُپل کہتے ہیں

"انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ان کو وزیر اعظم شوکت عزیز نے رات کو گیارہ بجے فون کیا تھا اور کہا تھا کہ مجھے پتا چلا ہے کہ کچھ لوگ آپ سے زبردستی مکان خالی کرانا چاہتے ہیں لیکن میں نے انھیں روک دیا ہے، بقول احمد فراز جب وزیر اعظم نے انھیں

تسلی دی تو وہ برطانیہ آ گئے مگر جب وزیر اعظم ملک سے باہر
دورے پر گئے تو وزیر کے حکم پر اچانک ان کا سامان گھر سے نکال
کر سڑک پر پھینک دیا گیا اور زبردستی اہل خانہ کو گھر سے بے
دخل کر کے قبضہ کر لیا گیا"[67]

در اصل وزیر برائے ہاؤسنگ سید صفوان اللہ اس مکان کو اپنے کسی بندے کو الاٹ کرنا چاہتے تھے اس لئے جلد از جلد

خالی کرنے کے درپے ہو گئے۔ گھر سے بے دخل ہونے کے بعد فراز کے اہل خانہ نے گیسٹ ہاؤس میں رات گزاری جب کہ گھر کا سامان نیشنل بک فاؤنڈیشن کے دفتر پہنچایا گیا تھا۔ ادھر جب وفاقی وزیر ہاؤسنگ سید صفوان اللہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ احمد فراز جس ادارے کے سربراہ ہیں وہ قواعد کے مطابق سرکاری رہائش گاہیں حاصل کرنے کے دائرہ کار میں نہیں آتے۔ لیکن فراز مصلحت کے خاطر خاموشی اختیار کرنے والے نہیں تھے انھوں نے آمر وقت کی ہر ناقص و ناجائز پالیسی کی مزمت کی اور جب بنیادی انسانی حقوق کی پامالی روز کا معمول بن گیا تو فراز نے اس کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی اور ایک ٹی وی انٹرویو میں ڈکٹیٹر کی ناقص پالیسیوں کے خلاف بیان جاری کیا، بقول کشور ناہید،

" پھر ایک دن جنرل مشرف آپ سے ناراض ہو گئے کیوں کہ
آپ نے پاکستان کی مسلح افواج کے خلاف بیان دیا تھا"[68]

مسلح افواج کے خلاف بیان دینے کے نیتجے میں انھیں سرکاری نوکری سے بے دخل کر دیا گیا، فراز کو جب ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تو وہ اس وقت نیشنل بک فاؤنڈیشن کے سربراہ تھے، ہارون الرشید کہتے ہیں

" فراز غالبا 2006ء تک نیشنل فاؤنڈیشن کے سربراہ رہے
اور ایک ٹی وی انٹرویو کی پاداش میں انھیں اس ملازمت سے فارغ
کر دیا گیا"[69]

انھیں آمر وقت کی اس بزدلانہ حرکت سے رنج تو ضرور ہوا، لیکن حرفِ حق کہنے سے باز پھر بھی نہیں آئے اور رد عمل کے طور پر ہمت کا مظاہر کر کے حکومت وقت کو 2004 میں ان کا دیا ہوا اعزاز احتجاجا واپس کر دیا، احمد فراز نے اس شقاوت آمیز نا انصافی اور صریح ظلم کے خلاف بطور احتجاج ہلال امتیاز حکومت کو واپس کر دیا، انھوں نے ہلال امتیاز واپس کر کے یہ بھی ثابت کر دیا کہ مد مقابل کوئی کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو ضمیر کی آواز بلند کرنے سے روکا نہیں جا سکتا انور زاہدی اپنے مضمون "، کر گئے کوچ کہاں " میں لکھتے ہیں۔

" شاید پاکستان کے وہ منفرد شاعر ٹھہرے جنھوں نے ایک
حکومتی عطا کردہ
انعام کو بعض سیاسی اختلافات کی بنیاد پر واپس کر دیا"[70]

فراز کو حکومت وقت نے 2004 میں ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں ہلال امتیاز سے نوازا تھا، لیکن انھوں نے جنرل پرویز مشرف کا دیا ہوا ہلال امتیاز احتجاج کے طور پر واپس کر دیا، فضہ پروین کہتی ہیں۔

"جنرل پرویز مشرف کے عہد میں انھیں ہلال امتیاز ملا، احمد فراز نے
جب یہ محسوس کیا کہ جنرل مشرف کی آمریت نے عوام کی زندگی
اجیرن کر دی ہے، تمام ادارے مکمل طور پر منہدم کئے جا رہے ہیں
انصاف اور حق و صداقت کو بارہ پتھر کیا جا رہا ہے امیدوں کی فصل
غارت اور تمام مظلوموں کی محنت اکارت جا رہی ہے، غیر جمہوری
حکومت نے راتیں بے ثمر، کلیاں شرر، زندگیاں پر خطر اور آہیں
بے اثر کر دی ہیں، ان حالات کے پیش نظر احمد فراز نے ہلال امتیاز
بطور احتجاج واپس کر دیا"[71]

فراز نے خود بھی انعام کی واپسی کے حوالے سے اکثر و بیشتر اظہارِ خیال کیا ہے، صدارتی ایوارڈ کی واپسی کے بارے میں فراز کے بیان کے حوالے سے کشمیری لال ذاکر اپنے مضمون "ایک لیجنڈ کی موت" میں کہتے ہیں۔

"ایک بیان میں انھوں (فراز) نے کہا؛ ہمارے آس پاس جو کچھ ہو رہا ہے اگر اس پر میں خاموش تماشائی بنا رہوں تو میں اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کروں گا میں کم سے کم یہی کر سکتا ہوں کہ ڈکٹیٹر شپ کو یہ باور کرا سکوں کہ ان کا شہریوں کی نظروں میں کیا مقام ہے جن کے حقوق غصب کر لئے گئے ہیں اور اس کے اظہار میں ہلال امتیاز واپس کر کے اور حکومت کے ساتھ کسی بھی کام میں شرکت سے انکار کر کے کر رہا ہوں" 72

فراز، صوبۂ خیبر پختونخواہ اور بلوچستان میں فوجی کاروائی کے بھی سخت خلاف تھے اور اس کا ذکر وہ اکثر کیا کرتے تھے۔ دوسری غلط پالیسیوں کے ساتھ ساتھ حکومتی انعام واپس کرنے کی یہ بھی ایک وجہ تھی، اس حوالے سے کاظم جعفری اپنے مضمون "، آہ فراز" میں کہتے ہیں۔

"فراز نے اپنا صدارتی اعزاز بلوچستان میں فوج کشی سمیت جنرل مشرف کی پالیسیوں پر احتجاج کرتے ہوئے واپس کر دیا تھا" 73

فراز نے جب فوجی حکومت کا دیا ہوا ایوارڈ واپس کیا تو سول حکومت نے ان کو جن اعزازات و انعامات سے نوازا تھا وہ بھی سزا کے طور پر ان سے واپس لے لئے، اس حوالے سے فراز خود کہتے ہیں۔

"ستارہ امتیاز اور ہلال امتیاز جیسے ایوارڈ کا حصول بڑا اعزاز ہوتا ہے مگر میں اسے اعزاز نہیں سمجھتا، بات یہ ہے کہ مجھے بلوچستان، وزیرستان اور دوسری جگہوں پر حکومت کی جاری پالیسیوں سے اتفاق نہیں تھا بطور احتجاج جب میں نے فوجی حکومت کے دیئے گئے ایوارڈ واپس کئے تو سول حکومت نے جو ایوارڈ دیئے تھے وہ بھی مجھ سے واپس لے لئے" 74

غرض فراز ہر محاذ پر جنرل پرویز مشرف سے لڑے اور کبھی ہار تسلیم نہیں کی وہ آمر کے ساتھ جنگ کو جہاد سمجھتے تھے انھوں نے اپنے سرکاری عہدے کی بھی مطلق پرواہ نہ کی، جہاں کہیں بھی جنرل پرویز مشرف کی پالیسیوں میں کجی دیکھی ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، رحیم گل کہتے ہیں۔

"فراز کی تندی اور خودی کچھ قبائلی روایات کی بھی مرہونِ منت ہے وہاں کا آدمی کتنا بھی تعلیم یافتہ اور مہذب ہو جائے انا کی شکست کبھی قبول نہیں کرتا، ٹوٹ پھوٹ جائیگا، مر جائیگا سر نہیں جھکائیگا" [75]

جنرل پرویز مشرف کے خلاف فراز کی بڑی لڑائی اعلیٰ عدلیہ کے منصفِ اعلیٰ کی برطرفی کے خلاف تھی، جنرل پرویز مشرف کا دوسرے غیر آئینی اقدامات کے ساتھ ساتھ سب سے بڑا غیر آئینی اقدام اعلیٰ عدلیہ کو غیر آئینی طریقے سے برطرف کرنا ان کی سب سے بڑی غلطی تھی انھوں نے 9 مارچ 2007 کو چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کو بلا کر اُن سے استعفیٰ مانگا لیکن انھوں نے مستعفی ہونے سے انکار کر یا، جنرل کو یہ انکار پسند نہیں آیا، صلاح الدین خان اپنے مضمون " افتخار چوہدری ۔۔۔۔ الوداع " میں لکھتے ہیں۔

" جس پر پرویز مشرف نے سپریم جوڈیشل کونسل میں افتخار چوہدری کے خلاف ریفرنس دائر کرتے ہوئے ان پر کرپشن، حکم عدولی، عدم تعاون اختیارات کا ناجائز استعمال ایسے الزامات لگا کر ریفرنس دائر کر دیا" [76]

چیف جسٹس نے سپریم جوڈیشل پر عدم اعتماد کا اظہار کیا اور نہ صرف اس کے سامنے پیش ہونے سے انکار کیا بلکہ، سپریم کورٹ میں بھی اس کے خلاف درخواست دائر کر دی جس کا فیصلہ ان کے حق میں ہوا اور وہ اپنے عہدے پر بحال ہو گئے، اس کے بعد جنرل مشرف باوردی صدر منتخب ہونا چاہتے تھے لیکن عدلیہ کو اپنے راستے میں رکاوٹ سمجھ کر ایک بار پھر 3 نومبر 2007 کو ملک میں ایمرجنسی نافذ کر کے چیف جسٹس سمیت 60 ججوں کو گھروں میں نذر بند کر دیا۔ اس غیر آئینی برطرفی کے خلاف نہ صرف چیف

جسٹس خود ڈٹ گئے بلکہ ان کا ساتھ دینے کے لئے پوری قوم اٹھ کھڑی ہوئی۔ وکلاء نے جنرل کے خلاف منصف اعلیٰ کی اس جنگ میں مثالی کردار ادا کیا اور ان کا بھرپور ساتھ دیا، وکلا کے علاوہ ہر خاص و عام نے عدلیہ کی آزادی کی تحریک میں شرکت کی، فراز نے بھی ببانگ دہل اس تحریک میں شرکت کا اعلان کیا، وہ ڈکٹیٹر کے خلاف چیف جسٹس کی لڑائی کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں " چیف جسٹس نے اداروں کے خلاف فیصلے دیئے تھے میں تو انھیں سلیوٹ کرتا ہوں، انھوں نے دھمکیوں کے باوجود استعفیٰ نہیں دیا، انھوں نے ہر محاذ پر عدلیہ کی آزادی اور چیف جسٹس کی رہائی کے لئے آواز اٹھائی۔ حمید اختر اپنے مضمون "زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے " میں کہتے ہیں

" وہ (فراز) نہ صرف اپنے فن کے ذریعے ظلم و جبر اور استحصالی قوتوں کو للکارتا رہا بلکہ عملاً بھی مزاحمتی تحریکوں میں شامل رہا اس کی آخری ایسی کوشش ججوں کی بحالی اور جنرل مشرف سے نجات حاصل کرنے کے لئے نکلنے والے جلوس میں شمولیت تھی

"[77]

ججوں کی بحالی اور عدلیہ کی آزادی کے لئے فراز کی عملی جدوجہد کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں انھوں نے عدلیہ کی آزادی کے لئے لڑی جانے والی جنگ میں وکلا اور عوام کا بھرپور ساتھ دیا اور جنرل پرویز مشرف کی اس غیر آئینی اقدام کی مخالفت میں عملی طور پر رد عمل کا ااظہار کیا۔ اس حوالے سے نجیب الرحمن ارشد کہتے ہیں۔

" عملی طور پر عدلیہ پر شب خون مارنے کے خلاف جو تحریک اٹھی اس میں احمد فراز پیش پیش رہے اور ان کے آنے سے پاکستان کے اہل قلم اور سول سوسائٹی نے اس تحریک میں نمایا ں کردار ادا کیا، اس سلسلے میں انھوں نے ادیبوں، شاعروں کی ایک بڑی کانفرنس کا انعقاد بھی کیا اور اس کے ساتھ ساتھ

انھوں نے پورے دلیری اور پوری سچائی کے ساتھ انسانی ذہنوں

میں جنم لینے والے گونگے جذبات کو زبان عطا کی"[78]

احمد فراز کی شخصیت مختلف حوالوں سے کچھ ناقدین کے نزدیک متنازعہ بھی رہی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت پر کچھ اعتراضات بھی کئے گئے جن کا تعلق ان کے مختلف نظریات سے جوڑا گیا ان اعتراضات کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی کہ اپنے عہد میں نہ صرف ملکی، بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اردو دان حلقوں میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کر چکے تھے، جس کی وجہ سے کچھ لوگوں کو ان کی شہرت برداشت نہیں ہوئی اور ان کی شہرت کو گرد آلود کرنے کی کوشش کی گئی دوسری بات یہ کہ ان کی ذات پر جو سب سے زیادہ اعتراضات کئے گئے وہ زیادہ تر مذہبی حلقوں

کی طرف سے کئے گئے، مذہب کے حوالے سے فراز کی سوچ الگ نوعیت کی تھی جو کہ ان کے مطابق کم علم اور تنگ

نظر مولویوں سے منفرد تھی، اس لئے وہ فراز کو ملحد اور لادین ٹھہراتے رہے، علاوہ ازیں ان کی ترقی پسندی کے تحت انکو کمیونسٹ اور اشتراکی کہا گیا، ان کو پاکستان کے کچھ لوگوں نے ہمارے ملک ہندوستان کا ایجنٹ بھی کہا کچھ لوگوں نے یہ تک کہا کہ وہ مراعات کے حصول کے خواہاں تھے۔ احمد فراز پر ملحد ہونے کا الزام لگایا گیا اس حوالے سے تھوڑی سی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ فراز پر بہت سارے لوگوں نے ملحد اور اسلام دشمن ہونے کے الزامات لگائے تھے، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ فراز کو چونکہ چکنی چپڑی اور چاپلوسی کی باتیں بالکل پسند نہیں تھیں اس لئے وہ ان مصلحت پسند مولویوں کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بناتے تھے جو اپنے مقصد کی خاطر اسلام کو بھی بیچ دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ کوئی بھی مولوی اس بات کو پسند نہیں کریگا، ان وجوہات کی بنا پر مولویوں کی جانب سے فراز پر کافر اور ملحد ہونے کے فتوے داغے گئے اس حوالے سے نعیم بخاری اپنے مضمون "جب کال پڑا آوازوں کا" میں کہتے ہیں ۔

"ایک خاص طبقہ جو ان کے بہت خلاف تھا اور جن کے خلاف

خود فراز تھے اور یہ طبقہ مولوی صاحبان تھے فراز اکثر علامہ

اقبال کا وہ مصرعہ

سنا کے ہمیں خوش کیا کرتے تھے۔۔۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ
دین کے جو رکھ والے ہیں وہ انھیں دین کے ٹھیکیدار کہتے تھے،
تم نے کبھی غور کیا نعیم کہ ان کی توندیں یعنی ان کے پیٹ بڑھے
ہوئے ہیں اور ان کے دماغ دولے شاہ کے چوہوں کی طرح
چھوٹے ہوتے ہیں" 79

فراز ملحد کبھی بھی نہیں تھے، وہ ایمان دار اور پکا عقیدہ رکھنے والے مسلمان تھے ان کو خدا اور رسول سے محبت تھی تاہم ان کے مذہب اور مولویوں کے مذہب میں فرق ہے، وہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے اور ملا کے خدا میں بہت فرق ہے، وہ مذہب کو وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مولویوں نے دین کو محدود کر دیا ہے۔ ان کے چند بیانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ سچے اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور خدا پر ان کا مکمل بھروسہ اور یقین تھا۔

"میں چونکہ ترقی پسند ہوں اور مولوی حضرات کو ایک آنکھ نہیں
جچتا ہوں، چنانچہ جو جی چاہتا ہے کہہ گزرتے ہیں، ورنہ میں تو
مسلمان ہوں" 80

"ہم جانتے بوجھتے ہوئے بھی گناہ کرتے ہیں اور پھر خدا سے
معافی مانگتے ہیں" 81

"شاعری میں خدا نے مجھے بہت عزت دی ہے" 82

"رزق کا وعدہ تو خدا نے کیا ہوا ہے، وہ تو پتھر میں بھی کیڑے
کو مایوس نہیں کرتا" 83

"سچ بولنا دنیا اور آخرت دونوں میں فلاح کا باعث ہے" 84

"حج صاحبِ استطاعت پر فرض ہے۔ قرض لیکر حج نہیں ہوتا" 85

"میرے پاس تین جوان آئے۔۔۔۔ان تینوں میں سے ایک کہنے لگا میں آپ کو کتاب کا تحفہ دینا چاہتا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں آپ کو کونسی کتاب دوں۔ آخر میں قرآنِ پاک کا یہ تحفہ لے آیا ہوں۔ ظاہر ہے میرے لئے اس سے بڑھ کر تحفہ نہیں ہو سکتا" میں نے کوئی محنت کوئی جدوجہد بھی نہیں کی یہ سب اسی (اللہ تعالیٰ) کی بخشش، اس کی عطا ہے"[86]

"کیا مجھے اپنی شناخت، مسلمان ہونے کا سرٹیفیکٹ اسلام آباد سے لینا چاہئے، میرا ضمیر مطمئن ہے"[87]

فراز کے ان تمام بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ملحد نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل تھے کیوں کہ جب ایک انسان خود اپنی زبان سے مسلمان ہونے کا اقرار کرتا ہے ، اپنی ترقی کو اللہ تعالیٰ کا احسان اور اپنی عزت، شہرت اور دولت کو اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھتا ہے آخرت کے عقیدے پر کامل ایمان رکھتا ہو حج کے اصول و قواعد جانتا ہو اور سب سے بڑھ کر قرآن کو اپنے لئے سب سے بڑا تحفہ سمجھتا ہو وہ ملحد کیسے ہو سکتا ہے ؟

ان کے نزدیک اگر انھوں نے اپنی شاعری میں اللہ تعالیٰ سے گلے شکوے کئے ہیں یا ان کے کچھ اشعار میں ایسے عناصر موجود ہیں جو شکوے کے ذیل میں آتے ہوں تو یہ اسلام دشمنی، بے دینی یا ملحد ہونے کی دلیل نہیں کیوں کہ علامہ اقبال اور فیض نے بھی اپنی شاعری میں ایسی باتیں بیان کی ہیں پھر صرف وہ کیوں معتوب رہے وہ خود کہتے ہیں

"اسلام دشمنی کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر علامہ اقبال اپنی نظم "شکوہ" میں خدا سے گلہ کر کے اسلام دشمن نہیں تھے تو میں ویسے ہی مضامین کی وجہ سے اسلام دشمن کیسے ہوں ؟[88]

فراز اس حوالے سے مزید کہتے ہیں

"اصل میں بات یہ ہے کہ میں معمولی آدمی ہوں، اس لئے میرے خلاف محاذ بنالیا جاتا ہے، جبکہ اقبال اور فیض نے کہا لیکن چونکہ وہ بڑے لوگ تھے صاحبِ حیثیت تھے، انکی عالمی سطح پر شناخت تھی، اس لئے وہ ہمیشہ محفوظ رہے" 89

پروفیسر فتح محمد ملک بھی اس حوالے سے کہتے ہیں

"جھوٹی مذہبیت کے علمبرداروں نے کل اقبال پر کفر کے فتوے لگائے تھے اور آج احمد فراز، انھیں تہمتوں کی زد میں ہیں۔ حق یہ ہے کہ احمد فراز کا دین مذہب اقبال ہی کا دین و مذہب ہے، وہ عمر بھر اقبال ہی کے دینی سیاسی اور ادبی مسلک سے وابستہ رہے" 90

فتح محمد ملک کہتے ہیں

"فراز ہر انداز کی منافقت سے شدید نفرت کے خوگر تھے۔ زندگی کے آخری چند برس کے دوران بھی جب کبھی انھیں منافقت کا سامنا ہوتا تھا تو وہ روٹھا ہوا ضدی بچہ بن جاتے تھے 91**"**

دراصل احمد فراز نے ایک شعر کہا تھا جو ان کے لئے وبال جان بن گیا اور ان پر کفر و شرک کے فتوے داغے گئے وہ شعر یہ تھا

اب رسولوں کی کتابیں طاق میں دھر دو فراز
نفرتوں کے یہ صحیفے عمر بھر دیکھے گا کون

جب فراز نے یہ شعر کہا تو پورے ملک پاکستان میں ہنگامہ ہو گیا اور مسلم قائدین نے فراز پر لعن طعن شروع کر دی، حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے شعر پر لعن طعن کرنا بھی چاہیے۔۔۔ مگر فراز کے

مداحوں نے اس شعر کی تاویل کرنے کی کوشش کی اور بہت سارے جواز پیش کئے مثلاً مذکورہ شعر میں "رسولوں" کتابت کی غلطی ہے اصل شعر اس طرح ہے

"اب اصولوں کی کتابیں طاق میں دھر دو فراز
نفرتوں کے یہ صحیفے عمر بھر دیکھے گا کون

ڈاکٹر اختر ناز اپنے کالم "احساس" مطبوعہ روزنامہ پاکستان 13 اگست 2008 کے ذیلی عنوان "سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے" کے تحت لکھتے ہیں

"جب وہ اپنے اس شعر کی وجہ سے مذہبی حلقوں میں متنازعہ بنے

اب رسولوں کی کتابیں طاق میں دھر دو فراز
نفرتوں کے یہ صحیفے عمر بھر دیکھے گا کون

توانھوں نے خود لفظ "رسولوں" کو کتابت کی غلطی قرار دے کر "اصولوں میں تبدیل کر دیا، تب یہ اعتراض ختم ہوا"[92]

لیکن اصل حقیقت کیا ہے اس کے حوالے سے ناصر زیدی اپنے مضمون "فراز جیسا کوئی نکتہ داں نہیں ملتا" میں یوں رقم طراز ہیں

"ریکارڈ کی درستگی کے لئے اصل حقیقت لکھ رہا ہوں کہ جب اس شعر کے حوالے سے پروفیسر کرم حیدری نے وزیر اطلاعات و نشریات سے چغلی کھائی اور شعر اخباروں رسالوں میں مطعون ہوا تو پروفیسر مقصود جعفری اور اس خاکسار نے از خود فراز صاحب کے حق میں مہم چلائی کہ پروفیسر کرم حیدری چونکہ ثقل سماعت کے شکار ہیں، اس لئے انھوں نے غلط سنا "اصولوں" کو "رسولوں" سمجھے فراز صاحب ان دنوں لندن جا چکے تھے، ان کے خلاف مرتد و کافر اور واجب القتل ہونے کے فتوے

دیواروں پر چسپاں کئے جارہے تھے، تاہم جب وہ واپس آئے تو
میں نے ان سے کہا کہ شعر میں لفظ "رسولوں" کو بدلیں اور "
اصولوں" کردیں مگر وہ برہم ہوگئے، "کہ میں منافق نہیں ہوں
کہ جاں بخشی کے لئے جھوٹا بہانہ تراشوں، میں نے تو "رسولوں"
ہی کہا ہے،
اس پر میں نے کہا "مرو پھر" اس لئے یہ کہنا کہ انھوں نے "
رسولوں" کو کتابت کی غلطی قرار دیکر "اصولوں میں تبدیل کر
دیا، احمد فراز کے مزاج
سے نا آشنا ہونے کا بین ثبوت ہے" 93

اس شعر کے پس منظر میں یوسف رضا چشتی ایک اور واقعہ نقل کرتے ہیں کہ کسی غصب گزیدہ مکان سے قرآن کریم کا نسخہ ملا تو ایک ملا نے صرف اس جواز پر قرآن کریم کے اس نسخے کو آگ میں پھینکنے کا حکم دیا کہ وہ اس کے الفاظ میں ایک کافر کا قرآن تھا۔ فراز اس واقعے سے متاثر ہو کر مذکورہ بالا شعر کہتے ہیں ہوئے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر اہل علم رسولوں کی کتابیں پڑھنے کے باوجود قرآن پاک کی بے حرمتی اور قرآن پڑھ کر صرف نفرت کا سبق ہی سیکھتے ہیں تو ان کے مطابق یہ کتابیں طاق میں دھرنا ہی بہتر ہے، کیوں کہ اس اندھے طبقے کو ان محبت کے صحیفوں میں محبت کا سبق نظر نہیں آتا تو پڑھنے سے انکا نا پڑھنا بہتر ہے یوسف رضا چشتی اپنے مضمون "شرر برقی" میں کہتے ہیں

"فراز نے جب قرآن کی بے حرمتی کے پیچھے کار فرما نفرت اس ملا
کے منہ سے ابلتے دیکھی تو جن کتابوں کے پڑھنے کے بعد اس کے
علم نے اسے ایسی نفرتیں سکھائیں اور نفرتیں بھی ایسی لرزہ خیز توا
سنے یہی کہا۔ نا کہ "نفرتوں کے یہی صحیفے عمر بھر دیکھے گا کون۔۔ اور
کفر کے کتے نے اسے کاٹنے کی کوشش کی" 94

در اصل فراز یہاں رسولوں کی کتابوں کا نعوذ باللہ انکار نہیں کر رہے ہیں اور نہ ان مقدس کتابوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ مختلف مذاہب کے نام پر ہی لوگوں میں نفرتیں پھیل رہی ہیں، اس لئے اس قسم کی بے جا بحثوں اور مذہب کے نام پر جنگ و جدل سے اجتناب میں ہی عافیت ہے۔ نفرتوں کے صحیفے طاق میں دھرنے سے مراد نفرت بھرے مذہبی مباحثے طاقِ نسیاں کی نذر کرتے ہیں نہ کہ مقدس صحیفوں سے نفرت ہے۔ در اصل وہ غیر ضروری مذہبی مباحثوں کو نفرتوں کا منبع قرار دیتے ہی، جیسا کہ وہ جاناں جاناں میں کہتے ہیں

عیسیٰ نہ بن کہ اس کا مقدر صلیب ہے
انجیل آگہی کے ورق عمر بھر نہ کھول

یعنی انجیل آگہی کھولنے سے نفرتوں کی دیواریں کھڑی ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور آگہی اور شعور رکھنے والوں کو تختئہ دار

پر لٹاکایا جاتا ہے، فراز کے مطابق مختلف مذاہب سے تعلق والے لوگ جب ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں تو نتیجتاً لڑائی جھگڑے کی صورت پیدا ہوتی ہے، اور معاشرے میں فساد پھیلنے لگتا ہے، اس لئے اُن کا مشورہ بھی وہی ہے جو اکبر الہ آبادی کی ہے

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

فراز کے یہاں مقدس صحیفوں کی عظمت کا اعتراف مختلف جگہوں پر موجود ہیں ان کے مذکورہ شعر سے انکار کا پہلو نہیں نکالا جا سکتا، فراز خود کو حق بجانب سمجھتے ہیں، لیکن عام آدمی ان کے مدعا کو سمجھنے سے قاصر ہے، اس لئے جب بعد میں انھیں احساس ہوا کہ یہ عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے، تو انھوں نے اپنی غزل سے مذکورہ شعر نکال دیا،، اس کے بعد فراز مذہب کی اصل روح کی طرف رجوع کرتے ہیں اور آخر تک مذہب کا مثبت پہلو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اپنے آخری زمانے تک لوگوں کے درمیان محبوب بنے رہے ساری دنیا میں وہ مشاعروں کے لئے جاتے رہے، احمد فراز کے سانحہ کا واقعہ شہر شکاگو میں پیش آیا، احمد فراز بکثرت شراب نوشی کرتے تھے فراز

ایک مشاعرہ میں شرکت کے لئے شکاگو گئے ہوئے تھے ، سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہیں گر گئے بے ہوشی کے عالم میں ہی فراز کے بیٹے شبلی فراز ان کو امریکہ سے راولپنڈی واپس لیکر آئے فراز کو الشفا اسپتال میں شریک کرایا لیکن کوئی دواکارگر نہ ہوئی اور بالآخر 25 اگست 2008 کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے۔

جب کوہاٹ کی معروف جناح میونسپل لائبریری کو، جو مرحوم ایوب صابرؔ کی حسین یادگار تھی، ڈھاکر یہاں ایک تجارتی پلازہ بنانے کا منصوبہ بنایا گیا تو فرازؔ صاحب نے اپنا شدید احتجاج ریکارڈ کروایا۔ اُن کے احتجاج کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا اور بالآخر یہ عظیم ثقافتی اور تاریخی عمارت شہید کر دی گئی۔ اس پر فرازؔ مرحوم نے اپنے کرب کا اظہار کرتے ہوئے وصیت کر دی کہ بعد از مرگ ان کی لاش کو کوہاٹ لا کر دفنایا نہ جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور جب وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے تو اسلام آباد ایچ ایٹ قبرستان، میں ان کو مدفون کیا گیا یہ قبرستان اسلام آباد کے بڑے قبرستانوں میں سے ایک ہے۔ اس قبرستان میں اپنے دور کے معروف شاعر، ادیب احمد فراز، خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر، شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی، مولانا کوثر نیازی، ممتاز مفتی، بیگم ممتاز مفتی، قدر اللہ شہاب، وغیرہ کی مزارات بھی موجود ہیں۔

حوالہ جات

1. کنیز فاطمہ "چھ ستمبر اور اس کے بعد، مشمولہ ماہنامہ نصرت۔ پبلشر لاہور۔ اگست 1966 شمارہ نمبر 11۔ ص:36
2. : فرمان فتح پوری، اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ، وکٹر بک بنک، لاہور 1990: ص:22
3. پروفیسر فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار۔ دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد 2012۔ ص:90)
4. (اداریہ، یک نہ شد دو شد، ہفت روزہ لیل و نہار 31 مارچ۔ 1957 جلد 7 شمارہ 12 ص:1)
5. :"(کنیز فاطمہ، چھ ستمبر اور اس کے بعد، ص:24)
6. :(ڈاکٹر ساجد امجد، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات۔ غضنفر اکیڈمی پاکستان کراچی 1989، ص:319)
7. :(شیخ محمد رفیق، تاریخ پاکستان، 1947-1988)ص:280
8. (فرمان فتح پوری، اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ وکٹر بک بنک، لاہور 1990۔ ص:28)
9. (طاہر محمد خان، احمد فراز کا سماجی شعور اور مزاحمتی شاعری، مشمولہ اخبار اردو جلد 25 شمارہ 9 ستمبر 2008 ص:5
10. (عابد حسن منٹو، فراز، مشمولہ ادبیات، فراز نمبر ص:172)
11. (ڈاکٹر رشید امجد، شاعری کی سیاسی و فکری روایت، ص:35)
12. (قیوم نظامی: جرنیل اور سیاست دان تاریخ کی عدالت میں۔ جہانگیر بکس، کراچی 2006 ص:177)
13. (ایضاً، ص:201)
14. (منیر احمد، پرویز مشرف فوجی آمریت سے جمہوری آمریت تک ص:120)
15. (مرتضیٰ انجم، کون کیسے گیا۔ دار الشعور لاہور 2013۔ ص:418)
16. (:اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔ از سلیم اختر: ص 493)
17. (ابرار احمد مزاحمتی پاکستانی ادب، مشمولہ: ذہن جدید دہلی ستمبر 2002 تا فروری 2003، ص 82)
18. (اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ڈاکٹر سلیم اختر، ص:456)
19. (حاشیہ: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ص 503)
20. (اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔ سلیم اختر، ص:576)۔
21. (احمد فراز، گلزار جاوید کا احمد فراز سے انٹرویو، بعنوان براہِ راست، مشمولہ ماہنامہ چہار سو (فراز نمبر) ص:9)
22. (احمد فراز، گلزار جاوید کا احمد فراز سے انٹرویو، بعنوان براہِ راست، مشمولہ ماہنامہ چہار سو (فراز نمبر) ص:9)
23. (احمد فراز، گلزار جاوید کا احمد فراز سے انٹرویو، بعنوان براہِ راست، مشمولہ ماہنامہ چہار سو (فراز نمبر) ص:9)
24. توصیف تبسم، بند گلی میں شام۔ عکاس پبلی کیشنز، اسلام آباد 2010: ص:81)

25. دعائے یافراواں۔۔۔۔۔(زہرہ نگاہ۔۔ مشمولہ ادبیات (فراز نمبر۔ ص:79

26. رضا ہمدانی، جھلکیاں۔ ادبیات (فراز نمبر)ص:24)

27. (فارغ بخاری۔ البم۔ یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور۔ ص:100)

28. (رضا ہمدانی ، جھلکیاں ۔ ادبیات (فراز نمبر)ص :26)

29. احمد فراسے انٹرویو، ریڈیو پاکستان راولپنڈی مشمولہ ماہ نو فراز نمبر ص:282

30. محبوب ظفر۔ احمد فراز شخصیت اور فن۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد2006ص:11

31. (احمد فراز سے خصوصی گفتگو، شریکِ گفتگو فیضان عارف، کتاب بیاد احمد فراز۔ ص:179)

32. (آغا ناصر، دوست پرانے چلے گئے، مشمولہ ادبیات (فراز نمبر)ص:147)

33. (سعادت سعید اور حسن رضوی کا فراز سے انٹرویو، مشمولہ، احمد فراز شخصیت اور فن، مرتبین: زیتون بانو، تاج سعید ص:335)

34. (پروفیسر فتح محمد ملک: احمد فراز کی شاعری، نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار۔ دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد2012۔ ص:93)

35. (جمیل یوسف، فراز کی شہرت اور مقبولیت کا راز، مشمولہ، ماہِ نو(احمد فراز نمبر)ص:51)

36. (شاہد ندیم کا فراز سے انٹرویو، بعنوان ، میں نے قلم نہیں توڑا، احمد فراز شخصیت اور فن مرتبین زیتون بانو ، تاج سعید ، ص310 :)

37. (اشفاق حسین، احمد فراز، یادوں کا ایک سنہرا ورق، وجدان پبلی کیشنز لاہور۔2009ص85)

38. (حماد غزنوی کا فراز سے انٹرویو، ترجمہ نصیر آذر، مشمولہ احمد فراز شخصیت اور فن، مرتبین، زیتون بانو، تاج سعید،466)

39. (احمد فراز سے خصوصی گفتگو، شریک گفتگو فیضان عارف، مشمولہ کتاب بیاد احمد فراز، ص:169)

40. (مسعود مفتی ، اب فن میرا دربار کی جاگیر نہیں ہے ، مشمولہ ادبیات) فراز نمبر) ص89)

41. مسعود مفتی ، اور پھر وہ بھی زبانی میری ، مشمولہ فنون ، لاہور شمارہ نمبر 4 جوالائی ۔ دسمبر ص(101 :

42. ایضا

43. (عابد حسان منٹو۔ فراز مشمولہ ادبیات (احمد فراز نمبر)ص:173)

44. (عابد حسان منٹو۔ فراز مشمولہ ادبیات (احمد فراز نمبر)ص:173)

45. (کشور ناہید، تنہا تنہا۔ جاناں جاناں، مشمولہ ماہ نو (احمد فراز نمبر)ص23)

46. (کشور ناہید، تنہا تنہا۔ جاناں جاناں، مشمولہ ماہ نو (احمد فراز نمبر)ص23)

47. (احمد فراز سے خصوصی گفتگو، شریک کفتگو فیضان عارف مشمولہ کتاب بیاد احمد فراز ص172)

48. (انوار فیروز احمد فراز کی زندہ شاعری، مشمولہ ماہ نو۔ (احمد فراز نمبر)ص:279)

49. (ڈاکٹر فاطمہ حسن، احمد فراز کی یاد میں، مشمولہ ادبیات، (احمد فراز نمبر ص:184)

50.(احمد فراز سے خصوصی گفتگو شریک گفتگو فیضان عارف، مشمولہ کتاب بیاد احمد فراز، ص173)

51.(سید ضمیر نفیس کا فراز سے انٹرویو، مشمولہ ہفت روزہ معیار کراچی ،ماہنامہ ادبی ایڈیشن، دسمبر 1999ء ص؛13)

52.(حسن عباس رضا،، داستان فراز، چند فٹ نوٹس، مشمولہ ادبیات (احمد فراز نمبر)ص:189)

53.(احمد فراز سے خصوصی گفتگو، شریک گفتگو، فیضان عارف، مشمولہ کتاب، بیاد احمد فراز، ص:172)

54.(گلزار جاوید کا فراز سے انٹرویو، بعنوان براہِ راست،، مشمولہ ماہنامہ، چہار سو، (فراز نمبر)ص:12)

55.(فیاض اعوان، کا فراز سے انٹرویو، مشمولہ، جریدہ (احمد فراز نمبر)ص:451)

56.(احمد فراز سے خصوصی گفتگو، شریک گفتگو فیضان عارف، مشمولہ کتاب، بیاد احمد فراز، ص:173)

57.(اختر سعیدی، احمد فراز کی کہانی خود انکی زبانی، مشمولہ کتاب، بیاد احمد فراز، ص:39)

58.(احمد فراز سے خصوصی گفتگو، شریک گفتگو، فیضان عارف، مشمولہ کتاب بیاد احمد فراز، ص:174)

59.(قرۃالعین طاہرہ، اردو شاعری میں مزاحمتی رویے، مشمول، سیپ، کراچی، جون1989 ص76)

60.(احمد فراز سے خصوصی گفتگو، شریک گفتگو فیضان عارف، مشمولہ کتاب بیاد احمد فراز، ص:174)

61.(گلزار جاوید کا فراز سے انٹرویو،، بعنوان براہ راست، مشمولہ ماہنامہ چہار سو، فراز نمبر ص:13)

62.(پروفیسر فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد2012۔ ص:78)

63.(گلزار جاوید کا فراز سے انٹرویو۔ بعنوان براہ راست، مشمولہ ماہنامہ چہار سو، احمد فراز نمبر، 13)

64.(اسد مصطفیٰ، احمد فراز کچھ یادیں کچھ باتیں، مشمولہ سہ ماہی ارتباط استنبول، احمد فراز نمبر ص:118)

65.(ندیم اُپل، یہ اور بات مری زندگی وفا نہ کرے، مشمولہ کتاب، بیاد احمد فراز، ص:306)

66.(ندیم اُپل، یہ اور بات مری زندگی وفا نہ کرے، مشمولہ کتاب، بیاد احمد فراز، ص:306)

67.(ندیم اُپل، یہ اور بات مری زندگی وفا نہ کرے، مشمولہ کتاب، بیاد احمد فراز، ص:306)

68.(کشور ناہید، تنہا تنہا۔ جاناں جاناں، مشمولہ ماہ نو (احمد فراز نمبر)ص24)

69.(ہارون رشید، احمد فراز کی وفات پر، برطانوی ادبا و شعرا کی کے تاثرات مشمولہ، ساحل، یوکے (احمد فراز نمبر)ص:19)

70.(انور زاہدی، کر گئے کوچ کہاں۔۔۔۔ مشمولہ کتاب بیاد احمد فراز۔ ص:159)

71.(فضہ پروین رانی، فصیلِ دل کے کلس پر ستارہ جُو ترا غم، مشمولہ کتاب، بیادِ احمد فراز، ص:159)

72.(کشمیری لال ذاکر۔ ایک لیجنڈ کی موت، مشمولہ سہ ماہی ارتباط، استنبول (احمد فراز نمبر)20)

73.(کاظم جعفری، آہ فراز، مشمولہ ماہ نو احمد فراز نمبر، ص189)

74.:(فراز انٹرویو، کوئی مارشل لا مجھے حق بات کہنے سے نہیں روک سکا، مشمولہ ماہ نو، ص308)

75. (رحیم گل ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور، اکتوبر 2008 جلد نمبر 44 شمارہ 10 ص۔40)

76. (صلاح الدین خان، افتخار چوہدری۔۔۔۔۔ الوداع، مشمولہ روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی / اسلام آباد 11 دسمبر 2013)

77. حمید اختر، زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے، مشمولہ ماہنامہ عکاس، (احمد فراز نمبر) ص:80)

78. (نجیب الرحمن ارشد مرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائیگا، مشمولہ کتاب، بیاد احمد فراز، ص:304)

79. (نعیم بخاری، جب کال پڑا آوازوں کا، مشمولہ کتاب، بیاد احمد فراز، ص:314)

80. (فیاض اعوان کا فراز سے انٹرویو، مشمولہ احمد فراز شخصیت اور فن، مرتبین زیتون بانو، تاج سعید ص:451)

81. (احمد فراز سے خصوصی گفتگو، شریک گفتگو فیضان عارف، مشمولہ کتاب بیاد احمد فراز، ص:177)

82. (سعادت سعید اور حسن رضوی کا فراز سے انٹرویو، مشمولہ احمد فراز شخصیت اور فن، مرتبین زیتون بانو، تاج سعید، ص:335)

83. (سعادت سعید اور حسن رضوی کا فراز سے انٹرویو، مشمولہ احمد فراز شخصیت اور فن، مرتبین زیتون بانو، تاج سعید، ص:335)

84. (فراز انٹرویو، کوئی مارشل لا مجھے حق بات کہنے سے نہیں روک سکا، مشمولہ ماہ نو (احمد فراز نمبر) ص:309)

85. (ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ کا فراز سے انٹرویو، بعنوان احمد فراز سے مکالمہ مشمولہ کتاب بیاد احمد فراز، ص:200)

86. (ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ کا فراز سے انٹرویو، بعنوان احمد فراز سے مکالمہ مشمولہ کتاب بیاد احمد فراز، ص:203)

87. (فیاض اعوان کا فراز سے انٹرویو، مشمولہ احمد فراز شخصیت اور فن، مرتبین زیتون بانو، تاج سعید ص:452)

88. :(مسعود۔ اور پھر وہ بھی زمانی میری، مشمولہ فنون لاہور شمارہ 4 جولائی دسمبر 1993 ص:102)

89. (فیاض اعوان کا فراز سے انٹرویو، مشمولہ احمد فراز شخصیت اور فن مرتبین زیتون بانو، تاج سعید ص:451)

90. (پروفیسر فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد 2012۔ ص:34)

91. (پروفیسر فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد 2012۔ ص:107)

92. (بحوالہ ناصر زیدی، فراز جیسا کوئی نکتہ داں نہیں ملتا، مشمولہ، کتاب، بیاد احمد فراز، ص:300)

93. بحوالہ ناصر زیدی، فراز جیسا کوئی نکتہ داں نہیں ملتا، مشمولہ، کتاب، بیاد احمد فراز، ص:300)

94. (یوسف رضا چشتی، شر ربرقی، مشمولہ احمد فراز شخصیت اور فن مرتبین زیتون بانو، تاج سعدی، ص؛420)

دوسرا باب

احمد فراز کی شاعری میں ترقی پسندی

بیسویں صدی، انقلابات، جنگوں اور تحریکوں کی صدی تھی، ہر تحریک کسی حد تک اپنے سے پہلے کے حالات اور مزاج کا رد عمل ہوتی ہے، بیسویں صدی کا آغاز رومانوی تحریک کے جلو میں ہوا لیکن اس صدی کی تیسری دہائی تک پہنچتے پہنچتے ایسے سیاسی، سماجی اور معاشرتی تغیرات رونما ہوئے کہ قلم کاروں کے لئے ان سے چشم پوشی کرنا، ناممکن سا ہو گیا، چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ادب کو آج کی زندگی کا سچا ترجمان بنانے کی سعی کی جائے ترقی پسند تحریک کا آغاز ہی جذبے کے تحت کیا گیا، ترقی پسند تحریک کا آغاز انگلستان سے ہوا، ہندوستان میں 1936ء میں متعارف ہوئی، لندن میں اس کے اعلان نامے کا مشورہ ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش گپتا، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور سجاد ظہیر نے مرتب کیا تھا، ہندوستان میں ادیبوں کے ایک وسیع حلقے نے اس کا اثر قبول کیا، ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس 15 اپریل 1936 کو منشی پریم چند کی زیر صدارت لکھنؤ میں منعقد ہوئی، منشی پریم چند نے افتتاحی خطبے میں کہا

"جس ادب سے ہمارا ذوقِ صحیح بیدار نہ ہو روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت اور حرکت نہ بیدار ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لئے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لئے بے کار ہے اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا، جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ، حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ پیدا کرے، سلائے نہیں، کیوں کہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہو گی"[1]

اسی کانفرنس میں مولانا حسرت موہانی نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا،

ہمارے ادب کو قومی آزادی کی تحریک کی ترجمانی کرنا چاہیئے، اسے مزدوروں اور کسانوں اور تمام انسانوں کی طرفداری اور حمایت کرنا چاہیئے، اسمیں عوام کے دکھ سکھ، ان کی بہترین خواہشوں اور تمناؤں کا اس طرح اظہار کرنا چاہیئے، جس سے ان کی انقلابی قوت میں اضافہ ہو کر اپنی انقلابی جدوجہد کو کامیاب بنا سکیں"[2]

ترقی پسند تحریک کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں۔

"ترقی پسند تحریک نے ہندوستانی ذہن کو اجتماعی جدو جہد کا شعور دیا، یہ بات اس سے پہلے ہمارے ادب میں نہیں تھی، بکھری ہوئی فکر کی جو شیرازہ بندی اقبال نے کی تھی،، ترقی پسند تحریک نے اپنے زمانے کے

مطابق اسے منضبط کیا رطب و یابس اور نعرے بازی کے شور کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے فکر کو وسعت بخشی اور ادب کو زندگی کے وسیع تر دائرے سے ہم آہنگ کیا"[3]

فراز کی ترقی پسندیت کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ فراز کے والد برق کوہاٹی پشاور کی ایک ادبی انجمن "بزم سخن" کے ایک سر گرم رکن تھے، اسی زمانے میں برق کوہاٹی کے ادبی حریف ضیاء جعفری" دائرۂ ادبیہ "چلاتے تھے، چنانچہ برق کوہاٹی "بزم سخن" اور ضیاء جعفری" دائرۂ ادبیہ "کے صدر نشین تھے، فراز کا شاعری کے ابتدائی دور میں "بزم سخن" میں اٹھنا بیٹھنا تھا، ساتھ ساتھ وہ" دائرۂ ادبیہ "میں بھی شرکت کیا کرتے تھے، مذکورہ بالا دونوں ادبی انجمنوں کے اختتام پر پشاور کی ادبی محفلیں فارغ بخاری کی قائم کردہ ان کے مکان کی بیٹھک میں منعقد ہونے لگیں، پشاور کے شعر و ادب کی ترقی و ترویج میں اس بیٹھک کا بڑا ہاتھ ہے، یہ ادبی بیٹھک علم و فن کا مرکز بنی رہی، اس بیٹھک میں احمد فراز کی سرگرمیوں کے حوالے سے فارغ بخاری کہتے ہیں

"احمد فراز کی تربیت و تہذیب اسی بیٹھک میں ہوئی یہیں پر اس نے شاعری کے اسرار و رموز سیکھے، نقد و نظر سے آگاہی حاصل کی ادبی مباحثوں میں حصہ لیا"[4]

بہر کیف فراز کی شاعرانہ زندگی کا آغاز اسی بیٹھک سے ہوا، یہاں انھوں نے چھوٹے بڑے مشاعروں میں شرکت کی اور بہت جلد شہرت کے زینے چڑھنے لگے، فراز کی شہرت میں ان کی باغ و بہار شخصیت کا بھی بڑا ہاتھ ہے، وہ اپنی خوش طبعی، بزلہ سنجی، چٹکلوں لطائف اور فقرہ بازی سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے، وہ بہت ذہین اور حاضر جواب واقع ہوئے تھے، بڑے بڑے منہ پھٹ حضرات کا قافیہ تنگ کر دیا کرتے تھے اپنے منفرد لہجے اور جاذب شخصیت کی بدولت بہت جلد مقبول ہو گئے اور دور دور تک ان کی شہرت کی آواز پہنچ گئی، فراز کی ابتدائی شاعری میں جو انقلاب اور بغاوت کا اثر دکھتا ہے اس کے حوالے سے وہ خود ایک انٹرویو میں کہتے ہیں۔

"جب شعر و شاعری کا شوق یا بیماری لگی تو پھر ہم نے
والد کی محفلوں سے علحدہ محفلوں میں جانا شروع کر دیا
اور اس طرح ان سے کبھی کبھی بحث بھی کرتے تھے،
مجھے یہ بزرگ ہمیشہ(Person non grate)
کر کے علحدہ کر دیتے تھے کیوں کہ میر طبیعت میں
تھوڑی سی بغاوت تھی اور ان سے کبھی کبھی الجھ پڑتا تھا

"[5]

اُنھیں دنوں علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک کا بھی دور دورہ تھا، اس تحریک کی شہرت پشاور کی فضاؤں میں گونج رہی تھی، بوڑھے اور خواتین ہر قسم کے لوگ اس تحریک کی جانب کھنچے چلے جارہے تھے، اس تحریک نے عام لوگوں میں زندگی کی نئی امنگ اور جینے کا ولولہ پیدا کر دیا تھا، دیگر مکتبۂ فکر کے ساتھ ساتھ قلم قبیلہ بھی اس تحریک سے وسیع پیمانے پر متاثر تھا، جن میں رضا ہمدانی، فارغ بخاری، ضیاء جعفری، مظہر گیلانی، عشرت سرحدی وغیرہ شامل تھے یہ تمام ادباء و شعرا اس تحریک کے لئے نظمیں اور ترانے تخلیق کر کے خدمت انجام دیتے رہے، خاکسار تحریک کا قیام لاہور میں علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کے اعلان پر اپریل 1931 کو ہوا، علامہ مشرقی نے خاکسار تحریک کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ ان کے مطابق ہندوستان کی آزادی اور بالخصوص مسلمانوں کی فلاح کے لئے کام کرنے والی تمام سیاسی جماعتیں، مسلم لیگ، آل انڈیا نیشلسٹ، مسلم پارٹی، مجلس احرار، خدائی خدمت گار، وغیرہ ناکام ہو چکیں تھیں، انتشار کے اس موقع پر مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے کسی باشعور لیڈر کی ضرورت تھی، اس ضرورت کو مد نظر رکھ کر انھوں نے اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی خدمات پیش کیں، خاکساروں پر مشتمل ٹولے کی قیادت سنبھالی اور ہندوستان کی آزادی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، اس تحریک کا مقصد قومی اور بین الاقوامی سطح پر عوام کی فلاح و بہبودی کا کام اور انگریز سامراج کی ظلم و زیادتی، سرمایہ داری اور سماج دشمن عناصر کے خلاف آواز اٹھانا تھا اس کی مقبولیت نے اس دور میں انگریز سامراج کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا اور اسے باغی ٹولہ قرار دیا تھا اس تحریک میں بچے اور نو عمر نوجوان

بھی شامل تھے نو عمر خاکساروں کا ایک دستہ بیلچے اٹھائے پشاور کی سڑکوں پر مارچ کرتا نظر آتا چونکہ اس تحریک کی بنیاد بھی احتجاج، انقلاب اور حقوق کے حصول پر مبنی تھی جو کہ احمد فراز کی سرشت کا خاصہ تھا، اس لئے ان کی شخصیت پر اس تحریک کے گہرے اثرات مرتب ہوئے، نو عمر فراز کو بھی اس تحریک کے نو عمر دستوں کے بیلچے اٹھائے مارچ کرنے کا انداز بہت پسند آیا، اس لئے انھوں نے بھی نو عمروں کے اس دستے میں شمولیت اختیار کر کے اس تحریک کی قیادت کی ذمہ داری سنبھالی، محبوب ظفر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں

" بچپن سے ہی آپ کو خاکسار تحریک کے نعروں اور ولولوں کی گونج سنائی دی جس نے آپ میں ایک مجاہدانہ جذبہ پیدا کیا، احمد شاہ جب خاکی وردی پہنے نو عمر بیلچہ برداروں کو پشاور کی سڑکوں پر پریڈ کرتے دیکھتا تو اس کا جذبۂ جاںسپاری عود کر آتی "

پروفیسر فتح محمد ملک اپنی کتاب " احمد فراز کی شاعری نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار " میں لکھتے ہیں

رفتہ رفتہ خاکسار تحریک اور مارشل آرٹ سے شغف تو ختم ہو گیا مگر مارشل سکرپٹ عمر بھر زندہ اور سرگرم کار رہی "[6]

فراز میں بچپن سے ہی آگے بڑھنے کا جذبہ موجود تھا، ان کی سیمابی طبیعت نے ان کو کسی ایک مقام پر ٹکنے نہیں دیا، عام آدمی کے مسائل اور محرومیوں پر ان کی نظر گہری تھی، فراز ابھی خاکسار تحریک کی قیادت میں مصروف عمل تھے کہ برصغیر کی ترقی پسند مصنفین کی ادبی تحریک یعنی ترقی پسند تحریک کی آواز پشاور تک پہنچ گئی، جس نے غریب اور مظلوم عوام کے حق میں آواز اٹھائی اور روٹی کپڑا، مکان کا نعرہ لگایا، خاکسار تحریک میں شامل تمام لوگوں نے ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا پرجوش استقبال کیا، چونکہ اس تحریک کے ہم خیال پہلے ہی سے موجود تھے اس لئے انھوں نے فوری طور پر اس کی تشہیر

کے لئے اقدامات کئے اور فوری طور پر اس کی صوبائی تنظیم کا مرکزی دفتر پشاور میں کھولا گیا، اس تحریک کے سکریٹری جنرل فارغ بخاری مقرر کئے گئے اور ذیلی شاخیں پشاور کوہاٹ، ڈیرہ اسماعیل خاں اور ایبٹ آباد میں قائم کی گئیں۔ احمد فراز نے بھی اس تحریک کا بڑے جوشیلے انداز میں استقبال کیا، ان کی اس تحریک میں دل چسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے پہلی فرصت میں، انجمن ترقی پسند مصنفین، پشاور کے جوائنٹ سکریٹری کا عہدہ سنبھال لیا، اس حوالے سے فراز خود لکھتے ہیں

"ترقی پسند تحریک کی ایک شاخ پشاور میں قائم ہوئی، جس کا مجھے جوائنٹ سکریٹری بنایا گیا"[7]

1936 میں ہندوستان میں شروع ہونے والی اس تحریک نے پہلی بار محروم، بے بس اور مظلوم لوگوں کے حقوق کی بات کی اور استحصالی قوتوں کو للکارا، اس تحریک کے متوالوں نے ادب کے میدان میں " ادب برائے زندگی " کا نعرہ لگایا اور قلم کی زبان سے مظلوم اور پسے ہوئے طبقے کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا۔

پشاور میں ترقی پسند تحریک کے قیام کے فوراً بعد اس تحریک کے سکریٹری جنرل، فارغ بخاری نے 1948 میں ایک ترقی پسند ماہنامہ " سنگِ میل " سالنامہ سرحد نمبر شائع کرنے کا منصوبہ بنایا، جس میں سرحد (خیبر پختونخوا) کی ادبی، ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے مواد اکھٹا کرنا تھا، چنانچہ فراز سے اس خصوصی نمبر کے لئے نظم لکھنے کی فرمائش کی گئی، تو انھوں نے ایک نظم "لختئی" کے عنوان سے لکھی، جس کو بے حد پذیرائی ملی "لختئی" سرحد کے وہ رقاص لڑکے ہیں جو شادی بیاہوں اور خوشی کی تقریبات کے موقعوں پر عورتوں کا روپ اختیار کر کے ناچتے ہیں، لختئی کے حوالے سے رضا ہمدانی کہتے ہیں

"لختئی میں فراز کے شعوری مشاہدات اور فن کی پختگی عروج پر ہے اور آج وہ ایک نمایاں سماجی کردار بن کر ذہن میں ابھرتی ہے"[8]

احمد فراز کی اسی نظم کے حوالے سے پروفیسر فتح محمد ملک اپنی کتاب "احمد فراز کی شاعری، نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار" میں کہتے ہیں

"تنہا تنہا میں جہاں غزل کے ایسے اشعار موجود ہیں،

"تیرے ہوتے محفل میں جلاتے ہیں چراغ،

لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ"

وہاں "لختئی" جیسی نظم بھی مل جاتی ہے، جہاں فراز کی ترقی پسندی مقامیت سے پھوٹی ہے یہاں احمد فراز نے اپنے گرد و پیش کی زندگی میں سرگرداں کرداروں میں سے ایک ایسے کردار کو اپنا موضوع بنایا ہے جو دوسروں کے لئے تفریح و تفنن اور لطف مسرت کا سامان بہم پہنچاتا ہے لیکن خود اس کی اپنی زندگی مصائب و آلام کے پہاڑ کے نیچے کراہتی اور خون تھوکتی رہتی ہے، فراز کی نگاہیں اس رقاص لڑکے کی ظاہری آرائش وزیبائش کو چیرتی ہوئی اس کے چہرے کی ویران اور مغموم تہہ تک جا پہنچتی ہیں"[9]

فراز کی ترقی پسند سوچ کو پروان چڑھانے کے لئے آغاز ہی میں ایسا سہارا مل گیا جہاں ان کی ترقی پسندی ارتقاء کے زینے چڑھنے لگی، انھوں نے اوائل عمر ہی میں خاکسار تحریک میں شمولیت اختیار کی جو ان کی سوچ کی صحیح ترجمان تھی اس تحریک کا مقصد بین الاقوامی سطح پر انسانیت کی فلاح اور انگریز سامراج کے ظلم و جبر، سرمایہ داری اور ہر قسم کے استحصالی قوتوں کے خلاف آواز اٹھانی تھی اور یہی فراز کے دل کی آواز تھی، فراز ابھی خاکسار تحریک میں ستم رسیدوں کے غم میں مصروف کار تھے کہ ترقی پسند تحریک کی آواز پشاور تک پہنچ گئی، اس تحریک کے منشور کو مد نظر رکھ کر تمام خاکساروں کے ساتھ ساتھ فراز نے بھی اس کا والہانہ استقبال کیا، فراز ترقی پسند تحریک کی پشاور شاخ کے جنرل سکریٹری منتخب کر

دئے گئے، یہیں سے فراز کی ترقی پسندی کا آغاز ہوا، جو آخری دم تک جاری رہا، ترقی پسند تحریک کا منبع روس تھا، وہاں کمیونسٹ پارٹی کے ارکان نے اس تحریک کی بنیاد رکھی تھی، جس کے زیر اثر ہندوستان میں 1936 میں پریم چند، اور سجاد ظہیر وغیرہ کی سرکردگی میں اس کا آغاز ہوا تھا، بعد میں فیض احمد فیض احمد ندیم قاسمی اور قیام پاکستان کے بعد احمد فراز اس تحریک کے ممبر بنے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے فراز کو ایک نیا ولولہ اور نئی سوچ عطا کی اگرچہ اس وقت وہ نوجوان تھے مگر ادبی محفلوں میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے، انھوں نے اپنی خوش گفتاری، طبیعت کی طراری، ذہنی پختگی اور مطالعے کی فراوانی کی بدولت لوگوں کے دلوں میں اپنا مقام بنالیا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ ان کے فکر و نظر کا دائرہ وسعت اختیار کرتا گیا، اور وہ زندگی اور سماج کے نئے نئے سماجی، عوامی اور آفاقی مسائل کو شعر کا جامہ پہنایا گیا، مختلف ادبی نشستوں، خاکسار اور ترقی پسند مصنفین جیسی ادبی اور انقلابی تحریکوں نے فراز کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا، بقول رضا ہمدانی،

> **" فارغ اور فراز دونوں کا ذہنی و ادبی آغاز تحریک خاکسار سے ہوا، جو اپنے وقت کی ایک سماجی ترقی پسند تحریک تھی اور دونوں کا انجام بھی ترقی پسند تحریک پر ہوا، جو ایک ادبی جدلی جدوجہد تھی"**[10]

ترقی پسند تحریک برصغیر ہندوپاک کی سب سے فعال اور عظیم تحریک رہی ہے، شعر و ادب پر اس تحریک کے بڑے گہرے اثرات رہے ہیں، فراز چونکہ بچپن سے ہی مظلوموں اور لاچاروں کے ساتھ حمایت کا ذہن رکھتے تھے بریں بنا جب فراز کو ترقی پسند تحریک کے منشور سے آگاہی حاصل ہوئی تو ان کے اندر کا احساس اور بیدار ہو گیا، ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے حوالے سے فراز خود کہتے ہیں

> **" میں نے ترقی پسند تحریک میں عملی کردار ادا کیا اور اپنے اشعار کے ذریعہ بھی اس کی حمایت جاری رکھی، ہمیشہ سے جاگیر دارانہ نظام کے خلاف ہوں، جہاں امیر، امیر ترین، اور غریب، غریب تر ہوتا ہے، اس**

کی وجہ شائد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میرا تعلق بھی متوسط

طبقے سے تھا،"[11]

سرمایہ داری، اونچ نیچ، مزدور غریب کی حق تلفی، معاشرے میں عدم مساوات، یہ وہ سارے عوامل تھے جن کے خلاف فراز ابتدا سے ہی نبرد آزما تھے، ترقی پسند تحریک کے پردہ میں انھوں نے گویا کہ اپنا ہمنوا پالیا، چنانچہ ترقی پسند تحریک نے جن معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف آواز اٹھائی، فراز نے ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا فراز ہمیشہ ترقی پسندانہ سوچ پر ڈٹے رہے، اور آخر تک ترقی پسند نظریات کا پرچار کرتے رہے، ترقی پسند تحریک کا جو مقصد تھا، یعنی جن ناہمواریوں کی بناپر ترقی پسند تحریک معرضِ وجود میں آئی تھی، پاکستان قائم ہونے کے بعد بھی وہ تمام ناہمواریاں نئے سرے سے وجود میں آگئیں تھیں، اس لئے دیگر ترقی پسند مصنفین کی طرح فراز بھی ان کے خلاف صف آرا ہو گئے، انھوں نے ہر اس قوت کو للکارا جو غریبوں بھوکوں اور بے سہاروں کی حق تلفی کرتے تھے اور بھوک و افلاس کے مارے ہوئے لوگوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا، چنانچہ فراز اپنی نظم "اے بھوکی مخلوق" میں کہتے ہیں

آج تری آزادی کی ہے ساتویں سال گرہ
چار طرف جگمگ جگمگ کرتی ہے شہر پنہ
پھر بھی تیری روح بجھی ہے اور تقدیر سیہ

پھر بھی پاؤں میں زنجیریں ہاتھوں میں کشکول
کل بھی تجھ کو حکم تھا آزادی کے بول نہ بول

آج بھی تیرے سینے پر ہے غیروں کی بندوق

(اے بھوکی مخلوق۔ "تنہا تنہا" ص 87)

احمد فراز اپنے سینے میں انسانیت سے انس اور محبت و ہمدردی کے جذبات سے مالا مال دل رکھتے تھے، وہ غریبوں کے ساتھ بالخصوص ہمدردی کا اظہار کرتے تھے وہ عوام کے قریب رہنا پسند کرتے تھے وہ خود کہتے ہیں۔

"وطن اور اسکے بسنے والوں کے غم ان کے دکھ ان
کے مسائل میرا موضوع رہے ہیں ، میں ہمیشہ اپنے
لوگوں میں موجود رہاہوں میں جانتاہوں کہ میں نے
یہ رشتہ توڑا تو میری اکائی بے معنی ہو جائیگی میں اتوار
بازار اس لئے جاتا ہوں کہ وہاں مجھے اپنے لوگوں کے
چہرے نظر آتے ہیں ، سچے اور کھرے چہرے
کاسمیٹک کی تہوں سے پاک، جدید تراش خراش میں
ملبوس بت نہیں، سیدھے سادے انسان نظر آتے ہیں
یہ میرا عملِ مسلسل ہے جو میری شاعری میں نظر آتا
ہے ، میں انھیں دیکھتاہوں جو ان کے چہرے پر لکھے
دکھ اور مسائل میرے دل میں اتر کر شعر کی صورت
جنم لیتے ہیں"[12]

فراز انسان دوستی کی صفت سے متصف تھے وہ ہر لمحہ عوام کے قریب رہنا چاہتے تھے، فراز نے ظلم وجور کے خلاف ہمیشہ آواز اٹھائی، وہ اپنے وطن کے مظلوموں کے ساتھی ہیں، انھیں کی طرح تڑپتے ہیں، مگر روتے نہیں بلکہ ان زنجیروں کو توڑتے اور ٹکڑے ٹکڑے کرتے نظر آتے ہیں، چاہے یہ ظلم کسی انسان پر ہو یا کسی غریب طبقہ پر، یا پھر کسی قوم پر انھوں نے اس حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار اپنی خوبصورت نظم "معذرت" میں کچھ اس طرح کیا ہے۔

لیکن اس وقت مرے ذہن کے ہر پردے میں
چند سلگی ہوئی آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
میری سانسوں میں ہیں مغموم دلوں کی چیخیں
جن کی قسمت میں کراہوں کے سوا کچھ بھی نہیں

جس کی شادی بھی غم و رنج کا مجموعہ ہے
جن کو حاصل نہیں ہوتا کسی لمحہ بھی فراغ
جن کو ماں باپ سے ملتے ہیں مصائب کے جہیز
جن کی باراتوں میں جل اٹھتے ہیں اشکوں کے چراغ

(تنہا تنہا۔

(117

اس معاشرے میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو غریب و مظلوم اور مجبور دیکھ کر اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں مظلوم و مجبور کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے والوں کے خلاف آواز اٹھانا ترقی پسند سوچ رکھنے والوں کا اہم موضوع ہے، فراز نے بھی ظلم کی اس انتہا کے خلاف آواز اٹھائی، چونکہ وہ خود تنگ دستی اور غربت کے مراحل سے گزرے تھے اس لئے مفلسوں اور مجبوروں کے حالات سے خوب واقف تھے، اس حوالے ان کی نظم "صرّاف" اہمیت کی حامل ہے۔

ساٹھ کے تیس، نہیں یہ تو نہیں ہو سکتا
زرِ خالص کی انگوٹھی ہے ذرا غور سے دیکھ
کسی پتھّر پہ رگڑ اِس کو کسوٹی پہ پرکھ
ہر طرح جانچ ہر انداز ہر اِک طَور سے دیکھ
مجھ پہ روشن ہے کہ اِس جنسِ گراں مایہ کو
میرے افلاس نے کم نرخ بنا رکھا ہے
دیکھ کر میری نگاہوں میں طلب کی شدّت
تو نے انصاف کو نیلام چڑھا رکھا ہے
جانتا ہوں تری دکاں کے یہ زرّیں زیور
یہ گلوبند یہ کنگن یہ طلائی پیسے

یہ زر و سیم کی اینٹوں سے لدی الماری

کسی شدّاد کا تابُوت دھرا ہو جیسے

کتنے مجبوروں نے بڑھتی ہوئی حاجت کے لئے

کیسے حالات میں کس نرخ یہاں بیچ دیے

کتنے ناداروں نے افلاس کے چکراؤ میں

پہلے تو رہن کیے بعد ازاں بیچ دیے

تیری میزاں کے یہ بے رحم سنہرے پلڑے

ایک جلّاد کی تلوار رہے ہیں اب تک

گرسنہ آنکھوں کے کشکول، ہوس کے مقتل

ہر نئے خوں کے خریدار رہے ہیں اب تک

ساٹھ کے تیس نہیں، تیس کے پندرہ دے دے

اپنی مجبوری کا اظہار نہیں کر سکتا

آج اک تلخ ضرورت ہے مرے پیشِ نظر

میں کسی رنگ سے انکار نہیں کر سکتا

(تنہا تنہا126)

احمد فراز کو بھی کمیونسٹ یا اشتراکی قرار دیا گیا، تاہم وہ کبھی بھی کمیونسٹ نہیں تھے۔، اگرچہ ترقی پسند تحریک کمیونزم کے ایما پر عمل میں آئی تھی لیکن پاکستان کی آزادی کے بعد ترقی پسندی، اور ترقی پسند تحریک کے منشور میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے، پاکستان میں ترقی پسندوں کا نعرہ، روٹی، کپڑا، مکان غریبوں کی حمایت میں آواز، سرمایہ دار اور جاگیر دار کی ظلم و زیادتی کے خلاف آواز، اور ملکی ترقی کے حق میں خدمت انجام دینا تھا، دوسرے معنوں میں ان لوگوں کے نزدیک ترقی پسندی کا مطلب صرف معاشرتی ترقی کا نام ٹھہرا۔ ان ترقی پسندوں کے نزدیک مثبت معنوں اور مذہبی اصولوں کے موافق ترقی کے زینے چڑھنے کا نام ترقی پسندی ہے، یہاں کوئی مذہب کے خلاف نظریات نہیں گڑھے

گئے ، نہ کوئی کمیونسٹ سوچ پروان چڑھ سکی ، ترقی پسندوں کو صرف اور صرف ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی وجہ سے ، کمیونسٹ کہا جانے لگا ، چنانچہ احمد فراز ، مسعود مفتی کو ایک جگہ جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں

"میں کمیونسٹ کبھی نہیں تھا، صرف ترقی پسند تحریک کا ممبر تھا، مگر تحریک کے کئی ممبر ایسے تھے جو کمیونسٹ نہیں تھے اور صرف معاشرے میں سوشل جسٹس اور انصاف کا تقاضہ کرتے تھے" [13]

علاوہ ازیں فیاض اعوان کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں

"میں ترقی پسند ضرور ہوں مگر کبھی نہ کمیونزم کا اوڑھنا بچھونا رہا اور نہ میں کمیونسٹ پارٹی میں رہا" [14]

اس حوالے سے احمد فراز ایک جگہ ترقی پسند تحریک اور پاکستانی ترقی پسندوں کے حوالے سے بڑی تفصیلی گفتگو کرتے ہیں ، جس میں وہ بڑی وضاحت سے ترقی پسندوں پر کمیونسٹ ہونے کے الزام کی وضاحت کرتے ہیں۔

"میں اپنے ملک کے حوالے سے بات کرنا چاہوں گا کہ جب یہاں ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی تو اس وقت ہمارا پورا منظر نامہ امریکہ کے زیر اثر تھا، نیٹو اور سیٹو کے معاہدوں کے تحت، امریکہ ہر قسم کی معاشی آواز اور تحریک کو دبانے کے درپے تھا، اسی کے ایجنٹ اور گماشتے ہمارے ملک میں کام کر رہے تھے، چنانچہ جس نے بھی اقتصادی ناہمواری کے خلاف آواز اٹھائی اسے کمیونسٹ، بے دین اور لامذہب کہا جانے لگتا، یہ سب کچھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا جاتا، کچھ فائدہ

انھیں، عوام کی جہالت کا بھی پہنچا، کم علم مولوی کو بھی
اس ضمن میں استعمال کرتے ہوئے ہم لوگوں کو خدا
اور رسول ﷺ کا منکر ٹھہرایا گیا۔ ہم لوگ جتنے
مسلمان اس تحریک میں شمولیت سے پہلے تھے بفضل
خدا اتنے ہی آج بھی ہیں، ترقی پسند ادبی تحریک تھی،
جس کے شرکاء کو پڑھا لکھا ہونے کے باعث سیاسی
شعور بھی تھا"[15]

احمد فراز دراصل ایک باغی شاعر ہیں اور ان کی سب سے بڑی بغاوت اس استحصالی معاشرے اور نظام سے ہے جو مفلسوں، لاچاروں، مزدوروں اور غریبوں کے ہاتھ سے نوالہ چھین کر خود کا پیٹ بھرتا ہے وہ جگہ جگہ ایسے نظام کو للکارتے نظر آتے ہیں، انھوں نے ان تلخ حقائق کو بیان کرنے میں خوشنما لفظوں کے پردہ کا ستعمال بہت کم کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر نظموں میں تلخیوں کی صاف گونج سنائی دیتی ہے، سچ تو ہمیشہ کڑوا ہی ہوتا ہے لیکن اس کا برداشت کرنا نہایت ہی مشکل ہوتا ہے، بریں بنا احمد فراز، امیر شہر اور خطیب شہر کی نظر میں ہمیشہ معتوب رہے، مگر حق گوئی کا دامن نہیں چھوڑا ہمیشہ محکوم و مظلوم انسانیت کے لئے جدوجہد کرتے رہے بقول ڈاکٹر نیر صمدانی

"احمد فراز ابن آدم کی مسلسل محکومی سے تڑپ اٹھتے
ہیں، کل بھی ان کے ماتھے پر ذلتوں کے داغ تھے آج
بھی ان کے دامن میں عزتوں کی راکھ کے سوا کچھ بھی
نہیں ابن آدم سے وارثان تخت و تاج کا یہ روح فرسا
سلوک، شاعر کو چین نہیں لینے دیتا، فراز سمجھتا ہے
خلعت پوشوں نے تہی دستوں پر جو ظلم ڈھائے ہیں،
اس پر انسانیت جتنے اشک بہائے کم ہے، تخت نشینوں
نے مفلسوں کے نوالہ ہی نہیں چھینا بلکہ ان کو بے

دست وپا کر دیا ہے اور وہ ننگِ انسانیت ہو کر بھی ظل

الٰہی رہتے ہیں" 16

فراز محنت مزدوری کرنے والوں کے حقوق کے لئے آواز بلند کرتے رہے، ان سے بے حد محبت کرتے رہے اور جہاں کہیں بھی مزدوروں پر ظلم ہو تا وہ تڑپ اٹھتے ہیں ، مزدوروں کے ساتھ ان کے جذبۂ محبت کے حوالے سے شمیم اکرام الحق اپنے مضمون "، احمد فراز کی شخصیت " میں لکھتی ہیں۔

" عراق کے سفر کے دوران جاتے ہوئے ایئر پورٹ پر

اور واپسی پر جہاز میں ، فراز ان پاکستانی مزدوروں کے

انٹری فارم بھرتے رہے جو ناخواندہ تھے اور ہر مرتبہ

انھوں نے دو ڈھائی سو فارم فل کئے۔۔۔ دل ہی دل

میں سوچتی رہی کہ ان بیچارے مزدوروں کو کیا پتہ ان

کے فارم وہ بھر رہا ہے جس کے آٹو گراف لینے کے

لئے حسیناؤں کی قطاریں منتظر کھڑی رہتی ہیں" 17

ترقی پسندی کے حوالے سے ان کی نظم " سیلاب " انتہائی اہمیت کی حامل ہے ، جس میں انھوں نے اس ملک کے غریبوں اور مفلسوں کی بھرپور عکاسی کی ہے ، فراز کے خیال میں تباہی کا ایک سیلاب آیا ہے جو صرف غریبوں کو ہی بہا کر لے جا رہا ہے ان کے خیال میں یہاں سرمایہ دار کی زندگی عیاشی میں ہے جبکہ غریب کی تقدیر میں صرف مرنا اور ڈوبنا ہی لکھا ہے غریب جو تمام عمر امیروں کے پیٹ ہنس ہنس کر پالتا ہے لیکن خود ننگا بھوکا پھرتا ہے اور آخر کار ڈوبنا ہی اس کا مقدر ٹھہرتا ہے

پھٹے پرانے کپڑے پہنو

اپنا مقدر اپنا نصیبہ

دیکھتی جاؤ، ننگی بہنو

ننگی ماؤں، بنتی جاؤ　　　اطلس اور کمخواب

ناچو گاؤ جشن مناؤ　　　آیا ہے سیلاب

پھول اگاؤ پتھر کھاؤ　　　گندم ہے نایاب

ہنس ہنس کر اے غربت زادو-

ان داتاؤں کے چرنوں میں

اپنی جانیں بھینٹ چڑھادو

بڑھتے آؤ، روگ مناؤ　　　ہو جاؤ غرقاب

ناچو گاؤ جشن مناؤ　　　آیا ہے سیلاب

(تنہا تنہا-

ص157)

فراز کے خیال میں حکمران طبقہ نااہل ہے، وہ ملکی وسائل کا بے دریغ اور غلط استعمال کرتے ہیں، ان کی بنائی ہوئی پالیسیاں صرف ان کے حق میں بہتر ثابت ہوتی ہیں، غریب کسمپرسی کے شکار ہیں۔ ایک طرف عوام بھوک سے مر رہے ہیں، تو دوسری طرف حکمران اور سیاست دان ملکی وسائل کا غلط استعمال کرتے ہیں، فراز کہتے ہیں

"آپ کتنے کھربوں روپئے حج پر لگادیتے ہیں پہلے آپ پر حج فرض تو ہولے، حج صاحب استطاعت پر فرض ہے، قرض لیکر حج نہیں ہوتا، مسلمان بے غیرت ہے جو قرض دار ہے، کافر قابل عزت ہے جو اس لعنت سے پاک ہے، ایک حج ایک لاکھ کا پڑتا ہے، کھربوں تک بات چلی جاتی ہے، کیا یہ ثواب نہیں کہ آپ اپنے مسائل حل کریں، اپنی قوم کے دکھ دور کریں آپ کا پر عزم نوجوان بے روزگاری کے شکنجے میں کس کر خود کشی نہ کرے، باپ اپنے ہاتھوں سے بھوک سے بلکتے

بچوں کو ذبح نہ کرے، کیا جج کے مقابلے میں ضروری

نہیں ہے"[18]

ترقی پسند سوچ رکھنے والوں نے ہمیشہ ان قوتوں کو بھی بے نقاب کیا جو بظاہر تو خود کو وطن پرست اور وطن دوست سمجھتے ہیں، لیکن بہ باطن، وطن کے ساتھ بے وفائی کرنے والے یہی سماج دشمن عناصر ہوتے ہیں، بظاہر حب الوطنی کا نعرہ لگاتے ہیں، لیکن در پردہ اپنی سیاست چمکانے کے بہانے ڈھونڈتے پھرتے ہیں فراز کہتے ہیں

"لوگوں کو کبھی دھوکا نہیں دینا چاہئے ، کوئی لیڈر عوام
کے بغیر عزت نہیں پا سکتا، جھوٹ چند دنوں میں کھل
جاتا ہے قائداعظم کے لئے لوگوں کے دلوں میں آج
تک اس لئے عزت ہے کہ انھوں نے لوگوں کو کبھی
دھوکا نہیں دیا، جو کہا پورا کیا"[19]

علاوہ ازیں سیاست دانوں میں تعلیم کا فقدان ہے فراز کے خیال میں سیاست دان پڑھے لکھے نہیں ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیر وکریسی جو پہلے ہی سے طاقت ور ہے مزید طاقت ور ہو جاتی ہے، ان کے خیال میں جب تک سیاست دان تعلیم سے بے گانہ رہیں گے وہ سسٹم بھی ترقی کی راہ پر نہیں لا سکتے فراز کہتے ہیں۔

" سیاست دان جب تک تعلیم یافتہ نہیں ہوں گے وہ
بیر وکریسی کو تو کیا اس کے ایک سیکشن افسر کو بھی
کنٹرول نہیں کر سکتے، ان پڑھ سیاست دان معمولی سا
خط بھی ڈرافٹ کرنے کے لئے سیکشن افسروں کے
محتاج ہوتے ہیں، آپ دیکھیں کہ کمشنر، ڈپٹی کمشنر کو
کہتا ہے کہ آج مجھے پارٹی کرنی ہے ، بیس بٹیر چاہئیں،
تحصیل دار پٹواری کو کہتا ہے کہ کمشنر صاحب کی پارٹی

کے لئے ساٹھ بٹیریں چاہیئے ، اس طرح وہ نیچے تک

پہنچتے پہنچتے دو سو بٹیر ہو جاتے ہیں کہنے کا مطلب یہ ہیکہ

اگر نیچے والا افسر یہ دیکھے گا کہ اس کا افسر کرپٹ، نااہل

اور کمزور ہے تو پھر وہ اپنی مرضی سے کریگا"[20]

فراز ابتداء ہی سے ان مکروہ اور غلیظ، چہروں کی نشاندہی کراتے ہیں یہ وہ تمام قوتیں ہیں جو صرف ذاتی مفاد کی جنگ لڑتے ہیں جو عوام کے ساتھ جھوٹے وعدے کرکے ان کو بے وقوف بناتے ہیں ان کے مطابق،

" ہمارے ملک میں کوئی نظام نہیں ، افسرانِ بالا

سارے کام ٹیلی فون پر کر لیتے ہیں فلاں کو ڈی سی اولگا

دو، اس کو نکال دو، اس کو رکھ لو"[21]

فراز کے خیال میں دراصل یہی قوتیں وطن دشمن عناصر ہیں، اور انھیں باطل قوتوں کی وجہ سے ملک اور قومیں تباہی کے اندھے غار میں چلی جاتی ہیں اس حوالے سے فراز کے چند شعر ملاحظہ ہوں

دوست جب ٹھہرے چمن کے دشمن جانِ بہار

زخم دکھلائیں کسے پھر سینہ چاکان بہار

وہ سفینے جنھیں طوفاں نہ ملے

ناخداؤں نے ڈبوئے ہونگے

امیر شہر کے فرمان سب بجالیکن

فقیر شہر بھی کچھ عرض حال کرتے ہیں

ہمیں تو جان سے زیادہ عزیز دردِ وطن

مگر حضور بھی ایسا خیال کرتے ہیں

(تنہا تنہا)

ترقی پسندوں نے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بھی بھرپور آواز اٹھائی، ان کے خیال میں سرمایہ دار ہی نچلے طبقے کی کسمپرسی کا ذمہ دار ہے، جتنا ظلم غریب کے ساتھ سرمایہ دار کرتا ہے کوئی دوسرا نہیں کرتا، غریبوں کا خون چوسنے والے اور ان کے تمام وسائل کو غصب کرنے والے سرمایہ دار ہی ہیں، سرمایہ دارانہ نظام کے حوالے سے شیخ افتخار احمد اپنے مضمون "احمد فراز میں کیوں لکھتا ہوں" میں کہتے ہیں

"سرمایہ داری ایک ایسا اقتصادی نظام ہے جس میں اجتماعی پیداوار کے لئے مزدوری اور محنت کو کام میں لایا جاتا ہے، فراز نے ابتدا ہی سے اپنی شاعری میں سرمایہ داری کے خلاف آواز اٹھائی ان کے مطابق "میں ناانصافیوں، ناہموار زندگی کی مشکلات، غربت کے خلاف اور عشق جمال اور امن کے جذبوں کی آبیاری کے لئے لکھتا ہوں"[22]

فراز کے پہلے مجموعے تنہا تنہا کی بیشتر نظمیں سرمایہ دارانہ نظام، اونچ نیچ اور طبقاتی کشمکش کے خلاف ہیں، انھوں نے بڑی گہرائی سے سیاسی وسماجی حالات کا جائزہ لیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ نو وارد ملک پاکستان کو سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں سے بچانا ہی ہے کیوں کہ اگر صورت حال یہی رہی تو ایک دن پاکستان کھوکھلا ہو جائیگا، فراز کے خیال میں چند افراد ہی ہیں جو پاکستان پر قابض ہونا چاہتے ہیں، چنانچہ فراز نے ان کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی وہ اپنی نظم "اے بھوکی مخلوق" میں کہتے ہیں

بیس نہ سو، نہ ہزار، نہ لاکھ ہیں، پورے آٹھ کروڑ،
اتنے انسانوں پر لیکن چند افراد کا زور،
مزدور اور کسان کے حق پر جھپٹیں کالے چور،

کھیت تو سونا اگلیں پھر بھی ہے ناپید اناج،

تیرے دیس میں سب کچھ اور تو غیروں کی محتاج،

گوداموں کے پیٹ بھرے ہیں بوجھل ہیں صندوق،

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اے بھو کی مخلوق،

یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جس معاشرے میں سرمایہ داری کا جادو سر چڑھ کر بولے، وہاں معاشی حوالے سے عدم استحکام کا دور دورہ ہونے لگتا ہے ایک ہی رنگ و نسل اور قوم کے افراد کے درمیان عدم مساوات اور ذات پات کی تقسیم نچلے طبقے کے لئے اذیت اور کرب کا پیغام لاتی ہے، جس سے معاشرے میں انتشار اور افرا تفری پھیلنے لگتی ہے، ترقی پسند سوچ رکھنے والوں نے معاشرتی عدم مساوات کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا، ابرار احمد لکھتے ہیں

" ہر سماج میں بالا دست طبقے عوام کا استحصال کرتے چلے آرہے ہیں، ریاست کے نام پر، مذہب کے نام پر، سیاست کے نام پر، معیشت کے نام پر اور ان استحصالی قوتوں کے ہاتھ جھٹک دینے کے لئے مزاحمتی عمل بھی جاری وساری ہے "[23]

فراز ایک سچے انقلابی تھے اور انقلاب کا تصور ان کے ذہن میں صرف سیاسی ہی نہیں تھا بلکہ سماجی انصاف اور مساوات پر مبنی ایک صحت مند نظام کا قیام تھا، انھوں نے انسانی طبقات کے درمیان کشمکش کو خصوصی توجہ دی اور آغازِ شاعری میں ہی عدم مساوات کے خلاف آواز اٹھائی وہ آزادی کے پرستار، مساوات کے حامی اور سرمایہ داری کے دشمن تھے ، محبت، اخوت اور انسان دوستی ان کا مذہب ہے، ان کے بقول

"ہمارے یہاں تو لوگوں کو انصاف اور نظام عدل پر اعتماد ہی ختم ہو گیا ہے، اصولوں اور انصاف کے بغیر نہ تو ملک بنتے ہیں اور نہ ہی چلتے ہیں"[24]

عدمِ مساوات کے حوالے سے ان کی نظم، "آگ" بڑی ہی اہمیت کی حامل ہے

خاک ہی خاک ہوئی جاتی ہے دنیا اپنی
اور اس آتش و ظلمات کے سیلاب میں بھی
مرمر و آہن و سیماں کی عمارات بلند
اسی پندار اسی شان سے استادہ ہیں
کیا خدا صرف غریبوں پہ ستم ڈھاتا ہے

(تنہا تنہا ص:40)

عدم مساوات کے رد عمل پر اظہار کرتے ہوئے فراز کی ایک اور نظم "ہلال عید" بھی اہم ہے

ہلالِ عید! مگر میں نے ہر برس دیکھا
کہ تیری ضو بھی نشیبوں میں مسکراتی نہیں
خدا کے گھر میں برابر سہی غریب و غنی
یہ رسم ملکِ خدا میں رواج پاتی نہیں
کہیں تو جسم پہ ریشم کے ڈھیر بارِ نظر
کہیں بدن پہ ہیں عریانیاں ہی پیراہن
کہیں تو کج کلہی وجہِ نخوت و تمکیں
کہیں فلاکت و افلاس زندگی کے کفن
تری ضیا بھی ہے گویا کٹی پتنگ جسے
بلند بام خلا ہی میں لُوٹ لیتے ہیں

(تنہا تنہا:ص178)

نظم "ہلالِ عید" کے بارے میں خود فراز کا کہنا ہے کہ

" میں نے عید پر ایک نظم کہی تھی، اسے احمد ندیم قاسمی صاحب نے امروز کے پورے صفحہ پر شائع کیا، حالانکہ اس وقت قاسمی صاحب سے واقفیت اور ملاقات تک نہیں تھی

"[25]

فراز کے یہاں طبقاتی کشمکش، عدم مساوات، اور مذہب کے نام پر فسادات کے خلاف مزاحمت شکوے کے انداز میں بھی سامنے آتی ہے، جب ان کی امیدیں پوری نہیں ہوتیں تو وہ کہیں کہیں خدا سے بھی شکوہ کرنے لگتے ہیں "تنہا تنہا" کے شکووں میں لہجے کی تلخی اور جذبات کی شدت نمایاں ہے، ان کی نظم "منصور اس حوالے سے اہمیت رکھتی ہے، یہاں وہ اللہ تعالیٰ سے باغیانہ لہجے میں شکوہ کرتے ہیں کہ انسان نے آخر وہ کون سا جرم کیا ہے جس کی پاداش میں اس نے روز ازل سے اپنی تمام زندگی تیری عبودیت میں گزار دی، لیکن پھر بھی اس کی زندگی میں امن و آشتی، چین و سکون اور قلبی اطمینان کا لمحہ میسر نہ آسکا، وہ کہتے ہیں

کہاں ہیں وہ تری جبینیں، جن کی داستانیں

بڑی تکلیف سے عرش سے فرش پر اتاریں

کہاں ہیں وہ تیرے شیر و شکر کے بے انتہا ذخیرے

کہ جن کی کاذب جھلک سے تو نے

گرسنہ مخلوق کو ازل سے غلام رکھا

(تنہا تنہا، ص:130)

فراز اس مقام پر جذبات کی رو میں بہکر باغیانہ لہجہ اختیار کرتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ وہ خدا سے مخا طب ہیں وہ زمین پر سارے فسادات اور مذہب کے نام پر ہونے والے خون خرابے اور فرقہ واریت کا سارا نزلہ خدا پر گراتے ہیں اور اس کو ان تمام ناہمواریوں کے قصوروار ٹھہراتے ہیں، مزید کہتے ہیں

میں ان روایات کی حقیقت سے باخبر ہوں
یہ سب وہ رنگین دام تھے جن کے بل پہ تو نے
زمین پر یہ بغض و عناد و ظلم و فساد و حرص و ہوس کے ایسے دھوئیں اڑائے ہیں
کہ نسل آدم کروڑوں فرقوں میں بٹ گئی ہے

(تنہا تنہا، ص130)

بعد ازاں وہ کہتے ہیں کہ تاریخ بتاتی ہے کہ جہاں رنگ و بو کی ساری چیزیں انسان کے امن و سکون کے لئے تخلیق کی گئیں اور خدا اور بندے کی تفریق بھی بے حقیقت ہے، لیکن جہاں کہیں انسان خدا بنا ہے وہاں اس نے تخریب کے شجر بوئے ہیں وہ تاریخ کی کہن سال راہبہ کی زبانی کہتے ہیں۔

الوہیت کا وجود تم میں کسی خود فریب انسان کا واہمہ تھا
یہ واہمہ اس قدر بڑھا پھر
کہ رفتہ رفتہ کہ تمام کونین کا خداوند بن گیا ہے
اور اس خداوند
اس تصور کے آسرے پر
تمھارے کچھ ہم نفس رفیقوں نے
تم کو محکوم پابہ زنجیر کر دیا ہے
یہی وہ پہلا گناہ پہلا فریب، پہلا فسوں ہے جس نے
مزاج انساں کو غاصبانہ شعور بخشا

(تنہا تنہا، ص131)

فراز مذہب کے نام پر لڑائی جھگڑوں اور فسادات کی شدید مذمت کرتے ہیں اس حوالے سے وہ کہتے ہیں:

"مجھے مذہبی باتوں اور اس حوالے سے مار دھاڑ اور توہمات پر بڑا غصہ آتا ہے"[26]

فراز انسانی مزاج کے غاصبانہ شعور سے متفق نہیں ، ان کے نزدیک انسان جہاں کہیں بھی خدا بن کر بیٹھ گیا ہے ، وہاں تعمیر مفقود اور تخریب کاری نے سر اٹھایا ہے ، ان کے خیال میں انسان کا انسانوں پر جبر و تشدد ہی انسان کی بربادی کی سب سے بڑی دلیل ہے چنانچہ ڈاکٹر روبینہ ناز اپنے مضمون "اک طلسم خوش جمال" میں کہتی ہیں

"وہ (فراز) جدائی، کائنات کی شکست و ریخت ، سامراجی نظام ، سرمایہ دارانہ استحصال ، حیات کی بے معنویت اور اقدار کی بے قدری کا نوحہ کناں ہے لیکن اس کی ذات کا اصل رنگ سیاسی محاذ آرائی اور نعرے بازی کا رنگ نہیں ایک فنکار کی حساس شخصیت کا رنگ ہے ، جو ایک مثالی نظام اور سماجی عدل و انصاف کا خواہاں ہے" [27]

انسانیت کی درجہ بندی کے اس نشیب و فراز کی وجہ سے کام بگڑ جاتے ہیں ، بڑی مچھلی چھوٹی کو نگل رہی ہے ، اونچے طبقات والے نچلے طبقوں کے حقوق غصب کر رہے ہیں ، فراز کے خیال میں اونچ نیچ کی یہ تفریق ہی تمام فسادات کی جڑ ہے جب تک اس کو ختم نہ کیا جائے انسانیت معراج تک نہیں پہنچ سکتی اسی لئے نظم کے آخری حصہ میں ان کی شکایت نئے عزم کے ساتھ اس طرح آگے بڑھتی ہے۔

اگر یہ سچ ہے خدائے تنور و آبِ سادہ
تو یہ من و تو کی پست و بالا فصیل مسمار کیوں نہ کر دوں
کہ ان مراتب کی کشمکش سے ہی
آج میں اور میرے ہم جنس
اس طرح ایک دوسرے کے غنیم ہیں
جس طرح زمستاں کی برف باری کے بعد گرگان گرسنہ
بھوک کی شقاوت سے تنگ آکر

اس ایک لمحے کے منتظر ہوں
جب ان کا کوئی نحیف ساتھی
غنودگی کا شکار ہو
اور سب کے سب اس پہ ٹوٹ کر چیر پھاڑ ڈالیں
کہ اس شکم کے مہیب دوزخ سے بڑھ کے
کوئی نہیں جہنم

(تنہا تنہا، ص:99)

فراز نے معاشرے میں ہونے والے ظلم وزیادتی اور ناانصافی کے خلاف فکری سطح پر اپنی کوششیں جاری رکھیں انھوں نے معاشرے میں بسنے والے مظلوم طبقے کے حق میں آواز بلند کر کے اپنی سماجی ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے، ڈاکٹر اشفاق حسین اپنی کتاب "احمد فراز یادوں کا ایک سنہرا ورق" میں لکھتے ہیں

" وہ ایک ترقی پسند شاعر ہیں اور اپنے ملک کے عوام کے بہتر مستقبل کے لئے ایک منصفانہ معاشرے کے قیام کو ضروری سمجھتے ہیں ، پاکستان میں ہونے والے تمام جمہوری جدوجہد میں وہ اپنی شاعری کے حوالے سے اپنے لوگوں کی آواز رہے ہیں اور اسی لئے فیض اور حبیب جالب کی طرح وہ بھی پاکستانی احتجاجی شاعری کے ہراول دستے میں شامل رہے ہیں"[28]

احمد فراز کو مظلوموں کی آہیں بہت متاثر کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کسانوں کی زبوں حالی، مزدوروں کی کسمپرسی، غریبوں کی پسماندگی، مظلوموں کی بے بسی، سفید پوشوں کی تنگ دستی، خط غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی فاقہ کشی کی دل سوز تصویریں اپنی نظموں میں ایسی کھینچی ہیں

کہ قاری کا دل بھر آئے، ان کے پہلے مجموعے "تنہا تنہا" میں شامل نظم "اے بھو کی مخلوق" اسی قبیل سے ہے، احمد فراز کی ترقی پسند تحریک کے حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو

> **"احمد فراز ان ترقی پسند شعرا کی کہکشاں کا ایک تابندہ ستارہ ہیں جس میں فیض احمد فیض حبیب جالب، خالد علیگ، ظہیر کاشمیری، محسن بھوپالی، علی سردار جعفری، اسرار الحق مجاز، مجروح سلطان پوری جیسے ضو فشاں شامل ہیں"**[29]

ترقی پسندیت نہ صرف احمد فراز کی شاعری کا ضروری وصف ہے بلکہ وہ عملی طور پر بھی اس میں شریک رہے، انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین پشار کے لئے سکریٹری کے فرائض بھی انجام دئے اس سلسلے میں انٹرویو کی چند سطریں پیش ہیں۔

سوال:

> **جب آپ نے شاعری شروع کی اس وقت ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی اس کے اثرات آپ کی شاعری میں بھی ملتے ہیں**
>
> **کیا آپ اس تحریک سے متاثر تھے؟**

جواب:

> **بالکل: میں نے ترقی پسند تحریک میں اعلیٰ کردار ادا کیا ہے اور اپنے اشعار کے ذریعہ بھی اس کی حمایت جاری رکھی، ہمیشہ سے جاگیر دارانہ نظام کے خلاف ہوں،"**

ڈاکٹر اشفاق حسین نے اپنی کتاب " یادوں کا ایک سنہرا ورق" میں احمد فراز اپنے " انٹرویو اور بیانات کی روشنی میں" عنوان کے تحت ان بیانات کا خلاصہ کیا جو ان کی ترقی پسند نظریہ سے متعلق ہیں، ان کو پڑھ کر فراز کی ترقی پسندی اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی کا الزام لگایا گیا اور کبھی اسلام کے دشنام

سے نوازا گیا، در اصل بات یہ ہے کہ حب الوطنی کی آڑ میں وطن کی جڑیں کھو کھلی کرنے والوں اور مذہب کی غلط تعریف و تشریح کر کے اسلام سے بیزاری کو فراغ دینے والوں کی گرفت کی جائے تو وہ یوں پلٹ کر حملہ آور ہوتے ہیں، جیسے سانپ کی دُم پر پاؤں آ جائے، فراز نے جب وطن فروشوں اور نام نہاد ملاؤں کی گرفت کی تو اسلام اور وطن دشمنی جیسا الزام تو لگنا ہی تھا۔

احمد فراز کی نظمیں اور غزلیں ماضی اور حال کی فکر و احساس کی نشاندہی کرتی ہیں، ہمارے معاشرے میں سیاسی ابتری اور معاشی بدحالی کے ساتھ ساتھ اخلاقی طور پر بھی کافی گراوٹ آئی ہے، عظمت رفتہ چھن چکی ہے اور موجودہ عظمت بھی ہاتھ سے نکالی جارہی ہے، حالانکہ انسان خمارِ ماضی سے ابھی تک نہیں نکل سکا ہے، احمد فراز کا شمار چونکہ ترقی پسند دانشوروں میں سے ہوتا ہے اس لئے وہ انسانی معاشرے کے بہتر نقیب کے خواہاں ہیں اور زندگی کو مساوات، اخوت، خوشحالی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ ان کے خلاف آواز بلند کرنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں جو اخوت و بھائی چارگی کو مٹانے کے درپے ہیں، تاکہ عوام میں سماجی بیداری پیدا ہو، چنانچہ ان کی نظم "کھنڈر" میں کچھ اسی طرح کی کیفیات کا بیان ہے، اس میں شاعر مٹتی ہوئی تہذیب اور اخلاقی گراوٹوں کا نوحہ کناں ہے، اس نظم کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

یہاں خوش گلو اپسراؤں کے ہر نار گیسو سے تزئین بربط روا تھی
یہاں زندگی صرف زخم نوا تھی
یہاں باادب باسلیقہ غلاموں نے سجدے کئے اور ثبوت وفا کے لئے
گردنیں تک کٹا دیں
مگر رحم دل اور کشادہ دل آقاؤں کے عدل و انصاف سے
جگمگاتی جبینوں پہ کوئی شکن تک نہ آئی
بایں حال بھی مطمئن تھی خدائی
مگر وقت کے پے بہ پے کروٹوں نے کئی گل کھلائے
کبھی تو ہلا کو و چنگیز و تیمور نے بربریت کے پرچم اٹھائے
کبھی تورماں اور نادر کی جرار فوجوں نے یلغار کی، شہر لوٹے، جلائے

تباہی کے دف صور محشر کی صورت ہر اک سمت بھونچال لائے
بگولوں کے دامن میں امن وسکوں کے درخشندہ فانوس جلنے نہ پائے
اور اپنی رومانیت کے تلخ و تیرہ دھویں چھوڑ کر بجھ گئے مٹ گئے ہیں
یہ کہنہ روایات جن کی گھنی ظلمتوں میں نہ جادہ نہ منزل
غبارِ رواں کی طرح چھا رہی ہیں
دلوں کو دماغوں کو نظروں کو بھٹکا رہی ہیں اور ان کے جلو میں نہ لیلیٰ نہ محمل
نہ جذب تجسس کا حاصل
یہاں کچھ نہیں کچھ نہیں
فقط کچھ کھنڈر ابن آدم کی تاریخ پر منفعل ہیں

(خواب گل پریشاں ہے۔ ص 511)

یہ ایک طویل نظم ہے جو مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ ہے، اس نظم میں عہد گزشتہ میں ہونے والی درباری سازشوں، سیاست دانوں کی گھناؤنی چالوں کا ذکر بڑی دردمندی اور یاس سے بھری فضا میں کیا گیا ہے یہ ایک عہد گذشتہ کا منظر نامہ ہے جس میں ماضی عکس در عکس اپنی تمام فرسودگیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ کھنڈر بولتا ہوا تمام پردے ہٹاتا جا رہا ہے، جن میں ماضی کی سچائیاں پوشیدہ ہیں، ان میں شہنشاہ زمن ہیں اور ان کے اشاروں پر گردنیں کٹا دینے والے وفادار، مجبور و محکوم لوگ یہ نہ صرف ماضی کا المیہ تھا بلکہ حال بھی اس طلسم سے آزاد نہ ہو سکا۔ اسی طرح نظم "طلسم ہوش ربا" سے ایک بند ملاحظہ ہو:

میں شہنشاہ زمن ہوں کسے معلوم نہیں
ہر طرف موجب تعمیل ہیں فرمان مرے
میرے ادنیٰ سے اشارے پہ ہیں سب رقص کناں
یہ سپاہی یہ حسینائیں یہ دربار مرے

احمد فراز نے اس حاکم و محکوم کے طلسم کو اپنی نظموں اور غزلوں میں ایک خاص جگہ دی ہے اور نہایت عمدگی سے اس فرسودہ نظامِ عمل کا پردہ چاک کیا ہے، انسانی حقوق، جمہوری عمل جیسے حقائق ان کی نظموں میں جا بجا نظر آتے ہیں، بقول ڈاکٹر قمر رئیس

" آزادی کے بعد پاکستان ہی میں نہیں ایشیا اور افریقہ کے دوسرے نو آزاد ملکوں میں بھی جمہوری عمل ، انسانی حقوق اور انسانی وقار کو بے دردی سے کچلا گیا پاکستان میں طرح طرح کی آمریتوں نے سیاسی کرتب دکھائے نوجوانوں اور محنت کش انسانوں کی اجتماعی تحریکوں اور ان کی حمایت کرنے والے ادیبوں اور دانشوروں پر ہر طرح کی جبر و بیداد روا رکھی گئی، احمد فراز کی نظموں میں ان تمام حقائق کے زندہ اور متحرک نقوش تابناک نظر آتے ہیں ، ان کی نظموں میں احساس کی ایسی شدت تخلیقی توانائی اور حسن ہے کہ عصری حقائق کی ترجمانی کے باوجود آج بھی ان میں ایک انوکھی تازگی محوسوس ہوتی ہے، مثال کے طور پر ،" محاصرہ"" شہر آشوب"، " نئی مسافت کا عہد نامہ "، " جانشین، قلم سرخ رو ہے، اب کس کا جشن مناتے ہو ، جیسی نظمیں جمالیاتی تکمیل کی نادر مثالیں ہیں، ان نظموں میں قلم اور قلم کی حرمت کا پرچم نظر آتا ہے

30"

احمد فراز کے پہلے مجموعے تنہا تنہا میں شامل پہلی نظم "شاعر" درباری شاعری سے انحراف کی روایت کا سراغ دیتی ہے، اس نظم کے شروع میں فراز واحد متکلم کے پردے میں فنکار کی بے حسی کو بیان کرتے ہیں۔

دنیا نے تڑپ کر مرے شانوں کو جھنجھوڑا
لیکن مرا احساس غمِ ذات میں گم تھا
آتی رہیں کانوں میں المناک پکاریں
لیکن میرا دل اپنے ہی حالات میں گم تھا
میں وقت سے بے گانہ زمانے سے بہت دور
جام و مئے و مینا و خرابات میں گم تھا"

(تنہا تنہا)

احمد فراز کو اس بات کا احساس ہے کہ ہم غم ذات میں مبتلا ہیں دنیا سے کٹے ہوئے انسانیت کی بھلائی سے کوسوں دور ہیں۔ یہ نظم ان کی انقلابی شاعری کا پہلا منشور ہے، ایک بند میں وہ دورِ ملوکیت کے شاعر کو سلاطین و ملوک اور امراؤ روسا کی تفریح کا سامان فراہم کرنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں

دربار کی تفریح کا ساماں تھا مرا فن
ہاتھوں میں مرے ظرفِ گدا لب پہ غزل تھی
شاہوں کی ہوا خواہی مرا ذوق سخن تھی
ایوانوں کی توصیف و ثنا اوج عمل تھی
اور اس کے عوض لعل و جواہر مجھے ملتے
ورنہ مرا انعام فقط تیغ اجل تھی

عام طور پر فن کار یا تخلیق کار عام لوگوں سے زیادہ حساس ہوتا ہے وہ بہت پہلے اپنے ارد گرد کے ماحول کے اثرات اور اپنے لوگوں کے دکھ درد کو محسوس کر لیتا ہے اسی طرح شاعری کا محور بھی وہ معاشرہ ہوتا ہے جس میں اس کا خالق زندگی گزارتا ہے چنانچہ اس کی شاعری، اس پورے معاشرے کی عکاسی کرتی ہے جس میں پیار و محبت دکھ درد ظلم و ستم اور زیادتی و ناانصافی ہے اور جب بھی کسی بھی دور میں ناانصافیاں، زیادتیاں اور ظلم و جبر حد سے گزر جاتا ہے تو سچا ادیب یا شاعر اپنا فرض سمجھتا ہے کہ وہ اپنے قلم سے لوگوں کو جگائے اور مظالم کے خلاف آواز بلند کرے، اور اپنے مظلوموں کو انصاف دلانے کے لئے اپنے قلم کا استعمال کرے، اپنے قلم کے لئے اس کو ہر حال میں سچائی کا راستہ چننا چاہئے خواہ اس کو کسی بھی طرح اس سچائی کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے، کیوں کہ اس کا قلم عوام کی امانت ہے، سچائی کا یہی راستہ احمد فراز نے اپنایا، اس پُر آشوب دور میں احمد فراز نے اپنی عوام کے دکھ درد کو شدت سے محسوس کیا۔ شاعر اور ادیب انسانی معاشرے کو خیر و امن سے ہمکنار کرنے کے لئے اپنے خون جگر میں انگلیاں ڈبو کر اشعار لکھتا ہے، حسنِ جاناں کی رعنائی سے وہ اپنی جمالیاتی حس کو زندہ رکھتا ہے اور دنیا کی تاریکی کی عکاسی سے وہ ہمیں سامراجیوں اور استحصالی طبقوں کی سفاکی سے آگاہ کرتا ہے کہ کس طرح انھوں نے تیسری دنیا کے محنت کش عوام کو ناداری، جہل اور بدحالی کے جہنم میں ڈھکیل رکھا ہے، چنانچہ فراز اپنی نظم "فن کاروں کے نام" میں طبقاتی نقطۂ نظر کے حامل اور حق گو شاعروں اور فنکاروں پر جابر حکمراں طبقوں کے مظالم اور زبان بندی کی اذیتوں کی ایک گمبھیر تصویر کھینچتے ہیں اور کہتے ہیں

تم نے شہکار خون جگر سے سجائے

اور اس کے عوض ہاتھ کٹوادئے

تم نے دنیا کو امرت کے چشمے دکھائے

اور خود زہرِ قاتل کے پیالے پئے

(فنکاروں کے نام۔ درد آشوب۔ ص 12)

فراز اس نظم میں بڑی وضاحت سے بتاتے ہیں کہ شاعر اور ادیب کوئی پیغمبر نہیں تھے کہ لوگوں کو پند و موعظت کی تلقین کریں، انھوں نے تو دنیا والوں سے دنیا کی باتیں کیں اور لوگوں کو ان کے دکھوں کا پس

منظر دکھایا، جہاں لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقوں کے ہاتھ عوام کے لئے دکھوں کا جال بن رہے تھے، فراز کے اس بیان میں کتنی صداقت ہے کہ شاعروں اور فنکاروں نے عوام کو ان کے دکھوں کے اسباب بتائے لیکن انھیں سچائی کے عوض زندانِ مقتل میں لایا گیا اور پھر یہ کتنی بڑی حقیقت ہیکہ استحصالی طبقوں کی سنگ دلی پہلے کی طرح آج بھی خوں ریز ہے

تم پیمبر نہ تھے عرش کے مدعی

تم نے دنیا کی باتیں کہیں

تم نے دکھتے دلوں کی مسیحائی کی

اور زمانے سے تم کو صلیبیں ملیں

کاخ و دربار سے کوچۂ دار تک

کل جو تھے آج بھی ہیں وہی سلسلے

(فنکاروں کے نام، دردآشوب ص:12)

احمد فراز نے ہمیشہ ایسی جمہوریت کی مذمت کی جہاں عام آدمی بادشاہ وقت کے سامنے فریاد لیکر نہ جا سکے، غریب بھوک سے مرے اور بادشاہ وقت اپنی رنگ رلیوں میں مصروف رہیں، وہ اس انبوہِ عاشقاں کے قائدین میں سے تھے جو شمع جمہوریت پر نثار ہوا۔

چمن میں جشنِ ورود بہار جب بھی ہوا

وطن میں جب بھی فروزاں ہوئے خوشی کے دئے

رہی ہے بوالہوسوں کے سبوں میں بادۂ ناب

بلا کشانِ وفا نے لہو کے گھونٹ پیئے

مہہ و نجوم رہے بزم شہریاراں میں

نگاہ خلق ترستی رہی کرن کے لئے

نظر اٹھا کے نہ دیکھیں کوئی مرے کہ جیئے۔ (تنہا تنہا، ص 163)

فراز کے خیال میں جمہوریت کے راگ الاپنے والے دراصل مغرب کے پٹھو ہیں، ان کے خیال میں جن لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور آئی ہے وہ متحدہ ہندوستان میں رہ کر بھی مغرب کے سوداگروں سے ملکر عوام کو بے وقوف بناتے رہے اور آزادی کے بعد بھی یورپ کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔

آشوب گہہ دہر کے سوداگر ہیں

مغرب کے کسی شہر کے سوداگر ہیں

تم آب حیات مانگتے ہو ان سے

جو لوگ فقط زہر کے سوداگر ہیں

(تنہا تنہا ص:104)

احمد فراز ملوکیت کے بھی سخت خلاف ہیں، پاکستان کے قیام کے بعد انھوں نے دیکھا کہ کچھ قوتیں جمہوریت کے بھیس میں ملوکی نظام رائج کرنا چاہتی ہیں "ملوکیت اس طرز حکومت کو کہتے ہیں جہاں کسی ایک فرد واحد کی بادشاہت ہوتی ہے، اسی ایک فرد واحد کے حکم و اشارے پر سارے احکامات صادر ہوتے ہیں یہاں جس کی لاٹھی اسی کی بھینس کے مترادف کاروائیاں ہوتی ہیں، ملوکیت میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اوروں کو بھی اپنی مرضی سے جینے کا حق حاصل ہے۔" **نظم بانو کے نام"** میں فراز نے ملوکیت اور فردِ واحد کی بادشاہت اور مطلق العنان بادشاہوں کے خلاف رد عمل کا اظہار کیا ہے، یہ نظم "کنیز" اور کنیز محل کے عنوان سے مختلف رسائل میں شائع ہوئی نظم کا کردار ایک کمسن کنیز ہے جسے بیگم جونا گڑھ نے قتل کروادیا، جس کی خطا صرف یہ تھی کہ اس نے کئی تلخ راز تک رسائی حاصل کرلی تھی، یہ پاکستان کے قیام کے فوری بعد کا واقعہ ہے جب نواب جونا گڑھ کی بیگم نے اپنی کم سن کنیزہ کو سفاکی کے ساتھ قتل کردیا تھا اور جرم ثابت ہونے پر حکومت کی ایما پر عدالت نے اس کو صرف عدالت برخاست ہونے تک کی سزا سنائی تھی، صرف اس وجہ سے کہ ان کے شوہر نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا تھا، چنانچہ پرتو روھیلہ کہتے ہیں،

"اس وقت بھی فراز بہت کم عمر تھے پاکستان کے ہزاروں شا عروں کے انبوہ میں منفرد شخص تھے جو عدالت کے اس فیصلے کے خلاف ان الفاظ میں نعرہ زن ہوئی"[31]

اس حوالے سے شہباز نقوی بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں

"ایک مرتبہ کراچی میں ایک المناک حادثہ رونما ہوا تھا کہ ایک سابق شہزادی نے ایک گھناؤنا جرم چھپانے کے لئے اپنی ملازمہ جو اس کے جرم کی چشم دید گواہ تھی کو اذیت دے کر ہلاک کر دیا تھا، اس موضوع پر احمد فراز کی نظم نے دنیا بھر میں تہلکا مچادیا "[32]

فراز اس کمسن سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ایک طرف ملوکیت کا پردہ چاک کرتے ہیں تو دوسری طرف عورتوں کے حق میں آواز بھی اٹھاتے ہیں، وہ ایک سربلند اور آزاد انسان کی حیثیت سے ہر اس بات پر احتجاج کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جو احترامِ انسانیت کے خلاف ہو، لہذا وہ ایک بے نوا اور مظلوم لڑکی کی موت پر بھی تڑپتے ہیں مذکورہ نظم کے بارے میں فراز کا خود کہنا ہے کہ

"ہندوستان میں ایک کنیز کو جونا گڑھ کے ایک نواب نے اذیتیں دیکر مارا تھا۔ ان دنوں ایک نظم لکھی تھی، جس میں ساری عورتوں کے کرب اور محرومی کا ذکر آیا تھا۔۔۔جب مقدمہ چل رہا تھا تو میں نے چند لائنیں لکھیں لیکن نظم نہ لکھ سکا لیکن جب مقدمہ کا فیصلہ ہوا تو دوبارہ تحریک ہوئی اور میں نے عدالتوں اور معاشرے کے Attitude پر قلم اٹھایا۔ عورت، عورت پر ظلم کرتی ہے، مختلف Class کی وجہ سے سماجی رتبہ کی وجہ سے"[33]

فراز نے جب یہ نظم کراچی کے ایک مشاعرے میں پڑھی تو مشاعرے کے اختتام پر کچھ لوگ ان سے ملنے آئے جن میں اس کمسن کنیزہ کے والد بھی موجود تھے۔ انھوں نے فراز سے کہا کہ آپ نے یہ نظم لکھ کر میری بچی کو زندہ جاوید کر دیا، نظم "بانو کے نام" میں فراز کچھ اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

ملوکیت کے محل کی گناہ گار کنیز"

وہ جرم کیا تھا کہ تجھ کو سزائے مرگ ملی

وہ راز کیا تھا کہ تعزیر ناروا کے خلاف۔

تری نگاہ نہ بھڑکی تری زباں نہ ہلی

یہی سنا ہے بس اتنا قصور تھا تیرا

کہ تو نے قصر کے کچھ تلخ بھید جانے تھے

تجھے یہ علم نہیں تھا کہ اس خطا کی سزا

ہزاروں طوق و سلاسل تھے تازیانے تھے

(تنہا تنہا ص43)

اس نظم میں فراز ملوکیت کا جائزہ عالمی تناظر میں لیتے ہیں اور عالمی سطح پر جہاں جہاں بھی ملوکیت نے ظلم و ستم کی داستان رقم کی ہے ان کے خلاف رد عمل کا اظہار کرتے ہیں' وہ بانو سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

یہ رسم تازہ نہیں ہے اگر تری لغزش مزاج قصرِ نشیناں کو ناگوار ہوئی

ہمیشہ اونچے محلات کے بھرم کے لئے ہر ایک دور میں تزئین طوق و دار ہوئی

کبھی چنی گئی دیوار میں انار کلی کبھی شکنتلا پتھراؤ کا شکار ہوئی

(تنہا تنہا ص44)

فراز کے خیال میں حکومت کے پروردہ لوگ خود کو خدا سمجھنے لگتے ہیں

تھا کل تو ایک نعرہ منصور بھی گراں اور اب کہ سیکڑوں ہیں خدا دیکھتے رہو

(تنہا تنہا ص97)

آدمی کو خدا نہ دکھلائے آدمی کا کبھی خدا ہونا

(تنہا تنہا ص137)

"بانو کے نام" کے تحت اس بات کا تذکرہ بھی آیا کہ فراز عورتوں کے حق میں بھی آواز اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں، تو آیئے اس حوالے سے تھوڑی تفصیل کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ فراز کے یہاں عورت کا تصور کس طرح کا ہے۔ فراز کا عشقیہ تجربہ خاصا متنوع ہے۔ وہ عشقیہ شاعری میں بھی ترقی پسند نظریات کے حامل نظر آتے ہیں، چنانچہ وہ محبت کے تجربات کا حقیقت پسندانہ اظہار کرتے ہیں، اور عورت سے وفا کا تقاضہ بھی اس لئے کرتے ہیں کہ عوام میں دھوکہ کا خاتمہ ہو اور محبت کا بھرم باقی رہ سکے

قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے"

دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چہرے ہوتے۔

خلقت شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لئے۔

اب یہی ترک تعلق کے بہانے مانگے

اپنا یہ حال کے جی ہار چکے لٹ بھی چکے

اور محبت وہی انداز پرانے مانگے۔

فراز نے باطل قوتوں کے خلاف ہمیشہ عوام سے بھی یہ مطالبہ کیا کہ ان کے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر ظالم اور جابر کے خلاف نبرد آزما ہوں، انھوں نے ہمیشہ اس امید پر عوام کو پکارا کہ وہ ان کا ساتھ دیں گے، لیکن جب ان کو عوام کے حوصلے پست نظر آئے اور ان پر خاموشی کا عالم طاری رہا، تو

انھوں نے عوام کی اس بے جا خاموشی کو بھی للکارا۔ کیوں کہ فراز خود ظلم و جبر پر خاموش نہیں رہ سکتے تھے بلکہ ظلم و جبر کے خلاف ہر محاذ پر آواز اٹھاتے رہے۔

وہم تھا قافلہ ہم سفر اں

مڑ کے دیکھا تو کوئی ساتھ نہ تھا

(تنہا تنہا ص90)

زندہ در گور ہوئے اہل نظر،

کس قدر مردہ پرستی ہے یہاں

(تنہا تنہا ص95)

کیا توقع کریں زمانے سے،

ہو بھی گر جراتِ سوال ہمیں

(تنہا تنہا ص159)

اس شہر میں ہر جنس بنی یوسف کنعاں،

بازار کے بازار بڑی دیر سے چپ ہیں

(تنہا تنہا ص70)

فراز ہر قسم کے حالات میں عوام کو عزم و حوصلہ کے ساتھ جینے کی امید دلاتے ہیں ان کے خیال میں ظلم و جبر کا وقت ہمیشہ نہیں رہتا، ضرورت اس امر کی ہے کہ جبر کے ماحول میں صبر و تحمل سے کام لیا جائے اور اچھے وقت کے لئے پر امید رہا جائے انھیں امید ہے کہ عوام کی فریاد ضرور رنگ لائیگی اور ظلم کے اندھیرے ایک دن ضرور چھٹ جائیں گے۔

اتنا بے رنگ دکھ نہیں جانئے ہر رگِ جاں شعاعِ بدن کھوئے گی

لوگ پھر سے اچھالیں گے اپنا لہو اور گلگوں قبائے وطن ہوئے گی

تم نے ہونٹوں پہ مہریں لگا دیں تو کیا تم نے شمعیں نوا کی بجھا دیں تو کیا

جو حکایت سنی ان سنی ہو گی، اب وہی انجمن۔انجمن ہوئے گی

(جاناں جاناں ص139)

فراز کی ترقی پسند شاعری پر جب ہم بات کریں گے تو لازمی طور ہر جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء پر مشتمل شاعری کا ذکر کیا ہی جائیگا کیوں کہ عام لوگوں کے مقابلہ میں ترقی پسند اس مارشل لاء کے کچھ زیادہ ہی مخالف تھی۔یہی وجہ تھی کہ ترقی پسندوں پر نظر بھی سخت رکھی جاتی تھی، کیوں کہ یہ عہد، عہد ضیائی تھا اور ترقی پسند زیرِ عتاب تھے، فکر محبوس مقتل آباد تھے فراز کے تین، شعری مجموعے (1) بے آواز گلی کوچوں میں۔(2) نابینا شہر میں آئینہ، اور (3) اور پس اندازِ موسم۔مارشل لاء کے زمانے میں ہی شائع ہوئے، ان تینوں شعری مجموعوں میں ضیائی مارشل لاء کے خلاف شدت سے آواز اٹھائی گئی، ویسے تو فراز ہر آمر وقت سے بر سرِ پکار رہے، لیکن، جنرل ضیاء الحق کے ساتھ ان کی چپقلش میں زیادہ شدت نظر آتی ہے، اس حوالے سے وہ کہتے ہیں۔"ضیاء الحق کی آمریت کے خلاف میں نے صرف نظمیں ہی نہیں، بلکہ میں نے اہتمام وانتظام بھی کیا، جلوسوں، جلسوں کا" دراصل جنرل ضیاء الحق کا مارشل لائی دور عوام اور پاکستان کے حق میں انتہائی بدترین ثابت ہوا، عوام کو اپنے حقوق سے محروم کیا گیا، میڈیا کو دبایا گیا، ادیبوں اور دانشوروں کی زبانوں پر تالے لگا دیئے گئے، اپنی ناجائز پالیسیوں کو جائز ثابت کرنے کیلئے، مذہب کی من چاہی تفسیر و تشریح اور من پسند فتوے صادر کرنے کے لئے دربا ری مولوی بٹھائے گئے، جبری طور پر نماز اور زکوۃ کی ادئیگی کے احکامات جاری کر دیئے گئے۔عرفا ن احمد لکھتے ہیں۔

"احمد فراز نے ایک ایسے معاشرے اور آمرانہ نظام
ملوکیت کی سرزمین سے صدائے احتجاج بلند کی جہاں
کی سماعتیں بہری اور بصارتیں اندھی ہو چکی
تھیں، جہاں سنگینوں میں پروے ہوئے بچے اور نیزوں

پر سجے ہوئے جوان سروں کو دیکھ کر قتل ہونے والوں

اور کرنے والوں کے نام پوچھنا بھی سنگین جرم تھا، ایسا

کرنے والوں کی وفاداریاں مشکوک ہو جاتی تھیں ،

جہاں کی بستیوں میں برف باری ہوتی تو ہاتھ تاپنے کے

لئے گھر ہی جلا دیئے جاتے اور بارشوں میں موسم بہار

کے کچھ رنگ دھل کر خزاں رسیدہ ہو جاتے ہیں"[34]

پاکستانی عوام کے لئے یہ دور سب سے اذیت ناک، دردناک، گھٹن، انتشار اور افراتفری کا دور تھا، اس میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے جنھوں نے عام آدمی کو چپ سادھ لینے پر مجبور کیا، اور ڈر اور خوف کچھ اس طرح دلوں میں بیٹھ گیا کہ فردِ واحد کے خلاف زبان کھولنے والا واجب القتل سمجھا جانے لگا، لوگوں کو اپنی موت قریب سے دکھائی دینے لگی۔ "سانحہ اور جڑی کیمپ" بھٹو کی پھانسی، خود فراز کی قید تنہائی اور صوبہ بدری یہ وہ سارے واقعات تھے، جنھوں نے فراز کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ "پیشہ ور قاتلو" اور "محاصرہ" جیسی نظمیں لکھیں، ملک پاکستان میں چاروں طرف دہشت کا دور تھا، جگہ جگہ قا ئم سرسری سماعت کی فوجی عدالتیں، احتجاج کرنے والے کارکنوں کو سربازار

کوڑوں کی سزائیں دیرہی تھی سیاسی جماعتوں پر پابندی تھی" آمریت کے اس ماحول کے حوالے سے احمد فراز ایک انٹرویو میں کہتے ہیں

"آپ کی مراد ڈکٹیٹرشپ سے ہے، جہاں ظاہر ہے ما

حول گھٹن زدہ ہوتا ہے لوگ گفتگو بھی محتاط کرتے

ہیں، تخلیق کاروں کا اجتماع بھی حکومت کو کھٹکتا ہے،

بعض مواقع اور جگہوں پر اجتماعات کی اجازت بھی

نہیں ہوتی "[35]

حوالہ جات

1. روشنائی، سجاد ظہیر، ص125
2. حسرت موہانی، بحوالۂ محمد علی صدیقی، روشنای کیوں پڑھی جائی، مشمولہ روشنائی۔ ص:22
3. رشید امجد، اردو میں مزاحمتی ادب کی روایت مشمولہ اردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے رویے۔ ص:59
4. فارغ بخاری البم۔ ص100
5. احمد فراز سے انٹرویو، ریڈیو پاکستان راولپنڈی، مشمولہ "ماہ نو" احمد فراز نمبر ص:282
6. احمد فراز کی شاعری نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار ص:36
7. حماد غزنوی کا فراز سے انٹرویو۔ مشمولہ احمد فراز شخصیت اور فن، زیتون بانو، تاج سعید، ص:46
8. رضا ہمدانی، جھلکیاں، ادبیات (احمد فراز نمبر) ص24
9. احمد فراز کی شاعری، نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار، پروفیسر فتح محمد ملک، ص100
10. رضا ہمدانی، جھلکیاں، ادبیات (فراز نمبر) ص:27
11. احمد فراز کی یاد میں، قمر رئیس، مشمولہ کتاب بیاد احمد فراز ص28
12. ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ کا احمد فراز سے مکالمہ، مشمولہ کتاب بیاد احمد فراز ص302
13. مسعود مفتی۔ اور پھر وہ بھی زبانی میری، مشمولہ فنون لاہور، شمارہ چار، جولائی دسمبر 1993 ص:102
14. فیاض اعوان کا فراز سے انٹرویو، مشمولہ احمد فراز فراز شخصیت اور فن مرتبین زیتون بانو، تاج سعید ص:453
15. گلزار جاوید کا فراز سے انٹرویو، بعنوان براہ راست، مشمول:ہ ماہنامہ چہار سو (فراز نمبر) ص:13-14
16. اعتبارات۔ تنقید۔ ص158
17. شمیم اکرام الحق، احمد فراز کی شخصیت، مشمولہ ماہنامہ، عکاس (احمد فراز نمبر) ص: 75
18. ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ کا احمد فراز سے مکالمہ، مشمولہ کتاب، بیاد احمد فراز ص200
19. سید ضمیر فروش کا فراز سے انٹرویو، بشمولہ ہفت روزہ معیار، کراچی ماہنامہ ادبی ایڈیشن دسمبر 1991
20. احمد فراز سے خصوصی گفتگو، شریک گفتگو، فیضان عارف، مشمولہ کتاب بیاد احمد فراز ص:176
21. احمد فراز سے خصوصی گفتگو، شریک گفتگو، فیضان عارف، مشمولہ کتاب۔ بیاد احمد فراز، ص179
22. "احمد فراز میں کیوں لکھتا ہوں، مشمولہ ادبیات، فراز نمبر ص258

23. ابرار احمد، مزاحمتی ادب، ص:48

24. احمد فراز سے خصوصی گفتگو، شریکِ گفتگو، فیضان عارف، کتاب بیاد احمد فراز ص،179

25. احمد فراز سے خصوصی گفتگو، شریک گفتگو، فیضان عارف، کتاب، بیاد احمد فراز ص:166

26. احمد فراز سے خصوصی گفتگو، شریک گفتگو، فیضان عارف، کتاب بیاد احمد فراز، ص:166

27. ڈاکٹر روبینہ ناز، اک طلسم خوش جمال، کتاب، بیاد احمد فراز، ص:105

28. احمد فراز یادوں کا ایک سنہرا ورق۔ڈاکٹر اشفاق حسین، ص:103

29. کوئی مارشل لا، مجھے حق بات کہنے سے نہیں روک سکا، از صائمہ عمران، ماہ نو احمد فراز نمبر جنوری2009

30. اردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے رویے، مرتب، ارتضیٰ کریم ص:19

31. پرتو روھیلہ شہر سخن آراستہ ہے، مشمولہ کتاب، بیاواحمد فراز ص75

32. (شہاز نقوی، احمد فراز کی شاعری کی دھنک فرنگ شمولہ، ماہِ نو فراز نمبر ص667

33. اشفاق حسین، یادوں کا ایک سنہرا ورق، ص77

34. عرفان احمد، احمد فراز، مشمولہ امکان احمد فراز نمبر5

35. (ماہ نامہ چہار سو فراز نمبر ص13)

تیسرا باب

احمد فراز بحیثیت جدید شاعر

جدید اردو شاعری کسی بندھے ٹکے فارمولے اور اصول کی پابند نہیں، یہ فنکار اور فن کی آزادی میں یقین رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ فن اور موضوع کی سطح پر اس میں کافی وسعت دیکھنے کو ملتی ہے۔ جدید شاعری نے روایتی شاعری میں پروان چڑھنے والی کثافت، ابتذال، خیال کی پستی اور بے اعتدالی سے گریز کیا، جدید شاعری میں فروغ پانے والی غزل میں حقیقت و اصلیت، صداقت و واقعیت کو اہمیت دی گئی، اور مروجہ شاعری میں رائج تصنع کو نظر انداز کیا، اس طرح قدیم عشقیہ شاعری اور جدید شاعری کے عشقیہ تصورات میں بڑا فرق محسوس ہوتا ہے جدید شاعری کے سماجی شعور نے عشق کی جذباتیت کو کم کیا اور غمِ جاناں کے بجائے غمِ دوراں کو اہم موضوع ٹھہرایا۔

چونکہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور زندگی میں آنے والی تبدیلیاں ادب پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں یہ اثرات تہذیبی و معاشرتی رابطوں اور علمی و ادبی رشتوں کا فطری اور ناگزیر نتیجہ ہوتے ہیں جس کی بدولت ادب میں جمود کی فضا ختم ہوتی ہے اور متاثرہ ادیبوں کا فکری پس منظر اور ذہنی افق وسیع ہوتا ہے چنانچہ چالیس کی دہائی میں دنیا دوسری جنگ عظیم کی تباہی کے نتیجے میں بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہو رہی تھی ہندوستان کے حالات سازگار نہ تھے، اور پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی قتل و غارت گری اور

لوٹ مار کا ایسا بازار گرم ہوا کہ انسانی اقدار تہہ وبالا ہو کر رہ گئیں، تنہائی، بے گھری۔ اجنبیت، خوف، موت، مایوسی اور بے گانگی وغیرہ ایسے کئی پہلو ہیں جو اردو شاعری میں وجودی مباحث کا باعث بنے، ساٹھ کی دہائی کی شاعری تشکیک، یاسیت اور الم پرستی سے عبارت ہوئی ان عوامل کے پس پردہ دگر گوں سیاسی، سماجی حالات اور ان کے اثرات کی کار فرمائی شامل ہے جو مغربی افکار سے آگہی کی بنا پر سائنسی تعقل کے فروغ کا باعث بن رہے تھے، منطقی اثباتیت پسندوں نے مابعد الطبعیات کا رد کر دیا تھا، نفی و تشکیک کا شکار فرد اپنی ہی ذات کی بھول بھلیوں میں گم تھا، جس کا ماضی بین الاقوامی سطح پر دو عظیم جنگوں اور مقامی سطح پر 1947 کے خوں آشام فسادات سے عبارت تھا اس کے بعد کا دور صنعتی ماحول کا پروردہ دور تھا جس میں فرد کی فرد سے دوری بڑھ رہی تھی۔ گویا کہ دوسرے لفظوں میں مغربی فکر کی بنیاد پر دیکھا جایئے تو ساٹھ کی دہائی کے نمائندہ شعراء کا فن ماضی کی روایت سے یکسر مختلف اور نیا تھا۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی ہولناک تباہی نے اجتماعی موت کے ایک ایسے المناک احساس سے دوچار کیا جس کی جڑیں اس کے وجود میں پیوست ہو گئیں ہیں ان عالمی جنگوں کے اثرات سے تنہائی، مایوسی، احساس کمتری، ماورائیت، شخصیت اور روح کی گہرائیوں کو ناپنے کی خواہش، زندگی کا کرب آمیز احساس وغیرہ جو تصور ابھرا اس کو جدید شاعری نے مزید گہرا کیا، جدید شعراء ادباء اور فلسفیوں کا ایک ایسا گروہ تیار ہوا جس نے ان سارے مسائل کو اپنے نظریاتی صیغہ اظہار کا ذریعہ بنایا، اس لئے یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ جدید شاعری کا کینوس عالمی جنگوں کی تخریب کاری کے ارد گرد پھیلا ہوا ہے۔ اس پس منظر میں اردو کی جدید شاعری کی رویات میں زبان وبیان کی سطح پر کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جدید شاعر کسی دبستان سے وابستہ نہیں رہا بلکہ اس کی انفرادیت قائم ودائم رہی۔ شاعر کی زندگی کے احساسات و تجربات کے حوالے سے اسکی فکر ہمیشہ یکساں نہیں رہتی اور نہ ہی کوئی تجربہ اور تخیل تخلیقی عمل کے سبب ساکن وجامد رہتا ہے اسی وجہ سے جدید شاعر میں نشیب فراز دکھائی دیتا ہے۔ جدید شاعر نے ہر فرد کے طبقے اور فرد کے چہرے سے نقاب ہٹا کر اس کے باطن میں جھانک نے کی سعی کی ہے۔ جدید شاعری جدید ذہنی کیفیات اور طرز احساس کی بیداوار ہے اس لئے جدید شاعری میں ہمیں ایک نئ فضا ملتی ہے۔ جدید شاعری میں جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے۔ اس میں پرانے موضوعات بھی پائے جاتے ہیں اور نئے

بھی۔ پرانے موضوعات میں عشق کا موضوع جدید شاعری میں پایا جاتا ہے لیکن نئے انداز میں کیونکہ جدید عشق کے موضوع میں ویسی ماورائیت، روحانیت اور رومانیت نہیں جیسی کہ کلاسیکی شاعری میں ملتی ہے۔ جدید شاعری میں عشق کی پہچان اس کی ارضیت مادیت اور واقعیت ہے جو آج کے معاشرہ کی دین ہے یہی وجہ ہے کہ آج عشق کی پیش کش کا وہ انداز جو پہلے مروج تھا تقریباً متروک ہو چکا ہے اور یہ عشق تخیلی نہیں بلکہ ایک انسان سے دوسرے انسان کا عشق ہے جس میں وصل بھی ہے اور ہجر بھی، آرزو بھی ہے اور رومان بھی، جوش بھی ہے اور تڑپ بھی۔ اس کا اظہار تمام جدید شعراء کے یہاں ملتا ہے لیکن اس باب میں سب کی اپنی اپنی انفرادیت مسلم ہے۔

تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا

دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

جس کو چاہا ہے اسے شدت سے چاہا ہے فرازؔ

سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے درد کی زنجیروں کا

جدید دور میں "احساس تنہائی" کو شعوری طور پر برتا گیا ہے۔ اور اکثر جدید شاعروں کے یہاں احساس تنہائی ہر دور میں شاعروں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے لیکن پہلے کے شاعر کی تنہائی جدید شاعر کی تنہائی سے مختلف ہے۔ پہلے شاعر کی تنہائی اس کی ذات سے متعلق تھی اور کبھی کبھار وہ اسے سکون کا سامان بھی مہیا کرتا تھا لیکن آج اس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ زر پرست معاشرہ میں احساس تنہائی کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ موجودہ دور میں انسان دولت کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا جس کی وجہ سے انسانی رشتوں میں زہر گھل گیا ہے۔ آج کا انسان جس معاشرہ میں رہتا ہے وہ بہت ہی ہنگامہ خیز اور کرب انگیز ہے۔ اور ایک فرد اس سماج کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اس سے جدا ہے اور اپنی ذات میں مقید ہے لہذا انسان اپنے ہی حصار میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ آج کا انسان چلتا تو ہے لیکن منزل کا پتہ ہی نہیں۔

کوئی رہبر بھی نہیں، کوئی دوست بھی نہیں وہ اپنی راہ کا انتہائی مسافر ہے۔ اپنے ہی گھر والوں کے بیچ میں رہ کر ان سے بیگانہ ہے ۔ یہ بیگانگی کبھی کبھی غصّہ ، نفرت طنز اور انتقام کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔احساسِ تنہائی کے بہاؤ میں ایک طرح کا عدم تحفظ کا احساس بھی ہوتا ہے۔۔ یعنی معاشرہ میں فطری یا آزاد زندگی بسر کرنے کی ضمانت ہی نہیں رہی۔ اس کے ساتھ ہی بے چہرگی 'ہجرت 'بے گھری اور در بدری وغیرہ شامل ہے۔ احساس تنہائی کو تقریباً سبھی جدید شعراءنے اپنا موضوع بنایا۔

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ

بس ایک فرآز تھا ظالم سے چپ رہا نہ گیا

احمد فراز کی جدید شاعری کا احاطہ کرتے وقت انیسویں اور بیسویں صدی کے مروجہ افکار و نظریات سے قطع نظر کرنا ممکن نہیں کیوں کہ انھیں فلسفیانہ افکار و نظریات کے استحکام یا ردِ عمل کے طور پر جدید شاعری کی لہروں کا ظہور ہوا

جدید شاعری کی فکری بنیادیں مستحکم کرنے میں علم نفسیات کے عروج وارتقاءنے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے، اس علم نے جس شد و مد کے ساتھ ترقی کے مدارج طے کئے اور مقبولیت حاصل کی وہ فقید المثال ہے ، شروع شروع میں لوگوں نے اس کو تشکیک کی نظر سے دیکھا مگر بعد میں " تحلیلِ نفسی " کے طلسمہائے فریب کے جال کے اس قدر شکار ہوگئے کہ اخلاق، انسانی قدر اور مذہب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جنسیات کی لاینحل گتھیاں سلجھانے میں محو ہوگئے۔ جس سے انسان کے نفسیاتی وجود جس کو ہم روحانی وجود کہتے ہیں اس پر کاری ضرب لگی۔

جدید شاعری کا اہم مسئلہ بیسویں صدی کی مادیت پرستی اور سائنسی ایجادات کے منفی اثرات ہیں ، انیسویں صدی کے برعکس جو انسان کے لئے تیقن اور اعتماد کا عہد تھا بیسویں صدی تشکیک کا زمانہ تھا اس نئے دور کی تیز رفتار رنگ بدلتی قدروں نے جو افراتفری پیدا کی جس سے وہ بنیادیں کمزور پڑ گئیں جس پر پرانے ادب کی عمارت مستحکم تھی، دم توڑتی قدروں کے ساتھ ساتھ بے شمار پرانی روایتیں، علامتیں اور اور الفاظ بھی مر گئے اور انسان ایک ایسی دنیا میں زندہ رہنے پر مجبور ہو گیا جس میں ایک طرح کی

قنوطیت، ذاتی وابستگی، اجنبیت اور احساسِ محرومی کا شدید کرب والم ہے۔ اس تمہیدی گفتگو کے تناظر میں احمد فراز کی جدیدی شاعری کا جائزہ لیا جائیگا

فراز کا شعری شعور بھی بیسویں صدی کے درمیانی دور کی پیداوار ہے اور یہ ایسا دور ہے جس میں عالمی اور مقامی سطح پر ہر قسم کی قدروں میں ان گنت تبدیلیاں ہوئی ہیں، انھوں نے ان ہی ہم عصر زندگی کے تلخ سماجی حقائق کو اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔ عصر حاضر نے جملہ مسائل، کرب اور جدید آرائشوں سے آراستہ زندگی کی بے کیفی فراز کو بے چین کیے رہتی ہیں وہ ایک فطری شاعر ہیں جنھیں اپنے اظہار پر قدرت حاصل ہے وہ ہر موضوع کو صاف ستھرے الفاظ اور خوبصورت علامتوں سے تاثر عطا کرنے میں یکتا ہیں۔ وہ جدید ہوتے ہوئے بھی روایت سے منہ نہیں موڑتے وہ غزل کو غزل ہی رہنے دینا چاہتے ہیں اس کی ہیئت کی تبدیلی کے خواہاں نہیں ہوتے اور اپنی غزلوں کو عصری شعور سے مزین کرتے ہیں

اے یادِ یار تجھ سے کریں کیا شکائتیں
اے دردِ ہجر، ہم بھی تو پتھر کے ہوگئے

یہ رعونت تابکے، اے دل فگاراں دیکھنا
اب گرے گا طرہ سلطاں، سرِ سلطاں سمیت

جدید شعراء میں احمد فراز کا غنائی لہجہ، موضوعات کی تازگی، علامتوں کا نکھار ہے جو جدید غزل گو شعراء میں خال خال ہی نظر آتا ہے، لیکن فراز کے یہاں یہ صفات ہر شعر میں موجود ہیں ذیل کے اشعار میں خیالات کی تازگی کے ساتھ علامتوں کا نکھار ملاحظہ ہو

اس کی محفل نہ سہی، ہجر کا صحرا ہی سہی
خواب و خوشبو کی طرح، آؤ بکھر جائیں کہیں

(احمد فراز)

پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں سے یوں نہ دیکھ مجھے
تجھے تلاش ہے جس کی وہ شخص مر بھی گیا

(احمد فراز)

اردو شاعری کے جدید شعراء میں ان کا مقام فیض احمد فیض کے فوراً بعد آتا ہے بلکہ ایک مرتبہ تو فیض نے کسی مجلس میں ان کو اپنا جانشین بھی قرار دیا تھا۔ احمد فراز دور جدید کے ان نمائندہ شاعروں میں سے تھے جنھوں نے زندگی کو محض سامان آسائش کے حصول کا نام نہیں دیا بلکہ اپنی غزلوں میں بتایا کہ زندگی حسن سیرت کا نام ہے احمد فراز کی شاعری جذباتی تہذیب، فکری ترفع اور فنی تکمیل کی عکاس ہے، ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے کہیں بھی یہ احساس دامن گیر نہیں ہوتا کہ کسی طرح کا سقم یا لچک پائی جاتی ہے بلکہ ایک مشاق شاعری کی شاعری نظر آتی ہے

تیری باتیں ہی سنانے آئے
دوست بھی دل ہی دکھانے آئے
پھول کھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں
تیرے آنے کے زمانے آئے

(احمد فراز)

ان کی شاعری میں روایت کی سچی پاسداری، اظہار کی برجستگی، فکر کی ندرت، زبان کی قدرت، اور اسلوب کی دل کشی کا منہ بولتا ثبوت ملتا ہے، فراز کو ابتدائی زمانے میں اردو کا سارا شعری سرمایہ بطور ورثہ ملا اور اس اثاثے سے انھوں نے مشقِ سخن کے دوران بھرپور فائدہ اٹھایا، یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کی شاعری ہماری شعری روایت کی جڑوں سے فکری اور فنی غذا حاصل کرتی ہے وہیں عصر حاضر کی کھلی فضاؤں میں آزادانہ سانس بھی لیتی ہے۔ جدید تر احساس مند شاعر ہونے کے ناتے ان کی شاعری میں ترقی پسند مزاحمتی، باغیانہ اور انقلابی شاعر کے وہ تمام عناصر ملتے ہیں جو ہر بڑے شاعر کی شاعری میں ملتے ہیں ایک مقام پر زاہد حسن کہتے ہیں

"معاصر شعری منظر نامے پر ایسا دوسرا کوئی شاعر نہیں
دکھائی دیتا کہ جس نے بدنِ کائنات میں سے اتنے

ریشمیں دھاگوں کو چُن چُن کر صفحۂ ہستی پر بکھیر دیا ہو

ایسے لاتعداد اشعار ہیں جو محاوروں ، استعاروں اور

تمثیلوں سے ثروت مند ہوں اور یہ سارا کچھ ان کی غزلیہ

شاعری اور شعروں اور مصرعوں تک ہی محدود نہیں

انھوں نے اپنی نظموں میں بھی منظوم تمثیلوں میں بھی

اس کا کماحقہ اظہار کیا ہے اور کیا کمال ہنر وری کے ساتھ

کیا ہے"(1)

در حقیقت فراز کی شاعری میں وہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں جن سے روشن روایات کی جدت اور سلیقہ مندی کا اظہار ملتا ہے

آج اس نے شرفِ ہمسفری بخشا تھا

اور کچھ ایسے کہ مجھے خواہش منزل نہ رہے

(احمد فراز)

ان کی اشعار میں ترنم اور غنائیت کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ترنم اور غنائیت ان کے ہم عصر شعرا کو کم ہی نصیب ہوئی ہے شہزاد احمد کہتے ہیں

"اس شعری روایت کو نبھانا مشکل نظر آرہا ہے جسے

فراز تمام عمر نبھاتے رہے وہ فنی طور پر بہت باشعور تھے

اور ان کے مضامین بھی کلاسکی ہونے کے باوجود جدید اور

ایک آفاقیت کے حامل ہیں"(2)

احمد فراز کی شاعری میں اگر ایک طرف رومانیت کے جذبے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں تو دوسری طرف وہ غمِ دوراں کے معاملات اور مسائل سے بھی غافل نہ تھے فراز نے غزل کو اس کی انتہا سے آشنا کیا اور اپنے زمانے کے ہزاروں لکھنے والوں کو فکری اور لفظی رہنمائی فراہم کی، وہ نئے لہجے میں نئے انداز سے پرانی باتیں کرنے والے اور پرانے لہجے میں نئی باتیں کہنے والے ایک ایسے جدید شاعر ہیں جو اپنے

عہد کے ہر دل عزیز اور مقبول ترین لوگوں میں سے شمار ہوتے ہیں ،احمد فراز کی غزلوں میں جدید رنگ کے اثرات دیکھنے کے لئے ہم غزل کے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں۔

یہی کہا تھا کہ مری آنکھ دیکھ سکتی ہے
سو مجھ پہ ٹوٹ پڑا سارا شہر نابینا

(احمد فراز)

ہم کو اس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

(احمد فراز)

احمد فراز نے جدید رنگ اختیار کرتے ہوئے ایسی حقیقتیں بیان کیں ہیں جن کو انسان کبھی بھلا نہیں سکتا احمد فراز کی اسی حقیقت پسندی سے آنے والے زمانے کے حالات کا اندازہ بھی لگتا ہے کیوں کہ احمد فراز زمانے کا مطالعہ کرنے کے بعد شعر کہتے ہیں گویا ان کے جدید اشعار تجزیاتی اور تجرباتی ہوتے ہیں وہ مستقبل کے حقائق بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں

زندگی کی اب نئی رسمیں بنادی جائیں گی

جسم ڈھے جائیں گے دیواریں اٹھادی جائیں گی

ایک لمحے کے لئے صدیوں کا سکوں ہو جائیگا

ایک خواہش کے لئے عمریں گنوادی جائیں گی

(احمد فراز)

احمد فراز نے اپنی غزل کے ذریعے جدید موضوعات فراہم کئے، ساتھ ہی ساتھ نئی اور تازہ تراکیب کا استعمال کر کے ان تراکیب کے موجد بھی بنے۔ در اصل فراز کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے نئی تراکیب

کے استعمال کرنے میں روایت سے رشتہ کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، روایت سے رشتہ قائم رکھنے کی بنا پر فراز کی تراکیب میں جدت اور تازگی پیدا ہوگئی چند اشعار ملاحظہ ہوں

کچھ شرابی کہ ہیں اب راہ نشیمن
رونق بزمِ مغاں تھے پہلے

(احمد فراز)

فراز ہم وہ غزالانِ دشت و صحرا ہیں
اسیر ہو کے جنھیں لوگ لائے شہروں میں

(احمد فراز)

جدید اردو شاعری میں حسن و عشق کے جذبات کا اظہار علامتی، اشاراتی اور استعاراتی اسلوب میں کافی ہوا ہے۔

ہر شاعر نے حسن و عشق کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر زمانے کی حقیقتوں کو بیان کیا ہے فراز کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ حسن و عشق کے موضوع کو محیط ہے لیکن فراز کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے حسن و عشق کے موضوع کو کبھی بھی چھچھورے پن سے نہیں بیان کیا بلکہ خلوص و صداقت کے ساتھ بیان کیا ہے، ہاں یہ ہے کہ اس خلوص و صداقت میں کہیں کہیں جذباتی انداز بھی در آیا ہے مگر وہ محبوب کے خد و خال اور حسن و خوبصورتی کو بیان کرنے میں عمدہ الفاظ کا انتخاب کر کے بڑے ہی دلکش شعری پیکر میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں

لعل سے لب چراغ سی آنکھیں
ناک ستواں جبیں کشادہ تھی
زلف کو ہمسری کا دعوی تھا
پھر بھی خوش قامتی زیادہ تھی

(احمد فراز)

تشنگی آنکھوں میں اور دریا خیالوں میں رہے
ہم نوا گر، خوش رہے جیسے بھی حالوں میں رہے
دیکھنا اے رہ نوردِ شوق! کوئے یار تک
کچھ نہ کچھ رنگِ حنا پاؤں کے چھالوں میں رہے

(احمد فراز)

احمد فراز جب اپنے محبوب کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو وہ محبوب کی خوبصورتی اور حسن کو بیان کرنے کے لئے تشبیہات و استعارات کا خزانہ لٹاتے ہوئے نظر آتے ہیں ان تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ الفاظ کے دروبست سے احمد فراز کی جدت طرازی نکھر کے سامنے آتی ہے

تری آنکھوں کو جاناں کیا ہوا ہے
کبھی دیکھے نہ تھے بیمار قاتل

(احمد فراز)

احمد فراز کی غزلوں میں جدت و ندرت کی تمام صورتوں کے ساتھ ساتھ روایت سے رشتہ بھی بحال نظر آتا ہے اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو احمد فراز کی غزلوں کے ساختیاتی پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ احمد فراز کی غزلوں میں اردو غزل کی کلاسکی اور جدید ساختوں کے تمام رنگ ملتے ہیں لیکن جب ہم احمد فراز کی غزلوں کی ساخت کی منفرد پہچان قائم کرنے اور اسے نام دینے کی کوشش کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ احمد فراز کی غزلوں کو کسی ایک ٹھوس اور جامد ساخت کے اندر قید نہیں کیا جاسکتا ہے پھر بھی کہا جاسکتا ہے کہ احمد فراز کی غزلوں کی ساخت، جذباتی ساخت ہے، گویا کہ احمد فراز اپنی غزلوں میں خارجی اور داخلی، جس طرح کے جذبات، تجربات، کیفیات اور محسوسات کا اظہار کرتے ہیں، پہلے انھیں اپنے رنگ میں رنگتے ہیں اور جذبات کے حوالے سے ہی معنی و مفہوم کیفیت اور تاثر کی تخم ریزی اپنے اشعار میں کرتے ہیں یہ رویہ احمد فراز کا عمومی رویہ ہے، اسی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ احمد فراز کی غزلوں کی ساخت کی نوعیت جذباتی ہے، لیکن احمد فراز کی غزلوں کی جذباتی ساخت سے ٹھوس معانی کا اخراج نہیں

ہوتا، بلکہ سیال، تکثیری اور متغیر معانی کا اخراج ہوتا ہے، اسی لئے فراز کے اشعار میں مضمون و مفہوم کی الگ الگ کرنیں پھوٹتی ہیں، مثلاً عصرِ حاضر کے مسائل و مصائب، ذات اور کائینات، موت اور حیات، رنج و غم، سیاست و ثقافت، ہمت و حوصلہ، فسادات، انسان دوستی رومانیت، ترقی پسندی، جدت پسندی، مذہب، مایوسی اور ناامیدی، حسن و عشق، فطرت، عوامی جذبات، وطن پرستی وغیرہ کے حوالے سے احمد فراز کے خیالات الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر کس طرح سامنے آتے ہیں اس کا اندازہ الگ الگ عنوانات سے اس طرح لگایا جاسکتا ہے۔ غم دوراں اور غم جاں کے جلوہ گری سے فراز کی شاعری کو تشخص قائم ہوتا ہے اس کے علاوہ فراز نے اپنی شاعری میں ان موضوعات کو پیش کیا ہے جن سے عصری حسیت اور معنویت کا اندازہ ہوتا ہے اور جس سے فراز کے دورِ آگہی اور بصیرت سے آشنائی ہوتی ہے

اپنی افسردہ مزاجی کا برا ہو کہ فراز
واقفہ کوئی بھی ہو آنکھ کو بھر دیتا ہے (فراز)

فراز کی جذباتی شاعری کی کچھ مثالیں ملاحظہ

حسن و عشق کے جذبات کی مثال

سامنے اس کے دکھے نرگس شہلا بیمار
روبرو اس کے بھرے سرو بھی پانی لوگو
زلف زنجیر تھی ظالم کی تو شمشیر بدن
روپ سا روپ جوانی سی جوانی لوگو

اپسرا تھی، نہ حور تھی، نہ پری
دلبری میں مگر زیادہ تھی

صورت تھی کہ ہم جیسے صنم ساز بھی گم تھے

مورت تھی کہ ہم جیسے پجاری نہیں بھولے

رنج و غم کے جذبات کی مثال

اہلِ جہاں ہماری روش سے ہیں بے خبر
ہم پیرہن دریدہ نہیں، دل دریدہ ہیں

کبھی ان لالہ قباؤں کو بھی دیکھا ہے فراز
پہنے پھرتے ہیں خوابوں کے کفن تم جیسے

شہر محبت ہجر کا موسم عہدِ وفا اور میں
تو تو اس بستی سے چلا گیا اور میں

فراز ہو کہ وہ فرہاد ہو یا کہ منصور
انھیں کا نام ہے ناکامِ آرزو جو ہوئے

(فراز)

فراز کی عصری حسیت نے ان کو اپنے زمانے کے عام لوگوں اور ان کے مسائل سے جوڑے رکھا ہے ان کے عہد کی سیاسی، سماجی اور عصری حقائق کی تصوریں، "محاصرہ"، "شہر آشوب"، نئی مسافت کا عہد"، " جانشین" قلم سرخ رو ہے" اور "اب کس کا جشن مناتے ہو" میں موجود ہیں۔
ان کے سبھی شعر ایک ایسا شعری تجربہ ہیں جہاں شاعر پوری حسیت اور لطافت کو بر قرار رکھتے ہوئے جدید روشنی کی تلاش میں سنہری وادیوں کی سیر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ تاریکی سے تیر چلانے کے روادار نہیں ہیں۔ ہر بات بھرپور اجالے میں کہی جاتی ہے۔ ان کے یہاں شدّت و شکایت جیسی متضاد باتیں نہیں ملتیں۔ کہیں کہیں وہ کسی بات سے مجروح ہوتے بھی ہیں تو اپنے زخم کو چھپانے کے لیے وہاں پھول ڈال

دیتے ہیں اور کہیں انہیں پھولوں کے درمیان کسی کے زخم اور اسکی کیفیت کو تلاشنے میں بہت دلچسپی لیتے دکھائی دیتے ہیں۔

فراز کی غزل میں عشق و محبت کی واردات، معمالات عشق کا بیان، محبوب کے حسن کی چکاچوند ملاقات، گلے شکوے، رسم وراہ، وفا و بے وفا، قول و قرار، جدائی اور وصال سب لذتیں موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ احمد فراز کی غزل حسی اور جذباتی سطح پر پڑھنے والوں پر اپنا اثر چھوڑتی ہے وہ عصر جدید میں عورت سے وفا کا تقاضا کرتے ہیں تاکہ محبت کا بھرم قائم رہ سکے اس حوالے سے فراز نے کلاسکی دائرے میں رہ کر اپنی آواز کو منفرد بنایا ہے، فراز کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

قربتوں میں بھی جدائی کے بہانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے
ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے
یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لئے
اب یہی ترکِ تعلق کے بہانے مانگے
اپنا یہ حال کے جی ہار چکے لٹ بھی چکے
اور محبت وہی انداز پرانے مانگے

(فراز)

احمد فراز دور جدید کے مقبول ترین شاعر تھے ان کی شاعری میں تنوّع، رنگارنگی، نکتہ آفرینی، اور جدتِ ادا پائی جاتی ہے، ان کی غزلوں کی بحریں دریا کی موجوں کی طرح رواں دواں ہیں انھوں نے اردو ادب کو عمدہ شاعری سے نوازا ہے، احمد فراز بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ان کی غزلوں میں باطنی زندگی کی عکاسی اور ترجمانی موجود ہے، لہٰذا ان کے یہاں فکری اور تخلیقی قوتوں کا نہایت متوازن امتزاج دکھائی دیتا ہے، کیوں کہ انھوں نے غزل کی روایتی ریزہ خیالی اور پراگندہ ذہنی کیفیات سے اپنے آپ کو ہمیشہ دور رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں جہاں جدید مضامین و افکار کی فراوانی ہے وہیں

نادر تشبیہات اور عمیق استعارات کی بہتات ہے بلکہ یوں کہنا بے جانہ ہو گا کہ ان کی شاعری میں تشبیہات کا ایک جہانِ نو آباد ہے وہ ایک وہبی شاعر ہیں ان کا شعری وجدانِ تخیل ہمہ وقت نئی وسعتوں اور اظہار کے نئے سانچوں کا متلاشی رہتا ہے ،یہی وجہ ہے کہ ان کی تشبیہات اور استعارات میں تخلیقی آب ورنگ موجود ہے۔

آخر کو ضرورت ہی خریدار کی نکلی

مریم سی وہ لعبت بھی تو بازار کی نکلی

کل ہجر کی شب روز قیامت کی طرح تھی

دن نکلا نہ جاں ہی ترے بیمار کی نکلی

(فراز)

احمد ندیم قاسمی نے احمد فراز کی غزل گوئی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے

"احمد فراز کی غزل دراصل صنف غزل کی تمام روشن روایات کے جدید اور سلیقہ مندانہ اظہار کا نام ہے ،اس کا ایک ایک مصرعہ ایسا گتھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک لفظ کی تبدیلی کی گنجائش بھی باقی نہیں چھوڑتا اس کی غزل تکمیل perfection کی انتہا ہے"(3)

بقول فراز "جدید شاعری کلاسکی روایت ہی کا ایک تسلسل ہے" محبت کے تجربات اور زاویوں میں تنوع جتنا فراز نے اردو شاعری خصوصا غزل کو دیا اس تک پہنچنا عام شاعر کے بس کا روگ نہیں فراز کے یہاں غزل کی روایت اپنے کلاسکی رچاؤ سمیت چاند کے ابھرنے کے قدیم منظر کی طرح تازہ، شگفتہ اور روشن ہے، فراز کی غزل کا چہرہ ایسا چہرہ بتایا جاتا ہے جو ہر دور میں شادابی کی نوید لیکر ابھرنے والا ہے

لعل سے لب چراغ سی آنکھیں

ناک ستواں جبیں کشادہ تھی

کچھ تو پیکر میں تھی بلا کی تلاش

کچھ وہ کافر تنک لبادہ تھی (فراز)

وہ کہیں بھی روایت سے انحراف نہیں کرتے مگر جدید اور جدت سے لبریز لب ولہجہ سے بھی انھیں گریز نہیں اردو ادب خصوصا جدید شاعری میں سفر کے تجربے کو کسی بھی شاعر نے ایک سفر نامے کے طور پر کبھی قلم بند نہیں کیا" کشان بی بی" احمد فراز کا نظمیہ سفر نامہ ایک مکمل سفر نامہ ہے پورے اختصار کے ساتھ ہونے کے باوجود مکمل لوازمات سفر نامے کے ساتھ ایک اہم تخلیقی تجربہ ہے۔اس سفر نامے میں وادئ کیلاش کے سفر نے احمد فراز کی نظموں میں ایک نیا رنگ اور نیا آہنگ بھرا ہے انھوں نے منظر نگاری اور واقعہ بیانی کے تسلسل میں کیلاش کے لوگوں کی محبتوں کا عکس بھی نمایاں طور پر دکھایا ہے۔ احمد فراز کی مذکورہ نظم داخلی وقت کے بیرونی دباؤ کی عکاسی ہے جس میں ماحول کے وقت سے شعری توانائی حاصل کرکے اساسِ شعریت کو بیدار کیا گیا ہے، احمد فراز کی یہ نظم کشان بی بی نہ صرف ایک نئے طرز کا سفر نامہ ہے بلکہ حسن کے سامنے بے بس ہو کر بتانِ آزری کے رقص بے پایاں کی لازوال مثال بھی ہے ، جہاں حسن محوِ رقص اور شاعر بے بس ہے یہی وجہ ہے کہ احمد فراز کو اردو زبان کی دنیا کے جدید ترین شعرا میں صف اول کے شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کبھی کسی موقع پر اردو شاعری کی کلاسکیت کا دامن نہیں چھوڑا۔ احمد فراز فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے کلاسکی ادب سے رچے بسے تھے وہ ارداور فارسی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔احمد فراز کی نظر روایت اور کلاسکی ادب پر بہت گہری تھی اس لئے ان کی غزلوں میں خوبصورت تشبیہوں ، استعاروں اور علامتوں کا استعمال ملتا ہے

جو کچھ کہیں تو دریدہ دہن کہا جائے
یہ شہر کیا ہے یہاں کیا سخن کہا جائے
بضد ہے تیشۂ خوُنیں لیے ہوئے کوئی
کہ گورکن کو بھی اب کوہکن کہا جائے

(بے آواز گلی کوچوں میں۔ ص:93)

فراز نے علامتوں اور استعاروں کے ساتھ اکثر خوبصورت تلمیحات کا بھی استعمال کیا ہے، جس میں واقعہ کربلا، صلیب، نعرہ منصور وغیرہ کا ذکر ان کے اشعار میں کثرت سے ملتا ہے جس کی وجہ سے ان کا احتجاجی رنگ اور بھی کھل اٹھتا ہے

تھا کل تو ایک نعرہ منصور بھی گراں
اور اب کہ سیکڑوں ہیں خدا دیکھتے رہو

(تنہا تنہا ص:64)

انھوں نے جہاں بیسویں اکیسویں صدی کی بھرپور نمائندگی کی وہیں حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا ان کی شاعری کو صرف کلاسیکی یا صرف رومانی شاعری نہیں کہا جا سکتا ہے بلکہ دورِ حاضر کے لطیف ذہنی ردِّعمل کا سچا نمونہ کہا جا سکتا ہے احمد فراز کی کلاسیکی اور جدید شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فراق گورکھپوری لکھتے ہیں

"احمد فراز کی شاعری اردو میں ایک نئی آواز اور انفرادی آواز کی حیثیت رکھتی ہے ان کے وجدان کی جمالیاتی شعور کی ایک خاص شخصیت ہے جو نہایت دل کش خدو خال سے مزین ہے ، وہ صداقت کے نئے مقامات سے اپنی باتیں رکھتے ہیں اور یہ باتیں دعوت فکر دیتی ہوئی حد درجہ دل کش و دل نشیں ہیں ان کا کلام اردو شاعری کے نئے موڑ کے کئی زاویوں کی لچک اور تھرتھراہٹیں اپنے اندر رکھتا ہے"(4)

احمد فراز کی کلاسیکی اور جدید شاعری پر ایک بندھا ٹکا تبصرہ کرتے ہوئے شاہدہ دلاور شاہ اپنے مضمون " فراز ایک ہمہ جہت شخصیت " میں یوں رقم طراز ہیں

"ان کی شاعری کو صرف کلاسیکی یا صرف رومانی شاعری نہیں کہا جاسکتا ہے بلکہ دور حاضر کے لطیف ذہنی ردِ عمل کا سچا نمونہ کہا جا سکتا ہے" (5)

فراز نے کلاسیکی شعراء کی زمینوں میں کافی غزلیں کہیں ہیں جہاں فراز کی کلاسیکی شاعری کا اندازہ ہوتا ہے تاہم کلاسیکی شعرا کی زمینوں یا ان کے طرز پر غزل کہنے میں بھی احمد فراز کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے پرانے شعرا کی نقالی نہیں کی بلکہ موضوعات میں وسعت کے امکانات کو مزید روشن کیا چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

شام سے ہی بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

(مصحفی)

کچھ آج شام ہی سے دل بھی بجھا بجھا سا
کچھ شہر کے چراغ بھی مدھم ہیں دوستو

(فراز)

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

(اقبال)

گھر سے نکلے تھے کہ دنیا نے پکارا تھا فراز
اب جو فرصت ملے دنیا سے تو گھر جائیں گے

(فراز)

احمد فراز کی کچھ شاعری کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد فراز کی شاعری، کلاسیکی شاعری سے گہرا رشتہ رکھتی ہے کیوں کہ فراز نے بعض غزلیں ایسی کہیں جس میں بھرپو کلاسکیت پائی جاتی ہے

ساتھ ہی ساتھ فراز نے میر، غالب اور اقبال کی زمینیں بھی استعمال کیں ہیں بلکہ کہیں کہیں تو بیدل کی زمیں بھی استعمال کی ہے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

بہت سیر گل اے صبا کر چلے

یہاں تک کہ دل کو قبا کر چلے

(فراز)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے

میاں خوش رہو یہ دعا کر چلے

(میر)

ہیں زخم بہت اور بھی دل پر مرے آگے

کوئی نہ کہے اس کو ستمگر مرے آگے

(فراز)

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہو تا ہے شب و روز تماشا مرے آگ

(غالب)

بیدل کے طرز میں لکھی ہوئی غزل

جنبش مژگاں کہ ہر دم، دل کشائے زخم ہے

جو نظر اٹھتی ہے، گویا، آشنائے زخم ہے

دیکھنا آئینِ مقتل، دل فگاران وفا

التفات تیغِ قاتل، خوں بہائے زخم ہے

بس کہ جوش فصل گل سے کھل گئے سینوں کے چاک

خندہ گل بھی ہم آہنگ صدائے زخم ہے

ہم نفس! ہر آستیں میں دشنہ پنہاں ہے تو کیا؟

ہم کو پاس خاطر یاراں بجائے زخم ہے

آ تماشا کر کبھی اے، بے نیاز شام غم

دیدۂ بے خواب بھی، چاک قبائے زخم ہے

کس سے جز، دیوار مژگاں، سیل درد دل رُکے

ساحل دریائے خوں، لب آشنائے زخم ہے

ضبط گریہ، چشم خوں بستہ کو تھا عقدہ کشا

رہ گیا تھا دل میں جو آنسو، بنائے زخم ہے

شعلۂ افسردگی ہے، شمع فانوس خیال

داغ کیا ہے دل سے پیمانِ وفائے زخم ہے

اب تو دامن تک پہنچ آیا سرِ چاک جنوں

ہم تو سمجھے تھے کہ بس دل، انتہائے زخم ہے

سلسلہ ہائے طلب سے رستگاری ہے کسے

دل ہلاک، ناوک وناوک فدائے زخم ہے

چارہ گرنے بہر تسکیں رکھ دیا ہے دل پہ ہاتھ

مہرباں ہے وہ مگر، نا آشنائے زخم ہے

میری وحشت کب ہوئی؟ رسوائے عریانی فراز

کل بدن پر پیرہن تھا، اب ردائے زخم ہے

(فراز۔ درد آشوب ص:۔132 ماورا پبلیشر بہاولپور روڈ لاہور)

جس طرح فیض احمد فیض نے سعدی و حافظ سے استفادہ کیا تھا اسی طرح احمد فراز نے غالب اور فیض کے کلام سے استفادہ کیا، گویا کہ سعدی و حافظ سے فیض تک کی پوری روایت احمد فراز تک پہنچتی ہے، چنانچہ حافظ کے لہجے اور غالب کی زمین میں احمد فراز نے کئی غزلیں بھی کہیں ہیں "مرے آگے" اچھا ہے"" دیکھتے ہیں" کی ردیفیں بلکہ زمینیں احمد فراز نے غالب سے ہی لی ہیں اور حافظ کی سادگی و پرکاری" آہستہ چل "ردیف والی غزل میں موجود ہے، عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں "فراز کی شاعری پڑھتے ہوئے حافظ و خیام کی یاد آتی ہے، وہی لطافت اور وہی سرمستی۔ فراز کی شعری تربیت میں فارسی لٹریچر نے اہم کردار ادا کیا ہے، اس کے علاوہ اردو کے کلاسکی ادب اور انگریزی شاعروں کے کلام پر بھی اس کی گہری نظر تھی اس خیال سے کہ وہ صرف رومانی شاعر ہے اتفاق کرنا بہت مشکل ہے، اس کی نظر زندگی کے تما شعبوں پر ہے، وہ شاعری برائے شاعری نہیں کرتا بلکہ اپنے ہنر سے وہ اس سے بھی بہتر کام لیتا ہے، اس کی اس نوع کی شاعری اس کے اپنے اشعار کی تفسیر ہے

شکوہ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر ہے

اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

(احمد

فراز)

اس شاعرِ بے بدل نے اپنے حصے کی شمعیں جلائیں اور معاشرے کو اپنے حصار میں لئے ہوئے اندھیروں کے خلاف اعلان جنگ کیا۔

دور جدید کے شاعر ہونے کے باوجود ان کے اشعار میں قدیم وجدید امتزاج نمایاں ہے ان کے اشعار میں الفاظ پھولوں جیسے سجے اور موتیوں کی طرح جڑے محسوس ہوتے ہیں جو اپنی مہک اور چمک سے دل ودماغ کو معطر اور منور کر جاتے ہیں، صنف شاعری میں انھیں امتیاز حاصل تھا، عمومی بول چال کے الفاظ بھی ان کے اشعار میں جگہ پاکر معنویت کے اعتبار سے جامع اور باوقار نظر آتے ہیں۔ فراز کی غزل کے بارے میں ممتاز الحق رقم طراز ہیں

"فراز نے روایتی غزل کو نئے عہد کے تقاضوں سے اس طرح مزین کیا ہے جس سے ایک نیا رنگ ابھرتا ہے ۔فیض نے سیاسی مضامین کو کلاسکیت کے سانچے میں ڈالا تھا، فراز نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے مگر فراز اور فیض کی غزلوں میں اس لحاظ سے فرق ہے کہ فیض عام طور پر کوئے یار سے سوئے دار جاتے وقت درمیاں کے تمام مراحل نظر انداز کر جاتے ہیں مگر فراز کے یہاں عصر حاضر کی پیچیدگیاں، بے اعتدلایاں، تضاد اور نفسیاتی کشمکش کو بھی موضوع سخن بنانے کی روش ملتی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں"(6)

فراز کہتے ہیں

دیکھا مجھے تو ترک تعلق کے باوجود

وہ مسکرا دیا یہ ہنر بھی اسی کا تھا

(فراز)

انھوں نے مروجہ شعری لفظیات کو نئے معنی دیکر بھی لفظی کیمیا گری کی ہے اور یہ صفت ان کے اسلوب کی دین ہے،

اس نئے انداز کو اختیار کرتے وقت احمد فراز نے شعریت کے دامن کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، شعریت ، شعر کی لطافت ، دلآویزی، اور خوبی کی صفت ہے جس سے جذبے کا گداز ، فکر و احساس کی لطافت اور پیرائہ بیان جیسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں ، شعری روایت بھی اس سلسلے میں مؤثر کردار ادا کرتی ہے فراز کے یہاں شعریت اسی روایت کی بدولت ہے ۔ احمد فراز کی شعریات میں صداقت اور اصلیت کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ ان کے یہاں شعریت کی خبر اردو کی قدیم شعریت سے آگہی کی وجہ سے ملتی ہے ، کیوں کہ انھوں نے نئے خیالات کے اظہار میں قدیم شعری سانچوں کو بھی نظر میں رکھا ، فراز کی شعریت اس لئے بھی قابل تحسین ہے کہ انھوں نے فصاحت کلام کا خاص خیال رکھا اور ان عیوب یعنی ضعف تالیف ، تعقید لفظی و معنوی ، تنافر کلمات ، اور کثرت تکرار سے بطور خاص اجتناب کیا ہے انھوں نے اپنی شعریات میں وہ الفاظ استعمال کئے ہیں جو روز مرہ اور محاورے کے خلاف نہ تھے اور موقع و محل کے عین مطابق تھے

اب کے تجدید وفا کا نہیں امکاں جاناں

یاد کیا تجھ کو دلائیں تیرا پیماں جاناں

(فراز)

شاہدہ دلاور شاہ اپنے ایک مضمون "فراز ایک ہمہ جہت شخصیت " میں فراز کی انفرادیت اور نئی آواز کو اس انداز میں بیان کرتی ہیں

احمد فراز کی شاعری اردو میں ایک نئی انفرادی آواز کی حیثیت رکھتی ہے ان کے وجدان کی اور جمالیاتی شعور کی ایک خاص شخصیت ہے جو نہایت دلکش خدوخال سے مزین ہے " (7)

اسلوب کے حوالے سے دیکھا جائے تو فراز کے اسلوب پر علامت اور استعارے کا رنگ غالب نظر آتا ہے ان کی شاعری میں مزاحمتی جذبات کا اظہار مختلف علامتوں، استعاروں اور تلمیحاتی حوالوں سے ہوا ہے ان کے یہاں زیادہ مزاحمتی انداز ہے اور وہ بھی حکمران طبقے کے خلاف اس لئے ان کے اسلوب میں بھی حکمرانوں کے حوالے سے مختلف علامتیں اور استعارے موجود ہیں، یہ استعارے اور علامتیں الگ الگ نوعیت کی حامل ہیں، ان کے یہاں حکمران کے لئے غمخوار، شہریار، قاتل، سنگ، چارہ گر، غنیم، صیاد ، بادل، امیر شہر، ملاح، رہبر، اور دشمن جیسے استعارے اور علامتیں ملتی ہیں

اک یہ بھی تو اندازِ علاج غم جاں ہے

اے **چارہ گرو** درد بڑھا کیوں نہیں دیتے

(درد آشوب۔ ص:36)

امیر شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے

کبھی بہ حیلۂ مذہب کبھی بنام وطن

(درد آشوب۔ ص:33)

جو **ابر** تھا تو اسے ٹوٹ کر برسنا تھا

یہ کیا کہ آگ لگا کر ہوا روانہ وہ

(نایافت / ص:20)

پھر قفس میں شور اٹھا قیدیوں کا اور **صیاد**

دیکھنا اڑا دیگا پھر خبر رہائی کی

(نابینا شہر میں آئینہ۔ ص:49)

فراز کے علامتی اور استعاراتی نظام میں ان کے وطن پاکستان کے لئے بھی مختلف علامتیں موجود ہیں۔ وہ اپنے **ملک** کے لئے گلستاں، چمن، شہر، ماں، میکدہ اور میخانہ جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں

دیکھنا لُو چلی کہ بادِ مراد

دوستو پھر **چمن** سلگتا ہے

(تنہا تنہا۔ ص145)

یہ کیا **گلشن** ہے جس گلشن میں لوگو

بہاروں کا کوئی موسم نہیں ہے

(جاناں جاناں ص:67)

اک فقیہ شہر کو کیا دوش دیجے جب سبھی

میکدے کے دشمنوں میں ہوں قدح خواراں سمیت

(جاناں جاناں ص:92)

سنو کہ جب کوئی آئینِ گلستاں ہی نہیں

تو کوئی کیسے کرے باغبانیِ صحرا

(اے عشق جنوں پیشہ۔ ص:

179)

ماں مٹی نے خوں مانگا تھا اور بیٹے

پانی سے تالاب کو بھرتے جاتے ہیں

(اے عشق جنوں پیشہ۔ ص:

30)

اب کہ شب گزری تو اک تیری میربات نہیں

شہر کا شہر چراغ سحر ہے خاموش

(اے عشق جنوں پیشہ۔ ص:
(49

فراز کے علامتی اور استعاراتی نظام میں بالخصوص وہ علامتیں اور استعارے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں جو انھوں نے مارشل لاء کے دور میں استعمال کئے ہیں۔ مارشل لاء کے دور میں اُن کا علامتی نظام وسعت اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے، یہاں کچھ ایسی نئی علامتیں سامنے آتی ہیں جو ان کے یہاں پہلے دیکھنے کو نہیں ملیں مثلاً "**صبحِ کاذب**" جو مارشل لاء کے لئے استعمال ہوا ہے پہلی بار سامنے آیا اس کے علاوہ سناٹا، خورشید، پیڑ، درخت، پرندے، شجر، طیور وغیرہ جیسی علامتیں اور استعارے بھی اس دور سے تعلق رکھتے ہیں

یہ **صبحِ کاذب** تو رات سے بھی طویل تر ہے
کہ جیسے صدیاں گذر گئیں آفتاب دیکھے

(بے آواز گلی کوچوں میں۔
ص:97)

بلا سے ہم حصارِ سنگ پہنیں
یہ سناٹے مگر آہنگ پہنیں

(نابینا شہر میں آئینہ۔ ص:89)

جن کے نغموں کو ہیں پیکان عزیز
ان پرندوں کو کہاں جان عزیز

(نابینا شہر میں آئینہ۔ ص:99)

فضا بے ابر شاخیں بے ثمر ہیں
پرندوں سے شجر محروم تر ہیں

(بے آواز گلی کوچوں میں۔
ص:19)

درخت ماؤں کے مانند انتظار میں ہیں

طیور لوٹ کے آئے نہ آشیانوں میں

(بے آواز گلی کوچوں میں۔

ص:71)

فراز ایک ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں رومان کی علامتوں سے لے کر، مزاحمت کے استعاروں تک، ہجر کے مراحل سے وطن پرستی کی فکری اساس تک، معنویت کے کئی در واہوتے ہیں اور اُن کی شاعری سادگی اور سچائی کے ساتھ ساتھ دل میں اتر جانے کی صلاحیت رکھتی ہے

ارشد شاہین اپنے مضمون "گوریپا کوئی ہور" میں لکھتے ہیں

"فراز کی ابتدائی شاعری پر فراق، فیض اور ندیم کا اثر نمایاں ہے
مگر آگے چل کر انھوں نے اپنے فکرو فن کے لئے ایک ایسی الگ
راہ نکالی جو آج صرف انہی سے مخصوص ہے، ان کی غزل میں
عصری مسائل اور معاشرتی الجھنوں کا واضح اظہار ملتا ہے "(8)

فراز نے جہاں جہاں کنایات کا استعمال کیا ہے وہاں بھی نہایت ہی نفاست کے ساتھ اپنے ہنر کا استعمال کیا ہے کنایہ کہ ایک مثال ملاحظہ ہو

کترنیں غم کی جو گلیوں میں اڑی پھرتی ہیں
گھر میں لے آؤ تو انبار سے لگ جاتے ہیں

(فراز)

فراز کے یہاں کنایہ تشبیہ اور علامتوں کے ساتھ استعارہ کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں استعارہ کی ایک مثال ملاحظہ ہوں

خبر تھی گھر سے وہ نکلا ہے مینہ برستے میں
تمام شہر لئے چھتریاں تھا رستے میں

(فراز)

سائل احمد اپنے ایک مضمون "فراز کی غزل کے چند رنگ" میں لکھتے ہیں

"فراز نے کلاسکی حسن کو نئے معنوی احساس کے ساتھ پیش کیا
ہے وہ زندگی کو سراپا محبت بنا دینے کا جذبہ رکھتے ہیں انھوں نے
فکر کو نیا انداز دیا ہے" (9)

احمد فراز کے شعری رویے اپنے عہد کے سماجی و سیاسی منظر نامے پر جس زاویے سے بھی نظر ڈالتے ہیں اسے اپنے قاری کے قلب و نگاہ کا مرکز و محور بنا دیتے ہیں۔ احمد فراز نے جدت پسندی کے پردے میں ایسے حقائق کو بیان کیا ہے جنھیں انسان کبھی فراموش نہیں کر سکتا ہے اور یوں ان کے اشعار سے آنے والے زمانے کے حالات بھی سامنے آتے ہیں۔ احمد فراز تجزیاتی اور تجرباتی حوالے سے ان حقائق کا اظہار کرتے ہیں یہاں ان کی فکر و دانش کی جوت کافی روشن نظر آتی ہے وہ مستقبل کے حقائق کو یوں بیان کرتے ہیں

ایک لمحے کے لئے صدیوں کا سکوں ہو جائیگا
ایک خواہش کے لئے عمریں گنوا دی جائیں گی

(فراز)

احمد فراز کا امتیاز یہ ہے کہ وہ رنج و غم کے حوالے سے اپنے تجربات و مشاہدات مجرد انداز میں پیش نہیں کرتے بلکہ ترقی یافتہ تخلیقی اور جمالیاتی شعور رکھنے والے اصلی شاعر کی طرح ہر تجربہ اور مشاہدہ کو اپنے تخلیقی وجود کے اندر تحلیل کرتے ہیں اور پھر انھیں اپنے شاعرانہ جذبہ و احساس کے سانچے میں ڈھال کر مخصوص اشاراتی اسلوب میں پیش کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ احمد فراز کی ساخت جذباتی ساخت کے طور پر اپنی شناخت رکھتی ہے احمد فراز اپنے جذبات کے اظہار کے لئے عام طور پر اردو غزل کے مروجہ ترکیباتی اور کلاسکی شعریات سے جوڑے رکھتی ہے لیکن دوسری جانب شعر کی داخلی ساخت اور قاری پر اس کے معنوی اثر و تاثر کے سبب احمد فراز کے اشعار جدید تر شاعری کے نمونے ثابت ہوتے ہیں یعنی فراز کے یہاں روایتی تراکیب جدید سماجی، سیاسی و ثقافتی تناظرات میں برتے گئے ہیں شاہدہ دلاور شاہ کے بقول

"وہ ایسے استعاروں میں بات کرتا ہے جو خطابت اور تنگ نظرانہ
قوم پرستی سے بالاتر ہے، وہ حقیقی معنوں میں بین الاقوامی شاعر
ہیں اور اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ ان کی نظمیں اس وقت سر تا
سر عشق سے مملو ہوتی ہیں" (10)

اردو کی جدید شاعری کی روایت میں زبان وبیان کی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہوئیں یا جس طرح کی ہیئت واسلوب پر زور دیا گیا۔ وہ انگریزی کی رومانوی تحریک اور فرانس کی علامتی شاعری میں پہلے سے موجود تھیں۔ جدید شعراء نے جدید شاعری کی نظریاتی تقویم میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ جدید شاعری نے اختراع پسندی پر زور دیا اور کسی بھی قسم کی تقلید پرستی کو شعروادب کے لیے غیر ضروری قرار دیا۔ جدید شاعری جو بیسویں صدی کے نصف دوم میں پروان چڑھی اس نے معینہ اصول وضوابط کو یکسر مسترد کر دیا اور کسی بھی طرح کی تقلید یا روایت پرستی کو نہ صرف شاعری کے لیے غیر موزوں قرار دیا بلکہ خود شاعری کی اپنی ذات کے لیے بھی تباہ کن خیال کیا۔ اس ضمن میں جدید شاعری نے جس چیز کی اتباع اور تقلید کو ضروری جانا وہ تخیل کی تخلیقی قوت تھی۔ گویا جدید شعراء کے یہاں تخیل کی تخلیقی قوت ہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور کسی بھی طرح کا تقلیدی تفوق ان کے لیے بے معنی ہے۔

جدید شاعری میں محبوب پردے کے پیچھے نہیں رہتا ہے۔ وہ سامنے آتا ہے اور اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے اس کی ذات زندگی میں رنگ بھرتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ موجودہ دنیا اور موجو دہ سماج کا ایک فرد

معلوم ہوتا ہے۔ وہ انسانی خصوصیات سے بے نیاز نہیں ہے۔ اس میں اردو غزل کے روایتی محبوب کی خصوصیات نہیں ہیں۔ وہ اسی طبقے کا ایک فرد ہے جس سے ہم سب تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں وہ تمام بنیا دی خصوصیات ہیں جو انسان کی لطیف ترین جنس عورت میں ہونی چاہیے۔ وہ حسن وشباب کا مجسمہ ہے، شرم وحیا کا پیکر ہے، شوخی اور شگفتگی، تیزی اور طراری سے اس کا خمیر اٹھا ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا بلکہ ہمارے

سامنے رہتا ہے۔ اس کے چاہنے والے اس کے لیے ترستے ضرور ہیں لیکن اس کے لیے ویرانوں اور صحراؤں کی خاک کم چھانتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جدید غزل میں مثال پسندی اورآدرش کی جگہ ٹھوس حقیقت پسندی اورارضیت نے لے لی۔ انسانوں کی محبت اب تصوری اور خیالی نہیں انسانوں جیسی ہے:

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

احمد فرآز

جدید شاعری میں محبوب کو انسانی اور سماجی مخلوق کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے حسن کی وہ ساری ماورائیت ختم ہو گئی ہے جو اس کا سلسلہ کسی حسن ازلی سے ملا دیتی ہے۔ اس کا حسن زمینی اور فطرت، سیدھی سادی نسوانی ہے۔ کلاسیکی محبوب مثالی حسن کا مالک تھا لیکن جدید محبوب کے لیے چاند کا ٹکڑا ہونا ضروری نہیں وہ معمولی خد وخال کا بھی ہو سکتا ہے:

نبھا رہا ہے یہی وصف دوستی شاید
وہ بے مثال نہ تھا میں بھی بے نظیر نہ تھا　　　　فرآز

حوالہ جات

1. (زاہد حسن۔ مشمولہ ماہنامہ ماہ نو جنوری 2009۔ ص:189
2. (شہزاد احمد۔ مشمولہ ماہنامہ، ماہ نو۔ جنوری 2009 ص:192)
3. (مشمولہ ماہنامہ ماہ نو جنوری 2009۔ ص:330)
4. (فراق گورکھپوری / بحوالۂ نیا ادب احمد فراز نمبر 2008 اردو اکادمی نئی دہلی)
5. (شاہدہ دلاور شاہ۔ فراز ایک ہمہ جہت شخصیت۔ مشمولہ ماہ نامہ ماہ نو جنوری 2009۔ ص:219)
6. (شاہدہ دلاور شاہ۔ فراز ایک ہمہ جہت شخصیت۔ مشمولہ ماہ نامہ ماہ نو جنوری 2009۔ ص:219)
7. (گور پیا کوئی ہور، ارشد شاہین۔ مشمولہ ماہ نامہ ماہِ نو ص 276، سن اشاعت جنوری 2009)
8. (گور پیا کوئی ہور، ارشد شاہین۔ مشمولہ ماہ نامہ ماہِ نو ص 276، سن اشاعت جنوری 2009)
9. بحوالۂ فراز کی غزل کے چند رنگ، گوہر رحمن نوید مشمولہ ماہنامہ ماہ نو، احمد فراز نمبر ص 264 جنوری 2009)
10. (فراز ایک ہمہ جہت شخصیت۔ مشمولہ ماہ نامہ ماہ نو جنوری 2009۔ ص:219)

چوتھا باب

احمد فراز اور ان کے معاصرین

فراز کے معاصرین کا تقابلی جائزہ لینے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے شعری رجحان کا مختصر جائزہ لیا جائے تاکہ فراز کے معاصرین کی شاعری کا جائزہ لینا آسان ہو جائے فراز کی شاعری کا زمانہ 1947 سے 2008 تک کا ہے اس لئے اس زمانے میں کی گئی شاعری اور اس زمانے کے شعراء کی شاعری کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہے۔

سماج میں تبدیلی کا جو عمل ہے اس کے زیر اثر زندگی کی قدریں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں، جس طرح انسانی زندگی اور اس کی تہذیب و معاشرت میں تبدیلی ہوتی ہے اسی طرح زبان و ادب میں تبدیلیاں رو نما ہوتی ہیں، شاعر بھی اس تہذیب و معاشرت کا فرد ہوتا ہے اور ایک غیر شاعر کے مقابلے میں اس کا تصور زیادہ لطیف و نازک ہوتا ہے جو داخلی اور خارجی دباؤ سے متاثر ہوتا ہے اور کبھی نئی قدروں کی بنیاد ڈالتا ہے تو کبھی پرانی روایتوں کو ختم کرنے پر زور دیتا ہے، آزادی کے بعد خاص کر ساٹھ کی دہائی میں نئی غزل کھل کر سامنے آتی ہے اور ہندو پاک میں اس کا زبردست احیاء ہوتا ہے۔ اسی دوران 1958 میں جب احمد فراز کا پہلا شعری مجموعہ "تنہا تنہا" شائع ہوا تبھی ناصر کاظمی کا شعری مجموعہ "برگِ نے" ابن انشا کا "چاند نگر" اور خلیل الرحمن اعظمی کا شعری مجموعہ "کاغذی پیرہن" بھی منظرِ عام پر آیا۔ تنہا تنہا"

برگِ نے"، "چاند نگر" اور کاغذی پیرہن" کے منظر عام پر آنے کے بعد نئی شعری فضا کی تعمیر ہوئی اور نئی شعری تازگی کا احساس شعرا میں عام ہوا، اس دور کی شاعری میں روایتی انداز سے احتراز کیا گیا تھا اور موضوعات و لفظیات کے نئے تجربات کئے گئے تھے، نئی نسل کے شعراء نے اسلوب، علامت پسندی اور پیکریت کو اپنا مقدر تصور کیا اور زمانے کے ارد گرد کی ایسی اشیاء جن سے صدیوں کا رشتہ تھا تاہم کلاسکی شاعری میں انھیں قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا تھا کو نئی شاعری میں جگہ دی اس طرح ادب کا جمود ٹوٹا اور نئی شاعری وجود میں آئی۔

اس باب میں احمد فراز کے 16 معاصرین کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے شعراء کی ترتیب میں تاریخ پیدائش کا خیال رکھا گیا ہے، تاریخ پیدائش کے اعتبار سے سب سے پہلے ناصر کاظمی کا نام آتا ہے۔

ناصر کاظمی (1۔دسمبر 1923)

ناصر کاظمی کا اصل نام ناصر رضا تھا ان کے والد کا نام محمد سلطان تھا۔ ناصر کاظمی یکم دسمبر 1923ء کو انبالہ میں پیدا ہوئے، ان کو بچپن سے ہی ڈائری لکھنے کا شوق تھا جو عمر کے آخری لمحے تک باقی رہا، ناصر کاظمی اردو شعر وادب کی دنیا میں اس وقت نمودار ہوئے جب ہر فرد عقائد کی شکست، اقدار کی بے معنویت، تلاشِ ذات اور روحانی اضطراب میں مبتلا تھا، ناصر کاظمی کے تخلیقی شعور کی نشو نما میں 1947 کے فسادات، تقسیم اور ہجرت کے المیہ نے اہم کردار ادا کیا ہے، ہجرت کا مسئلہ ان کے یہاں ایک فلسفہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، اس وجہ سے انھوں نے سیاسی واردات اور خونیں واقعات کو تہذیبی المیہ کے تناظر میں اس طرح دیکھا ہے جس کی جانب اشارے میر نے دلی کی بربادی کے ساتھ دل کی ویرانی کے ذکر میں بار بار کئے ہیں، بر صغیر کی تاریخ میں یہ زمانہ سیاسی و سماجی تبدیلیوں کا زمانہ تھا سیاسی تبدیلیوں کے باعث اس عہد کو بہت بڑے حادثات و واقعات کا سامنا کرنا پڑا, ان حادثات و واقعات نے معاشرے کے ساتھ ادب کو بھی متاثر کیا۔ لہذا ان حادثات و واقعات کے زیر اثر پیدا ہونے والے موضوعات ادب کا حصہ بنے۔

ناصر کاظمی کا شعری سرمایہ ان کے چار مجموعہ ہائے کلام " برگ نئے "، "دیوان"، "پہلی بارش"، اور "نشاط خواب " پر پھیلا ہوا ہے برگ نے " ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو تقسیم ہند کے کچھ عرصہ بعد شائع ہوا تھا، لہذا اس مجموعہ میں تقسیم ہند کے سبب ہونے والے فسادات، ہجرت اور اس سے متعلق موضوعات مثلا اداسی، محرومی، اور ماضی کی یاد اور حیرت جیسے موضوعات پر کافی اشعار موجود ہیں، "برگِ نے " کئی اعتبار سے منفرد ہے اس میں ایک طرح کی تازگی اور بے تکلفی ملتی ہے، روایت سے منسلک ہونے کے باوجود ان کی شاعری ایک نئے راستے کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے وہ حقائق سے نظریں نہیں چراتے بلکہ بہت ہی قریب سے ان کا جائزہ لیتے ہیں، ان کا سماجی شعور پختہ اور معنی خیز ہے انھوں نے اپنے ذاتی غم کو کائناتی غم بنایا۔ مندرجہ بالا چیزوں کو ناصر کاظمی کے ان اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے

شہر اجڑے تو کیا ہے کشادہ زمین خدا
اک نیا گھر بنائیں گے ہم صبر کر صبر کر

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

شہر سنسان ہے کدھر جائیں
خاک ہو کر کہیں بکھر جائیں

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے

اک طرف جھوم کر بہار آئی
اک طرف آشیاں جلائے گئے

اک طرف خون دل بھی تھا نایاب
اک طرف جشنِ جم منائے گئے

کیا کہوں کس طرح سرِ بازار
عصمتوں کے دیئے بجھائے گئے

آہ وہ خلوتوں کے سرمائے

مجمعِ عام میں لٹائے گئے

وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصر

خار و خس کی طرح بہائے گئے

ناصر کاظمی کا دوسرا مجموعہ کلام "دیوان" ہے جس میں بعد کی غزلیں ہیں مگر اس میں بھی ناصر کاظمی 1947 کے پیدا شدہ حالات سے پیچھا نہیں چھڑا سکے البتہ "برگ نے" کے مقابلے میں یہاں احساس میں شدت پیدا ہو گئی ہے اور اس مجموعے میں بھی بکھرے ہوئے اشعار کے باوجود مسلسل غزلیں بھی موجود ہیں جن کا تعلق براہ راست 1947ء کے واقعات سے ہے اسی طرح پہلی بارش اور نشاطِ خواب میں بھی ان موضوعات کا اظہار حسی سطح پر ایک بھولی بسری یاد کی شکل میں کیا گیا ہے۔ ناصر کاظمی کے شعری مجموعے "پہلی بارش" سے ایک غزل ملاحظہ ہو!

تیرا قصور نہیں، میرا تھا

میں تجھ کو اپنا سمجھا تھا

دیکھ کے تیرے بدلے تیور

میں تو اس دن رو بیٹھا تھا

اب میں سمجھا، اب یاد آیا

تو اس دن کیوں، چپ سا تھا

اب تجھے کیا کیا یاد دلاؤں

اب تو وہ سب کچھ ہی دھوکا تھا

وہی ہوئی ہے جو ہونی تھی

وہی ملا ہے جو لکھا تھا

کس کس بات کو روؤں ناصر

اپنا کہنا ہی اتنا تھا

(مجموعہ: پہلی بارش)

ناصر کاظمی نے چونکہ اپنے عہد کے واقعات وحادثات کو علامتی اور استعاراتی انداز میں بیان کیا ہے، لہذا یہ واقعات وحادثات زبان ومکان کی قید سے آزاد ہو گئے ہیں۔

ناصر کاظمی کی غزل ماضی کو از سر نو زندہ کرنے یا روایت کو ایک نفسیاتی جہت سے ہمکنار کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نئے دور کا اظہار بھی کرتی ہے۔ ناصر کاظمی کے یہاں احساس کی دھیمی آنچ، لہجہ کی نرمی ماضی کی بیتی یادوں کی خوشبو اور آپ بیتی کا رنگ ملتا ہے، ان کی غزل میں جلتے ہوئے شہر اور سلگتی ہوئی بستیوں کا غم پنہا ہے، ناصر کی اس خوبی نے غزل کی امیجری بدل دی ہے وہ غزل کی ایسی اچھوتی آواز ہیں جنھیں یہ احساس ہے کہ جب تک غزل اہم ترین صنف سخن نہیں بن جاتی ملکِ سخن کا سماں سنسان رہے گا۔

ناصر کاظمی کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ایساہ محسوس ہوتا ہے کہ شعر کہتے ہوئے وہ اپنی طبیعت پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالتے، بلکہ ان کے اشعار میں برجستگی اور آمد ہے جس سے ان کی غیر معمولی ادبی شخصیت ظاہر ہوتی ہے، شمس الرحمن فاروقی، ناصر کاظمی کو اور جنل شاعر مانتے ہیں، ان کے خیال کے مطابق ناصر کے کلام میں میر کی جھلک ہے۔

ناصر کاظمی اردو شاعری کے روایت سے بخوبی واقف تھے مگر وہ اپنے آپ کو کسی ایسی روایت سے وابستہ نہیں کرنا چاہتے تھے جو ان کے عہد کا ساتھ نہ دے سکے ان کا مسئلہ نئی زمین پر اپنے ورثہ کی تلاش کا تھا جو ان کے وجود کے اثبات میں حائل نہ ہو یہی وجہ ہے ناصر کاظمی نے اداسی کو "میر ابائی کی بہن" سے تعبیر کیا اس سے ناصر کاظمی کی شاعری کا مزاج سمجھا جا سکتا ہے مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں

نئی دنیا کے ہنگاموں میں ناصر

دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی

یہ خاص و عام کی بیکار گفتگو کب تک

قبول کیجئے جو فیصلہ عوام کرے

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ناصر کاظمی کی شاعری کا خمیر عشقیہ شاعری سے اٹھا ہے ناصر کاظمی کے سامنے سیاسی و سماجی جو بھی مسائل تھے ان کو عشق کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے جگر اور فراق نے جس عشقیہ شاعری کی بیج ڈالی تھی ناصر کاظمی اسی کے پیرو تھے۔ ناصر کاظمی فراق گورکھپوری کی طرح جذبۂ عشق کے ایسے پہلوؤں اور عشق کے تجربہ کی بعض ایسی کیفیتوں کی اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے جو بہت کم شعراء کی گرفت میں آسکے ان کے مضامین کا کینوس بہت بڑا ہے گو کہ ناصر کاظمی کی زبان، تغزل کی زبان ہے لیکن اس قسم کے مضامین کا اظہار ایک پیکر کی صورت میں ہوتا ہے۔ پیکر سازی کی چند مثالیں ذیل کے اشعار میں ملاحظہ ہوں

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر

اداسی بال کھولے سو رہی ہے

(ناصر کاظمی)

ملکی و قومی زبوں حالی کے حوالے سے ناصر کاظمی لکھتے ہیں

انھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ

یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

ناصر کاظمی

اس حوالے سے احمد فراز کا شعر بھی ملاحظہ ہو

سادہ دل تماشائی پھر فریب کھا بیٹھے

بھیڑیوں کے جسموں پر ہرنیوں کی کھالیں ہیں

احمد فراز

ناصر کاظمی کو نئ غزل کا معمار کہا جاتا ہے، نئ غزل کی ایک اہم شناخت یہ ہے کہ اس میں علامتوں کا بھر پور استعمال ہو تا ہے لیکن ان کے یہاں علامتوں کا استعمال بہت کم ہوا ہے اور نئ علامتیں نہ کے برابر ہیں پھر بھی کہیں کہیں انھوں نے علامتوں کا استعمال نہایت چابکدستی کے ساتھ کیا ہے

اس شہر بے چراغ میں جائیگی تو کہاں
آ!اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں
یہ کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی
گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں

(ناصر کاظمی)

شہر بے چراغ، ویرانی اور بے رونقی کی علامت ہے۔ ناصر کی شاعری میں، چاند چھب، مانوس اجنبی، ۔ ہجر کی رات کا ستارہ، ہم نفس، ہم سخن، زلفیں، نرم گفتار، آہو، انگشت حنائی، جگنو، آنکھیں، اور پیکرِ ناز وغیرہ بہت سے خوبصورت استعارے ہیں جو ناصر کاظمی کی شاعری کو جداگانہ مقام عطا کرتے ہیں۔ ناصر کی کاظمی اور احمد فراز دونوں کی شاعری میں عورت سے وفا کا تقاضا ملتا ہے
فراز کہتے ہیں

قربتوں میں بھی جدائی کے بہانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے
اپنا یہ حال کے جی ہار چکے لٹ بھی چکے
اور محبت وہی انداز پرانے مانگے

احمد فراز

اسی حوالے سے ناصر کاظمی کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں

یوں تو ملنے کو وہ ہر روز ہی ملتا ہے مگر
دیکھ کر آج اسے آنکھ بہت للچائی

ناصر کاظمی

عشق ہے نام انتہاؤں کا

اس سمندر میں اعتدال کہاں

فراز

جبکہ ناصر کاظمی کہتے ہیں

یاد کے بے نشاں جزیروں سے

تیری آواز آرہی ہے ابھی

خلاصہ یہ کہ کلاسکیت اور جدیدیت کے حسین امتزاج کو جن گنے چنے غزل گو شعرا نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ اپنے شعری پیکر میں ڈھالا ان میں ناصر کاظمی اور احمد فراز دونوں کا نام صف اول میں ہے مزید یہ کہ فراز اور ناصر دونوں ہی زبان، لہجہ، اسلوب اور احساس و جذبات کی سطح پر روایتی ہو کر بھی جدید غزل گو ہی رہتے ہیں۔

باقر مہدی 11(فروری1927)

باقر مہدی 11؍فروری1927 کو اودھ کے قصبہ ردولی کے ایک خوشحال اور علم وادب دوست گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی جعفر مہدی رزم ردولوی مرثیے کے عمدہ شاعر تھے اور ان کی سوتیلی والدہ کا بھی شعر وسخن سے سلسلہ تھا۔ معاشیات اور عمرانیات کے طالب علم ہونے کے باوجود باقر مہدی نے ادبیات کو جو نئے زاویے عطا کیے ہیں وہ شاید ان کے معاصر ادیبوں کے لیے ممکن نہ ہوتا۔ باقر مہدی جیسا ذہن کچھ ہی خوش نصیبوں کو ودیعت ہوتا ہے۔ باقر مہدی منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ باقر مہدی اردو کے وہ جدید شاعر ہیں جنھوں نے کبھی بھی کوئی بات کی تو ان کے مد نظر ہمیشہ یہ شعر رہا

میں جو بولوں تو ہر اک شخص خفا

اور خاموشی کو رسوا دیکھوں

باقر مہدی کے یہاں احساس غم کی شدت اور فراوانی زندگی کی پریشانی کو بتلاتی ہے۔ احمد فراز ہی کی طرح باقر مہدی نے جب شعر گوئی کا آغاز کیا تو ترقی پسندی زوروں پر تھی۔

ایک مستقل اضطراب، اعصاب، اور حواسِ پیہم پر دستکیں دیتی ہوئی، دل ودماغ کو پریشان کرتی ہوئی اور اپنے اندر پیچ وتاب سے نمودار ہوتی ہوئی آگہی باقر مہدی کی شاعری کا امتیاز ہے باقر مہدی کا مطالعہ وسیع تھا ساتھ ہی ساتھ ذہنی کینوس بھی بہت وسیع

باقر مہدی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے وارث علوی لکھتے ہیں

> وہ احساس کے مختلف سمتوں کے شاعر ہیں، اس میں رومانی افسردگی بھی ہے اور غنائیت بھی، ایک انقلاب کی بلند آہنگی بھی ہے اور طنز واستہزا بھی، وجودی حسیت کا کرب وتردد بھی ہے اور فکری برہمی بھی، فریب ناخوردہ آدمی کی اعصاب زدگی بھی ہے اور جھنجھلاہٹ بھی، دانش وری کی چمک دمک بھی ہے اور طراری بھی، اپنے عہد کے پیدا کردہ شکوک وشبہات بھی ہیں اور سوالوں کے تیز نشتر بھی، بے چین روح کا اظہار بھی ہے اور

دل گداختہ کا سوزِ دروں بھی، باخبر بیدار ذہن کا غم و غصہ بھی
ہے اور حالات سے نبرد آزما ہونے اور انھیں بدل ڈالنے کی
تڑپ بھی، لب و لہجے ک اکھڑا پن بھی ہے اور کلاسکی رچاؤ بھی،
فکر و مشاہدہ کی تازہ کاری بھی ہے اور ندرت بھی ، یہ ساری
شعری نیرنگیاں ان کی نظموں کے ساتھ ان کی غزلوں میں بھی
یوں اُبھر آئی ہیں کہ باقر مہدی اپنے معاصرین میں اپنے عہد
کے کی منفرد آواز بن گئے ہیں ، جس کی تحسین و ستائش وہی
شخص کر سکتا ہے جو اردو شعر و ادب کے ساتھ ساتھ عالمی ادب
اور اس کی تحریکات نیز بیسویں صدی کی تاریخ سے اچھی طرح
واقف ہے"1

باقر مہدی کی شاعری میں بھرپور تاثرات کی حامل اور منظر نگاری و پیکر تراشی کی عمدہ مثالیں ہیں۔

اک سرابِ بے کراں ہے مشرق و مغرب تمام
اک غبارِ بے نوا ہے، قافلہ باقی نہیں

(باقر مہدی)

پروفیسر فضیل جعفری باقر مہدی کی شاعری کے حوالے سے کہتے ہیں

"جہاں تک باقر کی شاعری کی زبان کا تعلق ہے وہ کھردھری
تشبیہوں اور استعاروں، غیر ہموار مصرعوں، الجھی الجھی بحروں
سے عبارت ہے"2

باقر مہدی نے زندگی اور شاعری دونوں کی سطح پر اجتماعی سروکاروں کو ہمیشہ اہمیت دی ڈاکٹر محمد حسن کہتے ہیں

باقر مہدی کی شاعری کا موضوع فرد کی سماج سے عدم مطابقت
Alienation اور آگہی کی تنہائی ہے"3

باقر کی شاعری صحیح معنوں میں ان کی زندگی کی عکاس ہے ان کی شاعری میں شخصی انحراف وبغاوت کے عناصر دکھائی دیتے ہیں مگر وہ تمار روایتی لفظیات، تراکیب اور اسلوب کے اسیر معلوم ہوتے ہیں۔ڈاکٹر فضیل جعفری اپنے مضمون "کھلی ہوئی آنکھیں: باقر مہدی کی شاعری" میں لکھتے ہیں

یہ چاروں طرف بکھری ہوئی ٹوٹی پھوٹی دنیا، ہم عصر زندگی کے تضادات اور مسائل، ان تضادات و مسائل کی کوکھ سے جنم لینے والا ڈائلما اور ان سب چیزوں کے نتیجے میں، شاعر کے دل و دماغ میں نشتر کی طرح چبھتے ہوئے خاموش سوالات، وغیرہ ایسے عناصر تھے، جو باقر کی شاعری میں انقلابی تبدیلیوں کا موجب بنے "4

باقر مہدی کی شاعری میں ایک آتش فشاں ہے جو ہر لمحہ گردو پیش کو للکاراتا ہے، جو زمانے کی چیرہ دستیوں کو، طبقاتی نظام کی ناہمواریوں، سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ اور سوشیلزم کے نام پر استحصال اور ظلم وزیادتی کے خلاف آواز ملتی ہے جو آواز احمد فراز کی آواز سے ملتی ہوئی ہے۔ڈاکٹر محمد حسن اپنے مضمون "باقر مہدی کی شخصیت وشاعری" میں لکھتے ہیں۔

"باقر زندگی کی رگ رگ توڑ دینے والی تشنگی اور کرب کو شاعری میں ڈھالنا چاہتے اور اس عمل میں مصرعوں کی شکست وریخت، ارکان کی توڑ پھوڑ، زبان کے سانچوں کا توڑنا مروڑنا، امیجری کا بے ترتیب استعمال ہی نہیں خود اپنی شخصیت کے توڑ پھوڑ سے بھی گریز نہیں کرتے لیکن توڑ پھوڑ کا یہ حوصلہ اسی وقت نئی فردوس کو جنم دیسکتا ہے جب اس کے آگے یقین کی دولت ہو۔ انھیں یقین ہے تو اتنا کہ یہ زندگی جہنم ہے اور جب یہ ٹوٹ پھوٹ جائیگی تو آنے والی زندگی نیا جہنم ہی ہوگی "5

باقر مہدی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

ایسی بیگانگی نہیں دیکھی

اب کسی کا کوئی یہاں نہ رہا

(باقر مہدی)

ان کے شعری مجموعے "شہر آرزو" سے ایک غزل ملاحظہ ہو

درد دل آج بھی ہے جوش وفا آج بھی ہے

زخم کھانے کا محبت میں مزا آج بھی ہے

گرمئ عشق نگاہوں میں نہیں ہے نہ سہی

مسکراتی ہوئی آنکھوں میں حیا آج بھی ہے

حسن پابند قفس عشق اسیر آلام

زندگی جرم محبت کی سزا آج بھی ہے

حسرتیں زیست کا سرمایہ بنی جاتی ہیں

سینۂ عشق پہ وہ مشق جفا آج بھی ہے

دامن صبر کے ہر تار سے اٹھتا ہے دھواں

اور ہر زخم پہ ہنگامہ اٹھا آج بھی ہے

اپنے آلام و مصائب کا وہی درماں ہے

درد کا حد سے گزرنا ہی دوا آج بھی ہے

میرؔ و غالبؔ کے زمانے سے نئے دور تلک

شاعرِ ہند گرفتارِ بلا آج بھی ہے

ابن انشا(15جون1927)

اردو ادب کے مایہ ناز شاعر، ادیب ابن انشاء کا اصلی نام شیر محمد خان تھالیکن ابن انشاء کے نام سے مشہور ہوئے۔ 15 جون 1927ء کو جالندھر کے ایک نواحی گاؤں کے راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام منشی خان تھا۔ جب پاکستان بنا تو ابن انشاء اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور لاہور میں رہائش اختیار کر لی۔

ہر سچے شاعر کی طرح ابن انشا بھی خواب دیکھتے ہیں ,کسی دور کی منزل تک پہنچنے کے خواب، چاند نگر تک رسائی حاصل کرنے کے خواب، وہ جانتے ہیں کہ ان کا یہ خواب ایک مسلسل جدو جہد مانگتا ہے، مگر انھوں نے اپنا شہر تمنا بسایا ہی اس لئے ہے کہ دل میں بہتر سے بہتر کی آرزو زندہ رہے اور آگے بڑھنے کی امنگ جاگتی رہے۔

ابن انشا کے یہاں عصری حسیت پائی جاتی ہے، وہ عصری حسیت سے اردو شاعری کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہیں، زبان و بیان میں تبدیلی یا تجربہ ان کے فن کو مجروح نہیں کرتا بلکہ اس میں حسن پیدا کرتا ہے انھوں نے فن کے تمام خانوں کے ساتھ انصاف کیا ہے لہذا ان کی شاعری، شعری روایت میں ایک انمول تحفہ ہے جس کی لطافت و دل کشی، اور انفرادی لب و لہجہ قارئین کو ہمیشہ مسرت و دل جوئی کا سامان فراہم کرتا ہے۔

ابن انشا نے جادو کے شہروں کی تلاش کی راہ اپنائی اور ہمیشہ منزل کی تلاش میں سرگرداں رہنے کو ترجیح دی۔ ان کی شاعری میں اداسی اور افسردگی نظر آتی ہے، انھوں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے سادہ اسلوب اپنایا، ان کی شاعری میں تشبیہ و استعارہ کی زیادہ کار فرمائی نہیں ملتی، گہری رمزیت کے بجائے سادہ رواں انداز میں اپنی دلی کیفیات کو اجاگر کرتے ہیں

ایک انسان کے دل میں آگ کی لاٹیں جاگ رہی ہیں
ان لاٹوں کو کون دبائے، اس جوالا کو کون بجھائے

(ابن انشا)

ابن انشاء کی شاعری میں رومانی احساسات کی ترجمانی کرنے والے فطری مظاہر کی تصویریں بکثرت موجود ہیں، ان تصویروں میں مرکزی کردار چاند ہے۔ابن انشا کی لفظی تصویروں اور تمثال کاری میں افسردگی کی لہر زیر سطح موجود رہتی ہے، ان کی تمثالوں میں گہری معنویت موجود نہیں، بن انشا کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جن کے یہاں میر کا رنگ واضح طور پر موجود ہے۔وہ غزل کے معاصر رویوں سے بھی آشنائی رکھتے تھے اور انھوں نے ان سے اثرات بھی قبول کیے۔اے۔حمید اس حوالے سے لکھتے ہیں:

اس دل کے دریدہ دامن میں دیکھو تو سہی، سوچو تو سہی
جس جھولی میں سو چھید ہوئے اس جھولی کا پھیلانا کیا

لوگ ہلالِ شام سے بڑھ کر پل میں ماہِ تمام ہوئے
ہم ہر برج میں گھٹتے گھٹتے صبح تلک گمنام ہوئے

کوچے کو تیرے چھوڑ کر جوگی ہی بن جائیں مگر
جنگل ترے، پربت ترے، بستی تری، صحرا ترا

شہر کے لوگ اچھے ہیں، ہمدرد ہیں، پر ہماری سنو ہم جہاں گرد ہیں
داغِ دل نہ کسی کو دکھانا سجن، یہ زمانہ نہیں وہ زمانہ سجن

ابن انشا ترقی پسندوں، رومانیت کے علمبرداروں اور حلقۂ ارباب ذوق کے اسیروں کے ساتھ رہے اور ان کے فکر وخیال پر ان صحبتوں کا اثر بھی پڑا مگر غزل کی قدیم عظیم شعری روایات سے ان کا گہرا رشتہ تادم آخر قائم رہا۔انھوں نے شاندار شعری روایت کو اپنے اندر جذب کرلیا اور روایت کے نقیب کہلائے، شعری روایت سے اسی مستحکم رشتے کی وجہ سے وہ اپنے ہم عصر شعراء میں جداگانہ مقام

رکھتے ہیں یہی روایت کی پاسداری ہو بہو احمد فراز کے یہاں بھی ملتی ہے اس بات کا اقرار ابن انشا نے خود اپنے شعر میں اس طرح کیا ہے

سیدھے من کو آن دبوچیں، میٹھی باتیں سندر بول
میر، نظیر، کبیر اور انشا سارا ایک گھرانا ہو

ابن انشا کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ میر کی طرح خارجی تجربات کو داخلی تجربے میں ڈھال کر غزلوں میں پیش کرتے ہیں خارجیت سے داخلیت کی طرف لوٹنے کا یہ رجحان ابن انشا کے یہاں ہمیں بار بار ملتا ہے اور یہ رجحان ان کے عہد کے ممتاز شاعر احمد فراز کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے

دیکھ ہماری دید کے کارن کیسا قابل دید ہوا
ایک ستارہ بیٹھے بیٹھے تابش میں خورشید ہوا

ابن انشا نے سماج اور اس کے مسائل سے کبھی چشم پوشی نہیں کی اور ہمیشہ اپنے آپ کو سماج اور معاشرے کا فرد سمجھا اور جب کبھی ضرورت ہوئی انھوں نے اہم سماجی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ابن انشا نے ہمیشہ سماج کے منفی قدروں کے خلاف احتجاج کی آواز بھی بلند کی اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے ایک انسان پر دوسرے انسان کا جبر اور ظلم ہونے پر صبر و تحمل کی تلقین کی۔ کیوں کہ انھوں یقین تھا کہ حق کا پرچم ایک دن بلند ضرور ہو گا۔

کچھ کہنے کا وقت نہیں یہ کچھ نہ کہو خاموش رہو
اے لوگوں خاموش رہو، ہاں اے لوگوں خاموش رہو

ابن انشاء کی غزلوں کا ایک شعری امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے ہندی کے الفاظ کو اردو کے ساتھ ملا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ غزل کی فضا ہندی لب و لہجہ کی سی ہو گئی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں احمد فراز کی غزلوں میں فارسی آمیز تراکیب کا اثر دکھتا ہے۔ اردو میں ہندی لب و لہجے اور ہندی کے کومل الفاظ کی آمیزش سے تیار شدہ ایک نیا طرز تھا اور یہ طرز ان کے کسی معاصر کے یہاں دکھائی نہیں دیتا

گویا وہ اس راستے کے اکیلے مسافر ہیں اور اس سے ان کی انفرادیت بھی قائم ہوتی ہے، ہندی کے الفاظ کے استعمال کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں

ہم جنگل کے جوگی ہم کو ایک جگہ آرام کہاں
آج یہاں کل اور نگر میں صبح کہاں اور شام کہاں
ہر ایک پہ نظریں اٹھنی تھیں، ہر ایک پہ جی کو مچلنا تھا
اس شہر میں روپ کا اکال نہیں، کچھ اور ہے اپنے ساجن میں

ابن انشانے اشعار میں خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے بسا اوقات ہندو دیومالا کے کرداروں کو علامتوں کے سہارے پیش کیا ہے،

چھیل چھبیلا کون پھرے اس متھرا کی نگری میں سکھیوں
سبھی باتیں جو کہ اپنے شیام میں تھیں اب دیکھ لو اس من موہن میں
کبھی من کے اجنتا میں آؤ، وہ مورتیں تم کو دکھلائیں
وہ صورتیں جن کو دکھلائیں، ہم کھو گئے جن کے درشن میں

خلیل الرحمن اعظمی(9اگست 1927)

خلیل الرحمن اعظمی کی پیدائش 9اگست 1927 کو اعظم گڑھ کے ایک گاؤں "سیدھا سلطان پور" کے ایک متوسط گھرانے میں ہوئی گویا کہ خلیل الرحمن اعظمی احمد فراز سے عمر میں تقریباچار سال بڑے تھے ، خلیل الرحمن اعظمی اپنے تمام بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے انھوں نے بہت ہی کم عرصے میں قرآن شریف کی تعلیم مکمل کرلی تھی انھیں بچپن سے ہی کتابوں کے مطالعے کا شوق تھا وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے اور غور وخوض کرتے رہتے۔انھیں کھیل کود سے کوئی دل چسپی نہیں تھی سب سے پہلے انھوں نے "پھلواری" کے نام سے ایک نظم لکھی تھی۔اس بارے میں پرواز اصلاحی کہتے ہیں

> "یاد پڑتا ہے کہ خلیل الرحمن نے سب سے پہلے اسی پھلواری پر
> نظم لکھی تھی ۔ والد صاحب کو بھی سنایا اور چچا کو بھی ، پہلی بار
> ہمارے گھر والوں کو ان کی شاعری کا علم ہوا"6

خلیل الرحمن اعظمی صرف 13 برس کی عمر میں ماہنامہ "بیداری" کے ایڈیٹر بنادئے گئے تھے ، ان کی زندگی مسلسل جدوجہد اور کوششوں کی ایک مکمل داستان ہے ، ان کی پوری زندگی کامیابی وناکامیوں کی آمیزش ، تنہائیوں اور دوستانہ ماحول کی ترنگوں اور مختلف پریشانیوں و پیچ در پیچ مسائل کا ایک مرقع ہے اس سلسلے میں رشید الدین صاحب کہتے ہیں

> "انھوں نے میٹرک کے بعد ہی اپنا گھر بار چھوڑ دیا۔انٹر سے لیکر
> پی۔ایچ ڈی تک انھوں نے اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر تعلیم
> حاصل کی ، ترقی پسندی کی علت میں انھیں زندگی میں جیل بھی
> جانا پڑا ، 1947 کے فسادات میں فسادیوں کے ہاتھوں جاں بلب
> بھی ہوئے اور علی گڑھ یونیورسٹی میں اپنوں ہی کے ہاتھوں
> گہرے زخم بھی کھائے"7

خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری کی شروعات بچپن ہی میں ہوگئی تھی لیکن ان کی شاعرانہ زندگی کا باقاعدہ آغاز آزادی کے وقت ہوا ، وہ اس دور کی مروجہ تحریک ترقی پسند ادبی تحریک سے متاثرہ نہیں بلکہ

بالواسطہ طور پر وابستہ ہوگئے، نظریاتی طور پر ترقی پسند تحریک سے متفق ہونے کے باوجود فراز ہی کی طرح خلیل الرحمن کے اندر ایک شاعرانہ الجھن اور ذہنی کشمکش تھی لہذا اس تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود شعر گوئی کے نئے نئے امکانات کی تلاش میں سرگرداں رہے انھوں نے اپنے مجموعے کلام " نیا عہد نامہ " کے دیباچے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے ترقی پسند تحریک سے بیزار ہو کر جدیدیت کے دامن میں پناہ لینے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ خلیل الرحمن اعظمی " نیا عہد نامہ " کے دیباچے میں لکھتے ہیں

> " میری افتاد طبع اس وقت تک کچھ ایسے سانچے میں ڈھل چکی تھی کہ میں زندگی اور ادب کے سلسلے میں اس تصور سے مطابقت نہیں کر پایا تھا جس میں ضرورت سے زیادہ غلو، یک سرے پن اور منجمد نقطۂ خیال کی کار فرمائی تھی، پرانی، مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی قدروں سے میں نے اپنا ناطہ اسی لئے توڑا تھا کہ میرے نزدیک ان میں ادعائیت اور انجماد پیدا ہو گیا تھا اور وہ زندگی کے نامیاتی اور حرکی تصور کا ساتھ نہیں دیرہی تھیں، ترقی پسندی میرے نزدیک زندگی کی انہی حرکی تقاضوں سے عہدہ بر آہونے کا نام تھا، مگر میں آہستہ آہستہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ ترقی پسندی کے دعویدار ترقی پسندی کا بھی جامد اور محدود تصور رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں جس شدت سے کام لے رہے ہیں وہ اسی نوعیت کی ہے جو واعظوں اور محتسبوں کی خصوصیت ہوتی ہے اور جن سے بیزار ہو کر میں نے اس تحریک کے دامن میں پناہ لی تھی "8

خلیل ارحمن اعظمی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، ادیب نقاد، شاعر اور اچھے انسان کے علاوہ دوستوں کے دوست تھے، سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ بالکل ایک بے ضرر انسان تھے ان کے

ابتدائی کلام میں روایتی شاعری کی رومانیت اور جمالیاتی ذوق کا بھرپور جواز ملتا ہے، خلیل ارحمن اعظمی نے غزل کی عظمتِ رفتہ کو نئی یاد دلا دی اور اس کی ادبی اہمیت و ادبی شان میں قدرے اضافہ کیا، تنقید کے سلسلے میں انھوں نے کلاسکی شعراء کا بغور مطالعہ کیا تھا یہی وجہ ہے کہ خلیل الرحمن اعظمی کی ابتدائی شاعری میں کلاسکی خیالات کے اثرات بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔ قدما کے کلام کی ورق گردانی سے بلاشبہ خلیل الرحمن نے بڑا فیض اٹھایا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں روایتی رکھ رکھاؤ، دلکشی، تاثیر، رعنائی، جمالیاتی عنصر، درد والم، تڑپ اور کسک وغیرہ بدرجہ احسن موجود ہیں۔

خلیل الرحمن کے ابتدائی دور کی شاعری میں وہ سب کچھ موجود ہے جو روایتی اور کلاسکی غزل گو شعراء کے اشعار میں پائے جاتے ہیں۔ لب و لہجہ میں سادگی، الفاظ میں رومانیت و جمالیات کا وفور، محبوب کی جفائیں، نارسائی، وصل و فراق کے مزے اور تڑپ، رقیبوں کی عداوت، زمانے سے بے پروائی کا بیان ان کے اشعار میں بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اک مری آنکھ ہی شبنم سے شرابور رہی
صبح کو ورنہ ہر اک پھول کا منہ سوکھا تھا

رات جب دیر تلک چاند نہیں نکلا تھا
میری ہی طرح سے سایہ بھی مرا تنہا تھا

خوار ہوئے بدنام ہوئے بے حال ہوئے رنجور ہوئے
تجھ سے عشق جتا کر ہم بھی نگر نگر مشہور ہوئے

ہائے وہ کالی کالی آنکھیں ہائے وہ بھیگے بھیگے ہونٹ
ہائے وہ تیرے چاہنے والے جو پی کر مخمور ہوئے

کس ناز سے پالا ہے ہم نے غمِ ہجراں کو

اس غم کو ذرا آکر سینے سے لگا جانا

خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری میں میر کا اثر بخوبی دیکھا جاسکتا ہے جب وہ کلام میر کے مطالعے میں محو ہوئے تو انھوں میر کے درد والم اور اپنی زندگی میں موجود دشواریوں میں یکسانیت نظر آئی لہذا ان کا ذہن میر کے اندازِ بیان میں دل چسپی لینے لگا ہو گا اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے ان کے اشعار میں درد، رنج، مصائب، کم مائیگی کا بیان میر کے کلام کی دین ہے اور انھوں نے اس طرز ادا کو اپنی غزلوں اور نظموں میں بخوبی اپنایا ہے خلیل الرحمن اعظمی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میر کی آواز کو اپنی آواز میں پیش کرنے میں وہ اپنے ہم عصروں میں سب سے کامیاب رہے۔ انھوں نے روایتی شاعری کی اچھی روایتوں کو اپنی کسوٹی پر پرکھ کر اپنی شخصیت کے داخلی تجربات سے ہم آہنگ کر کے اس میں نئی جان ڈالی ہے۔

ہندوستان میں جدید شاعری کی باضابطہ، ابتداء خلیل الرحمن سے ہوئی، انھوں نے جدید دور کے اضطراب کو اپنی غزلوں میں پیش کرکے شاعری میں داخلیت کے عناصر کو پھر سے اجاگر کیا، خلیل الرحمن اعظمی نے اپنی شاعری کا آغاز 1946ء میں ہو بہو احمد فراز کی طرح اس وقت کیا جب ترقی پسند تحریک کے اثرات ہر طرف نمایاں تھے انھوں نے زمان ومکاں کی قید سے آزاد ہو کر شاعری میں اپنے جذبات وخیالات پیش کئے۔ خلیل الرحمن اعظمی کے تخلیقی شعور نے "کاغذی پیراہن" سے "نیا عہد نامہ" کی غزلوں تک جو ارتقائی سفر کیا ہے اس میں تقلید کے ساتھ ساتھ شاعر کی اپنی شاعرانہ عظمت بھی بر قرار ہے خلیل الرحمن اعظمی کے یہاں خود شکستگی کا احساس ملتا ہے اور یہ خود شکستگی جدید شعرا کا پسندیدہ موضوع بن گیا، اس حوالے سے ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو

کہے گا دل تو میں پتھر کے پاؤں چوموں گا

زمانہ لاکھ کرے آکے سنگ بار مجھے

خلیل الرحمن اعظمی نے جدید دور کے انسان کا کرب محسوس کیا اور اس کرب کو اعتدال اور سلجھے ہوئے انداز میں اپنے اشعار میں ڈھالا

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے

مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے

شمیم حنفی، اپنی کتاب "غزل کا نیا منظر نامہ" میں خلیل الرحمن اعظمی کے بارے میں لکھتے ہیں

> "اعظمی کے شعور نے "کاغذی پیرہن" سے نیا عہد نامہ کی غزلوں تک کا جو ارتقائی سفر طے کیا ہے اس میں تقلید اور استفادے کی منزل پر بھی انھیں بالعموم اپنے شاعرانہ کردار کے تحفظ کا پورا احساس رہا ہے، چنانچہ شروع کی غزلوں میں جو گھلاوٹ، لوچ، نرمی کی جو کیفیت اور دھیرے دھیرے سلگنے، اپنی آرزوؤں کا ماتم کرنے، خوابوں کی لٹی ہوئی بزم کو دوبارہ آراستہ کرنے زندگی اور زمانے کے عذاب کو جھیلتے ہوئے ڈوب ڈوب کر ابھرنے کا جو انداز ملتا ہے اور رفتہ رفتہ شعور نفس کے محاسبے سے گزر کر تزکئے اور تہذیب کی جس منزل تک پہنچتا ہے اس کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت اپنے آپ کو اچھی طرح تسلیم کروالیتی ہے کہ روایت اور ترقی پسندی کی توسیع کے باوجود اعظمی کی غزلیہ شاعری اپنے راستے کی تلاش سے بے نیاز نہیں رہی "9

خلیل الرحمن اعظمی کی غزلوں میں "شہر" کا لفظ جابجا استعمال ہوا ہے انھوں نے بہت سارے اشعار میں لفظ" شہر کو علامت اور استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے، لفظ شہر، ان کی غزلوں میں وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے فراز نے بھی شہر کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے آئے شہر کے حوالے سے دونوں کے اشعار دیکھتے ہیں

خود اپنا عکس ہوں کہ کسی کی صدا ہوں میں
یوں شہر تا بہ شہر جو بکھرا ہوا ہوں میں

(خلیل الرحمن
اعظمی)

سارا شہر بلکتا ہے
پھر بھی کیسا سکتا ہے
ہر کوئی تصویر نما
دور خلا میں تکتا ہے

احمد
فراز

جس طرح احمد فراز نے اپنے نجی تجربات کو شاعری کے پیکر میں پیش کیا اسی طرح خلیل الرحمن اعظمی نے بھی اپنے نجی تجربات، احساسات و سوز و گداز کو شعری پیکر میں اس طرح ڈھال کر پیش کیا کہ اس سے ان کی شخصیت واضح ہو جاتی ہے، ان کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات بھی کھل کر آتی ہے کی ان کی شاعری جس میں انھوں نے اپنے نجی تجربات و احساسات کو جس سادگی، والہانہ ادا اور دھیمے لہجے میں بیان کیا ہے اس سے ان کی شخصیت بھی آئینے کی طرح ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ان کی شاعری کا یک مخصوص لب و لہجہ اور آہنگ ہے، جس میں وہ اپنی بات کہتے ہیں، نامرادی، شدید رنج و غم، حالات کی ناسازگاری، تلاش و جستجو، اضطرابی کیفت اور درد و کرب ان کی شاعری کی روح ہیں۔

تو بھی اب چھوڑ دے ساتھ اے غم دنیا
میری بستی میں نہیں کوئی شناسا چہرا

کس موڑ پر بچھڑ گئے خوابوں کے قافلے
وہ منزلِ طرب کا فسوں کون لے گیا

فراز کی طرح خلیل ارحمن اعظمی علامتوں اور استعاروں کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں لیکن خلیل ا لرحمن اعظمی کی چند جانی مانی علامتیں ہیں جن کو وہ بخوبی استعمال کرتے ہیں مثلاً چمن، گل، ساقی، آشیاں، درو بام، مے خانے، آئینہ وغیرہ اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں

مجھے سنبھال گردشِ وقت

ٹوٹا ہوا تیرا آئینہ ہوں

اب کے ایسی پت جھڑ آئی سوکھ گئی ہے ڈالی ڈالی

ایسے ڈھنگ سے کوئی پودا کب پوشاک بدلتا ہے

مختصر یہ کہ خلیل الرحمن اعظمی نے نئی شاعری کو نئے امکانات سے آگاہ کیا، کلاسکی شاعری کو نئی شاعری کے طرز اسلوب، رنگ و آہنگ الفاظ وڈکشن سے ہم آہنگ کر دیا، اس امتزاج کی کیفیت کے بعد نئی غزل ایک نئے لب و لہجے سے آگاہ ہوئی اور اس کی ترقی کے دروازے کھل گئے اور خلیل الرحمن اعظمی کو نئی غزل کے معماروں میں شمار کیا گیا۔

منیر نیازی(19اپریل1928)

منیر نیازی 19 اپریل 1928ء کو احمد فراز سے تقریبا تین سال پہلے ہوشیار پور کے ایک گاؤں خانپور میں پیدا ہوئے۔ منیر نیازی کا اصل نام منیر احمد تھا والد کا نام فتح محمد خان نیازی اور والدہ کا نام بی بی رشیدہ بیگم تھا۔

منیز نیازی کی ابتدائی تعلیم خانپور میں ہوئی اور انٹر میڈیٹ ایس ایس کالج بہاولپور سے کیا اس کے بعد بی اے دیال سنگھ کالج لاہور سے مکمل کیا۔ احمد فراز ہی کی طرح منیر نیازی کے کیریئر کی شروعات صحافت سے ہوئی تھی۔ 1949 میں ہفت روزہ اخبار "سات رنگ" میں مدیر کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا

۔

احمد فراز کی طرح منیز نیازی بھی ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن سے وابستہ رہے ان کی ریڈیو سے وابستگی کے حوالے سے صفدر علی ہمدانی کہتے ہیں

> مجھے آج ریڈیو پاکستان میں 70 کے عشرے میں گذارے ہوئے دن بہت یاد آرہے ہیں جب منیر نیازی سے مستقل ملاقات لاہور ریڈیو اور پاک ٹی وی ہاؤس میں رہتی تھی۔ میں، نسرین انجم بھٹی، شائستہ حبیب مرحومہ، اقبال فہیم جوزی جب بھی ان کی محفل میں بیٹھتے تو وقت کا جیسے کوئی احساس نہ رہتا اور انکی باتوں کے ساتھ ساتھ ان کی فکر اور شخصیت کا سحر دیر تک اپنی گرفت میں رکھتا تھا ۔۔۔۔لاہور ریڈیو کا مقبول ادبی پروگرام "میزان" تھا اس ادبی پروگرام میں منیر نیازی جب شرکت کے لئے آتے تو پھر دوپہر شام میں اور شام رات میں ڈھل جاتی اور ان کی سحر انگیز گفتگو جاری رہتی"10

منیز نیازی کا تعلق ساٹھ کی دہائی میں ہندوپاک میں مقبول ہونے والے ان شعراء کی جماعت سے ہے جن کو ہجرت کے تجربات سے دوچار ہونا پڑا۔ تقسیم ہند کے موقعہ پر منیز نیازی ہندوستان سے پاکستان

چلے گئے اور ساہیوال میں سکونت اختیار کی، ساہیوال میں قیام کے دوران انہیں مجید امجد جیسے شاعر کی صحبت میسر آئی، ان کے اردو شاعری کے تیرہ اور پنجابی کے تین مجموعے ہیں جبکہ احمد فراز کے اردو شاعری میں 14 مجموعے ہیں۔

منیر نیازی نے شاعری کا آغاز قیام پاکستان سے قبل اس وقت کیا جب وہ اسلامیہ کالج جالندھر میں بی اے کے طالب علم تھے، جبکہ احمد فراز نے بھی اپنی شاعری کا آغاز بی اے کے ہی زمانے سے کیا تھا۔

وہ اپنی شاعری میں ایک ایسی فضا تخلیق کرتے ہیں جس میں خارجی اور باطنی عناصر مل کر احساس کی سطح پر قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں وضاحت اور طول بیانی کے بجائے اختصار سے اس طرح بات کرنا کہ پڑھنے والے کے ذہن پر نقش بھی ہو جائے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جائے یہ منیر نیازی کا مخصوص وصف ہے

منیر نیازی کا شعری سفر 1948ء سے شروع ہو کر 2006ء تک جاری رہا، چھ دہائیوں پر محیط ان کا ادبی سفر اردو شاعری میں اس لئے اہم ہے کہ انھوں نے نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔

منیر نیازی کی شاعری کا زمانہ 1947 کے بعد کا ہے انھوں نے اپنے عہد کی کسی ادبی تحریک یا رجحان سے مکمل نظریاتی یا فنی وابستگی کے بجائے ذاتی تجربات کو تخلیق کا محور بنایا ہے فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ منیر نے اردو شاعری کو زندگی کی نئی معنویت سے جس طرح ہم کنار کر دیا ہے وہ ابھی تک صرف انھیں کا حصہ ہے۔

منیر کی شاعری میں خوف و دہشت کا ماحول جا بجا دکھائی دیتا ہے، غالباً اس جذبے کے پیچھے بھی وہ ناہموار ماحول اور معاشرے کی کار فرمائی ہے جس میں منیر کی شاعری پروان چڑھی، بغض، عداوت اور پامال ہوتی انسانی زندگی کا مشاہدہ انھوں نے قریب سے کیا تھا، اس کے ساتھ ہی منیر ہجرت کے تجربات سے بھی دوچار ہوتے ہیں۔

منیر نیازی نے ہجرت سے پیدا شدہ مسائل کے علاوہ دیگر کئی سماجی مسائل پر کھل کر اشعار کہے ہیں مگر ان کی آواز نعرہ بازی کے حدود کو نہیں چھوتی اور نہ ہی پروپیگنڈے کے زمرے میں ان کی غزلوں اور نظموں کو رکھا جا سکتا ہے۔ منیر نیازی جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے جب علامات کا استعمال

کرتے ہیں تو اپنی الگ شناخت قائم کرتے ہیں منیر جن علامات و استعمارات کا استعمال کرتے ہیں ان میں گہری معنویت اور پیچیدہ مفاہیم پوشیدہ ہوتے ہیں۔ منیر نے داستانوی علائم کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ قدیم داستانوی تصورات اور اساطیری روایات سے انھوں نے عمدہ تماثیل اخذ کئے اور ان کو اشعار میں ڈھال دیا۔ اس زمرے میں منیر کی کئی نظمیں رکھی جا سکتی ہیں مثلاً ایک آسیبی رات، طوفانی رات میں انتظار، جادوگر، خزانے کا سانپ، جنگل کا جادو، چڑیلیں، بھوتوں کی بستی، "جنگل کی میں زندگی" وغیرہ اہم ہیں

لالٹین کو ہاتھ میں لئے جب میں باہر نکلا
دروازے کے پاس ہی اک آسیب نے مجھ کو ٹوکا
ہیبت ناک چڑیلوں نے ہنس ہنس کر تیر چلائے
سائیں سائیں کرتی ہوا نے خوف کے محل بنائے

اک آسیبی رات (تیز ہوا اور تنہا پھول)

منیر نیازی نے طویل اور مختصر دونوں طرح کی نظمیں لکھی ہیں ان کی مختصر نظمیں زیادہ دلکش اور جاذب ہیں۔ عشقیہ موضوعات میں بھی وہ اپنے معاصرین سے آگے نظر آتے ہیں، اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے وہ جذباتی اظہار کے لئے جن لسانی پیکر اور الفاظ کا استعمال کرتے ہیں وہ بقول افضال حسین تجربے کے ان علاقوں سے منتخب کئے گئے ہیں جن کے لئے مستعمل لفظیات سے سکوت، دھندلکا اور ایک دبی دبی سی مہجوری کی کیفیت سے مخصوص ہے۔ ان کی نظم "ہزار داستان" سے ایک مثال ملاحظہ ہو

جدھر بھی دیکھیں
مہکتے ہونٹوں کے سرخ گلشن کھلے ہوئے ہیں
جہاں بھی جائیں
حیا کے نشے سے چور آنکھیں
دلوں میں گہری اداسیوں کو اتارتی ہیں

ہزار گوشے ہیں

جن سے پاگل بنانے والی

سیاہ زلفوں کی مست خوشبو اڑ رہی ہے

مگر وہ ایک ایسا چہرہ

جو ایک رت کے اداس جھونکے

کے ساتھ آکر

چلا گیا ہے

(ہزار داستان۔ جنگل میں دھنک)

محبت کی جذباتی کیفیت کو منیر نے جن الفاظ کے سہارے بیان کیا مثلاً مہکتے ہوئے ہونٹ، سرخ گلشن، حیا کے نشے سے چور آنکھیں، سیاہ زلفوں کی مست خوشبو وغیرہ ان الفاظ میں ایک طرح کی تازگی ہے۔ منیر کا یہ انداز انھیں ان شاعروں سے ایک الگ شناخت عطا کرتا ہے جو جذباتی کیفیات کے بیان میں آج بھی روایتی الفاظ کو قدیم انداز میں پیش کرتے ہیں منیر نیازی استعارات کے استعمال میں بھی منفرد حیثیت رکھتے ہیں وہ جن استعارات اور علامات کا استعمال کرتے ہیں وہ ہمارے معاشرے کے پروردہ ہیں۔ منیر نیازی نے فراز کی طرح شہر کی علامت کو عمدہ انداز میں استعمال کیا ہے۔

ایک ہی رخ کی اسیری خواب ہے شہروں کا اب

ان کے ماتم ایک سے ان کی براتیں ایک سی

(منیر نیازی)

جبکہ فراز نے کہا تھا

فراز اس شہر میں کس کو دکھاؤں زخم اپنے

یہاں تو ہر کوئی مجھ سا بدن پہنے ہوئے ہے

زندہ دلانِ شہر کو کیا ہو گیا فراز

آنکھیں بجھی بجھی ہیں تو چہرے مرے مرے

حبیب جالب(فروری 1929)

حبیب جالب اور دوسرے ترقی پسند شاعروں میں شاید یہی ایک نمایاں فرق ہے کہ حبیب جا لب فکری وابستگی کا عملی مظاہرہ تھے۔ سو وہ سماج کی بھلائی کے لیے ہر اس دیوار سے عملی طور پر ٹکراتے رہے جسے وہ سماجی ارتقاء کی راہ میں حائل سمجھتے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو واضح ہوتا ہے کہ حبیب جا لب نے تنہا کوششوں سے اپنی شاعری اور عملی زندگی میں ترقی پسندانہ خیالات کی ترویج کی ان تھک جدوجہد کی۔ ایوب خان کا مارشل لاء ہو یا ضیا کی آمریت کا دور حبیب جالب تنہا ان آمروں کے خلاف آواز بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی جرات و بے باکی مثالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل سے معاشرے میں ظلم و جبر کے خلاف باغیانہ شعور پیدا کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ اور ایوب خان کے بنا ئے ہوئے دستور کو مسترد کرنے کا اعلان کرتے ہوئے پل بھر کو
خوف زدہ نہیں ہوتے:

میں بھی خائف نہیں تختۂ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو، جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

(دستور)

حبیب جالب کا طبقاتی شعور بھی بلند ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کس طرح غریبوں اور پسماندہ طبقوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھنے کے لیے مقتدر ایوانوں میں ان کے خلاف قانون سازی کی جاتی ہے۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے

ایسے دستور کو، صبح بے نور کو

میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

(دستور)

طبقاتی معاشرے میں مظلوم اور معصوم عوام پر ظلم و جبر کے حوالے سے حبیب جالب کی انتہائی مقبول نظم جسے بعد میں فلمی گیت کے طور پر گایا بھی گیا "نیلو" کا یہ بند ملاحظہ ہو:

طبعِ شاہانہ پہ جو لوگ گراں ہوتے ہیں

ہاں انھیں زہر بھرا جام دیا جاتا ہے

تو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی

رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

(نیلو)

حبیب جالب کی ساری زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔ انھوں نے ہر طرح کی مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر سماجی بھلائی کے خواب دیکھا اور ان کا بلاخوف وخطر براہِ راست اظہار کیا۔ ان کی شاعری نعرے کے قریب ہونے کے باوجود بیشتر ترقی پسندوں کی خشک اور بے رس شاعری کے مقابلے میں کہیں زیادہ پر اثر ہے۔ اس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ انہوں نے محض کتابی سطح پر مارکسی فکر سے متاثر ہونے کے بجائے تجربات کی سچائی اور داخلی سوز سے اپنی شاعری کو جلا دی۔ حبیب جالیب نے اپنے عہد میں سیاسی نظام اور سیاسی حکمتِ عملی کے تحت ملک و قوم کی زبوں حالی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

انتخابِ اہلِ گلشن پر لہو روتا ہے دل

دیکھ کر زاغ و زغن کو خوشنواؤں کی جگہ

حبیب جالب

اسی زبوں حالی کا نقشہ احمد فراز کے یہاں کچھ اس طرح ملتا ہے

دریدہ پیرہنوں کا خیال کیا آتا
امیر شہر کی اپنی ضرورتیں تھیں بہت

احمد فراز

فراز سے پہلے حبیب جالب نے اپنی شناخت انقلابی اور باغی شاعر کی حیثیت سے قائم کی، فراز کو "محاصرہ " نظم کی وجہ سے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں وہیں حبیب جالب کو نظم "دستور" کی وجہ سے جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑا، ڈاکٹر آغا حسنین نظم "دستور" کے بارے میں لکھتے ہیں

"اس نظم نے پورے ملک میں ہلچل مچادی اور جالب عوام میں باغی شاعر کے طور پر متعارف ہوئے، یوں تو وہ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی ہاری تحریک میں شمولیت اختیار کر کے 1952ء سے ہی سیاسی طور پر متحرک ہو چکے تھے، مگر ایوبی آمریت کے دور سے ان پر پابندی عائد کر دی گئی، ان کا دوسرا مجموعہ کلام "سر مقتل" 1966 میں ظبط کر لیا گیا"11

فراز کی طرح حبیب جالب نے بھی فوجی حاکم اور آمر جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں "ظلمت کو ضیا" والی نظم کہی تھی اس نظم کی وجہ سے بھی جالب کو قید و بند کی صعوبت برداشت کرنی پڑی تھی۔ یہ نظم بھی بہت مشہور اور مقبول ہوئی تھی اس نظم میں احتجاج کا رنگ اور لہجہ اتنا بلند ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شاعر میدان جنگ میں رجز والے اشعار پڑھ رہا ہے۔ اور دشمنوں کو للکار رہا ہے۔ یہ نظم باغیانہ تیور اور مزاحمتی آہنگ، زبان وبیان کی سادگی کی وجہ سے عوام وخواص میں یکساں مقبول ہوئی، اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

ظلمت کو ضیا صر صر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا
پتھر کو گہر دیوار کو در کرگس کو ہما کیا لکھنا
اک حشر بپا ہے گھر میں دم گھٹتا ہے گنبد بے در میں

اک شخص کے ہاتھوں مدت سے رسوا ہے وطن دنیا بھر میں
اے دیدہ ورو اس ذلت کو قسمت کا لکھا کیا لکھنا

یہ اہل حشم یہ دارا و جم سب نقش بر آب ہیں اے ہم دم
مٹ جائیں گے سب پروردۂ شب اے اہل وفا رہ جائیں گے ہم
ہو جاں کا زیاں پر قاتل کو معصوم ادا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

لوگوں پہ ہی ہم نے جاں واری کی ہم نے ہی انہی کی غم خواری
ہوتے ہیں تو ہوں یہ ہاتھ قلم شاعر نہ بنیں گے درباری
ابلیس نما انسانوں کی اے دوست ثنا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

حق بات پہ کوڑے اور زنداں باطل کے شکنجے میں ہے یہ جاں
انساں ہیں کہ سہمے بیٹھے ہیں خونخوار درندے ہیں رقصاں
اس ظلم و ستم کو لطف و کرم اس دکھ کو دوا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

ہر شام یہاں شام ویراں آسیب زدہ رستے گلیاں
جس شہر کی دھن میں نکلے تھے وہ شہر دل برباد کہاں
صحرا کو چمن بن کر گلشن بادل کو ردا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

اے میرے وطن کے فن کارو ظلمت پہ نہ اپنا فن وارو

یہ محل سراؤں کے باسی قاتل ہیں سبھی اپنے یارو

ورثے میں ہمیں یہ غم ہے ملا اس غم کو نیا کیا لکھنا

ظلمت کو ضیا صر صر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

(ظلمت کو ضیا)

پاکستان کی تمام آمریت اور تانا شاہی کی جالب نے پر زور انداز میں مخالفت کی، جمہوریت کی بحالی کے لئے انھوں نے عملی جدوجہد کی۔1964ء کے عام انتخابات میں کھل کر حبیب جالب نے فاطمہ جناح کا ساتھ دیا، انتخابی مہم میں جالب ہمیشہ فاطمہ جناح کے ساتھ رہتے تھے، ان کی نظمیں "مادر ملت"، "ماں" وغیرہ اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ ایک باغی دانشور اور ترقی پسند شاعر ہونے کی وجہ سے حبیب جالب کی شاعری کا خاص موضوع سرمایہ داری کی مخالفت تھا، فراز کی طرح حبیب جالب کو بھی کئی سالوں تک زنداں کی کال کوٹھری میں رہنا پڑا، جالب کے کل چھ شعری مجموعے ہیں۔ 1) برگ آوارہ ۔2) سر مقتل۔ 3) عہد ستم۔4) ذکر بہتے خون کا۔5) گوشے میں قفس کے 6) گنبد بے در۔

اس باغی عوامی شاعر کو اگر ایک طرف قید و بند اور طوق سلاسل کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا تو دوسری جانب عوام کی والہانہ محبت و عقیدت اور مقبولیت بھی ملی۔

شکیب جلالی(1۔اکتوبر۔1934)

شکیب جلالی کا اصل نام سید حسن رضوی تھا وہ یکم اکتوبر 1934ء کو علی گڑھ کے قریب ایک قصبہ جلالی میں پیدا ہوئے تھے۔ 1950ء میں وہ پاکستان آ گئے جہاں ملازمتوں کے سلسلے میں وہ مختلف شہروں میں مقیم رہے۔ شکیب جلالی ایک منفرد اسلوب کے شاعر تھے۔ انہوں نے بلاشبہ غزل کو ایک نیا لہجہ دیا۔
شکیب جلالی نے صرف 32 برس کی عمر پائی مگر انہوں نے اتنی کم مہلت میں جو شاعری کی وہ انہیں اردو غزل میں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ شکیب جلالی نے حسیاتی سطح پر شاعری کی تجرید کی ہے شکیب جلالی کا اسلوبِ بیان اور دائرہ فکر متنوع اور وسیع ہے ۔شکیب جلالی نے احمد فراز کی طرح زندگی کی بے معنویت اور معاشرے کے کھوکھلے پن کو بڑی ہی شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا وہ انسانوں میں یہ شعور پھیلانا چاہتے تھے کہ انسان اپنے مصائب کی جانب متوجہ ہو اور مصائب کے اسباب و عوامل کو سمجھے تاکہ مرض کی تشخیص ہو سکے کیوں کہ علاج کا مرحلہ مرض کی تشخیص کے بعد ہی ہو سکتا ہے

ملبوس خوش نما مگر جسم کھوکھلے
چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پر

اب یہ بتا کہ روح کے شعلے کا کیا ہے رنگ
مرمر کا یہ لباس تو اچھا لگا مجھے

اسی مضمون کو احمد فراز نے تھوڑے سے دوسرے انداز میں یوں بیان کیا ہے

خاک ہی خاک ہوئی جاتی ہے دنیا اپنی
اور اس آتش و ظلمات کے سیلاب میں بھی
مرمر و آہن و سیماں کی عمارات بلند
اسی پندار اسی شان سے استادہ ہیں
کیا خدا صرف غریبوں پہ ستم ڈھاتا ہے

(تنہا تنہا ص:40)

شکیب جلالی کی شاعری میں صرف زمانے کی روح ہی نہیں بلکہ وہ آفاقیت موجود ہے جو زمان و مکا
ں کی قید سے پرے ہوتی ہے جو دنیا کی سچائیوں کے چہروں سے نقاب پلٹتی ہیں اور انسان کو اصل حقائق
سے آراستہ کرتی ہیں، شکیب جلالی کی شاعری میں بیزاری اور تشکیک کے موضوعات فکر و زبان کی ندرت
کے ساتھ نئی اردو غزل میں شامل ہوتے ہیں ان کی شاعری اپنے عہد سے بہت آگے سوچتی ہوئی دکھائی
دیتی ہے صرف متعلقہ عہد کے حد سے ہی نہیں بلکہ وقت کی حدوں سے بھی آگے شکیب جلالی کے حصے
میں یہ امتیاز اس لئے آیا کہ وہ کربِ آگہی کے گزیدہ تھے ان کی طبعی عمر اور فکری عمر میں بہت بعد تھا ان
کی دنیا فکری آسودگی سے الگ تھی س لئے وہ جس نئی دنیا کے متمنی تھے اس کی مصوری کے لئے نئے
فکری و لسانی رویے درکار تھے شکیب جلالی نے اسی اردو غزل کی روایت سے رشتہ ہموار کیا شکیب کا
شاعرانہ کمال یہ ہے کہ انھوں نے بہت کم کہاہے لیکن جم کر کہاہے۔روحوں کا اجلاپن دیکھنا یا محسوس کرنا
ہو تو شکیب کی کوئی بھی غزل گنگنائی جاسکتی ہے۔بہت سامنے کی باتیں انھوں نے ایسی شاعرانہ نفاست
سے کہی ہیں کہ اس کے بہت سے اشعار ضرب الامثال بن گئے ہیں۔اوراس کے نام کو شاعری کی لوح
محفوظ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر گئے ہیں۔

شکیب نے غزل کو اظہار کی نئی وسعتوں سے اتنی خوبصورتی سے ہمکنار کیاہے کہ غالب کا تنگنائے غزل کا
شکوہ جاتا رہاہے۔

کنارِ آب کھڑا خود سے کہہ رہاہے کوئی
گماں گزرتا ہے یہ شخص دوسرا ہے کوئی
بتا سکے ہیں پڑوسی کسی کا درد کبھی
یہی بہت ہے کہ چہرے سے آشنا ہے کوئی
چھڑا کے ہاتھ بہت دور بہہ گیاہے چاند
کسی کے ساتھ سمندر میں ڈوبتا ہے کوئی

جہاں جہاں اس نے سوسائٹی کی بے سمتی اور اس کے عدم توازن پر طنز کیا ہے۔وہاں بھی شاعرانہ
نزاکتوں کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

ملبوس خوش نما ہیں مگر جسم کھوکھلے

چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پر

شکیب کی شاعری میں استعمال کئے گئے استعاروں اور تشبیہات میں تازگی کا احساس ہوتا ہے

وہ اس کا عکس، بدن تھا کہ چاندنی کا کنول

وہ نیلی جھیل تھی یا آسماں کا ٹکڑا تھا

شکیب جلالی ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے جدید گزل کو نئی آب و تاب سے روشناس کرایا ان کی شاعری میں نئے پن کا احساس موجود ہے انھوں نے غزل کی دم گھٹتی سانسوں کو نئی زندگی عطا کی تھی ،احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں

ناصر کاظمی، احمد فراز اور شہزاد احمد کے سے کامیاب غزل کہنے والے شعراء کی موجودگی میں کسی نئے شاعر کا غزل کے میدان میں اپنا مقام پیدا کر لینا کچھ آسان کام نہ تھا، مگر شکیب کی بے پناہ فنی اور تخلیقی قوتوں نے چند ہی برس کے اندر ان غزل گو شعراء کے برابر لا کھڑا کیا بلکہ میں سمجھتا ہوں، شکیب کے دم سے اردو غزل نے ایک اور سنبھالا لیا ہے"12

ایک اور مقام پر احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں

آزادی کے بعد ترقی پسند شعراء نے دم توڑتی ہوئی اردو غزل میں جو نئی روح پھونکی تھی، اس نے وہ نئے غزل گو شعراء پیدا کئے جن کی شاعری کو نشاۃ ثانیہ قرار دیا گیا، مگر پھر بھی نہ جانے کیا ہوا ان میں سے بیشتر شعراء نے کسی نہ کسی کلاسیکل غزل گو کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اسی کے رنگ میں کہنے اور سوچنے لگے اگر اس دور میں شکیب سا شاعر پیدا نہ ہوتا تو عین ممکن تھا کہ اردو

غزل ایک دم دو سو سال پیچھے چلی جاتی اور آئیندہ نسل میں اس کا

کوئی نام لیوا باقی نہ رہتا"13

معمولی سے معمولی چیزوں اور واقعات سے غیر معمولی واقعات اور اور بڑے نتائج کی نشاند ہی شکیب جلالی کا کمال فن ہے کیوں کہ شکیب جلالی کی سوچ اور مشاہدہ کافی دور رس تھا۔ زیادہ تر ناقدین نے شکیب جلالی کی شاعری کے بارے میں یہ اظہار خیال کیا ہے کہ شکیب جلالی وہ شاعر تھے جن کی شاعری جدید اور قدیم شاعری کا ایک ملا جلا سنگم ہے ،شکیب جلالی کی شاعری مبالغہ آرائی، قصیدہ خوانی اور چاپلوسی سے بالکل خالی ہے ساتھ ہی ساتھ ان کی شاعری میں عریانیت اور نفسانیت کے جذبات بھی بالکل نہیں ہیں اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی جو بھی مختصر زندگی گزاری وہ نہایت ہی مہذب اور سلیقہ مند گزاری اسی تہذیب اور سلیقہ مندی کا اثر ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے،چند اشعار ملاحظہ ہوں

کتنے طوفان اٹھے، کتنے ستارے ٹوٹے

پھر بھی ڈوبا نہیں اب تک دل بیدار یہاں

جب تک رہی جگر میں ذرا سی لہو کی بوند

مٹھی میں اپنی بند سمندر لگا مجھے

شکیب جلالی نے اپنی شاعری میں درخت، گھاس، چاند، سورج، بادل، آسمان، پھول، پتھر، پہاڑ، ندی، دن اور رات جیسی علامتوں کا استعمال کر کے اپنی شاعری کو مزید دل کش بنا دیا۔

خزاں کے چاند نے پوچھا یہ جھک کے کھڑکی میں

کبھی چراغ بھی جلتا ہے اس حویلی میں

شکیب جلالی کی شاعری سرعت کے ساتھ گزرتے وقت کا شعور اور زندگی کے مختصر ہونے احساس جا بجا ملتا ہے

اس حوالے سے ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو

بس ایک رات ٹھہرنا ہے کیا گلہ کیجے

مسافروں کو غنیمت ہے یہ سرائے بہت

شکیب جلالی کے بارے میں صامت وقار صاحب نے کیا خوب کہا ہے "شکیب جلالی شاعری کی دنیا میں ایک لہو میں تر پرندے کی طرح گرے اور اس کی چٹانوں پر اپنی تصویر چھوڑ گئے "افسوس کہ اس نئے لہجے کے شاعر نے جوانی میں ہی خودکشی کر لی

صامت وقار اپنی کتاب "شکیب جلالی فن اور شخصیت" میں لکھتے ہیں

"شکیب نے روایت میں جدت کی آمیزش کرتے ہوئے اپنی انفرادی صلاحیتوں کو اس ہنرمندی سے برتا کہ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے والا رائج الوقت فلسفوں میں جوہری تبدیلیوں کا مشاہدہ کرتا ہے ، شکیب ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ گزرتے ہوئے وقت اور گزر جانے والے وقت میں فرق فقط اس قدر نہیں کہ اول الذکر کا تعلق زمانہ حال سے اور ثانی الذکر کا زمانہ ماضی سے ہے بلکہ اصل فرق خارج اور باطن کا ہے "14

اس حوالے سے شکیب جلالی کا یہ شعر ملاحظہ ہو

بوجھ لمحوں کا ہر اک سر سے اٹھائے گزرا
کوئی اس شہر میں سستانے کو ٹھہرا ہی نہیں

بنی نہیں جو کہیں پر کلی کی تربت تھی
سنا نہیں جو کسی نے ہوا کا نوحہ تھا

وحید اختر (12۔اکتوبر1936)

12 اکتوبر 1935 ء میں مومن پورہ، اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، وحید اختر مشہور شاعر و نقاد تھے، انھوں نے شاعری کی زیادہ تر صنفوں میں تبع آزمائی کی اور تواتر کے ساتھ مضامین بھی لکھے۔ احمد فراز کی طرح وحید اختر کا بھی اردو اور فارسی کے پرانے شعرا مثلاً انیس و دبیر اور حافظ و شیخ سعدی اور بیدی وغیرہ سے خاص ذہنی تعلق تھا۔ ان کے کلام میں صاف ستھرا اور معیاری اسلوب نظر آتا ہے، انھوں نے اپنی زبانی پر آشوب معاشرے اور ظلم و جبر کے خلاف پر تشدد انداز میں اظہار بھی کیا ہے ان کی شاعری سماج اور معاشرے کا آئینہ ہے۔

وحید اختر نے اپنی شاعری کو چیستاں نگاری سے بچائے رکھنے کی پوری کوشش کی وحید اختر کی شاعری میں زندگی کے خواب اور حقیقت کی آمیزش دیکھنے کو ملتی ہے، وحید اختر کی شاعری میں خواب اور شکستِ خواب کا ذکر کافی ملتا ہے اس کے ساتھ ساتھ وحید اختر کی شاعری میں ماضی کی یادیں بھی ہیں۔ کوثر مظہر وحید اختر کی شاعری کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

> "وحید کی شاعری میں انسانی وجود کی حقیقت، خموشی کا فلسفہ، ماضی کا عکس، تنہائی کے آثار، رات اور موت کی موشگافی جگہ جگہ ملتی ہے"15

سجاد ظہیر وحید اختر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

> "وحید اختر اپنی شعری کاوش میں اپنے روحانی کرب کی شدید ترین چبھن کا اظہار کرنے کے ساتھ اپنے ذہن اور فکر اور شعور کی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لانے اور اس فکر کو اپنے تخیل اور اپنے خوابوں کی بلند ترین پروازوں کے ساتھ مدغم کرنے سے گریز نہیں کرتے"16

وحید اختر کی شاعری کا آغاز بھی احمد فراز کی شاعری کی طرح1948 میں ہوا ان کی پہلی نظم 1948 میں منظر عام پر آئی۔ پیاس، تشنگی، سمندر جیسے تلازم وحید اختر کی غزلوں میں بہت نظر آتے ہیں وحید اختر کی

بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تمام تر مجرد اور غیر مجرد تجربات انسانی کو تخلیقی حسیت سے ہم آمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس نوع کی مثالیں ان کی غزلوں میں بھی پڑی ہیں ۔وحید اختر کے یہاں از خود رفتگی، خود آگہی، بے خبری، گم شدگی اور تشکیک جیسے موضوعات بھی ملتے ہیں۔

فراز جیت کے بھی تشنہ لب رہی غیرت
ہزار تیر ستم ظلم کی کمیں سے چلے
تمام گمرہیاں دیر اور حرم میں پلیں
تمام سلسلئہ کفر اہل دیں سے چلے

فراز کے مانند وحید اختر نے بھی اپنی شاعری میں کلاسکیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا وہ ایک کلاسکی مزاج کے شاعر تھے جن الفاظ وتراکیب کا انھوں نے استعمال کیا ہے وہ مرثیہ گو، ترقی پسند اور رومانی شعراء سے مستعار ہے ، انھوں نے کلاسکی لفظیات اور جدید شاعری کا آہنگ تشبیہ ، استعارہ اور محاکات کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ قدیم اور جدید امیجری شیر وشکر ہوگئ ہے۔

وحید اختر نے داخلیت وخارجیت، روح ومادہ اور وجدان وشعور کو جس انداز میں اپنی شاعری میں سمیٹا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں داخلی تجربوں کے اظہار کے لئے علامتی، استعاراتی اور فکری لہجہ اختیار کیا ہے اور اسی کی پاداش میں وہ اپنے عہد کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے اجتماعی زندگی میں فرد کی اجنبیت کے احساس کو چابک دستی کے ساتھ ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

وحید اختر کی شاعری میں ہمارے دور کے احساسِ جرم ،خوفِ تنہائی انتشاری کیفیت اور ذہنی بے چینی کا کسی نہ کسی نہج پر اظہار ہوا ہے ان کی شاعری جدید صنعتی ، مشینی اور میکانیکی تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوش حالی ذہنی کھوکھلے پن روحانی دیوالیا پن اور احساسِ بے چارگی سے عبارت ہے ان کی شاعری کے یہ سارے رجحانات ان کی اپنی ذات کا اشاریہ ہیں وہ بین الاقوامی سطح پر زندگی کے اتار چڑھاؤ کا شعور رکھتے تھے اس لئے وقت کا ہر لمحہ ان کے شعری تجربات کا محرک بن جاتا تھا ان کی نظموں میں علامت نگاری

کے بھی بعض اچھے نمونے نظر آتے ہیں وہ علامتوں کا استعمال بہت سلیقے سے کرتے ہیں وحید اختر کی شاعری میں استعارہ سازی کا رجحان بھی ملتا ہے وہ اپنی شاعری کے ذریعے معلوم اور نامعلوم کے درمیان ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی شاعری ایک مطمئن جسم اور بے چین روح کی شاعری ہے موجودہ دور کی سچی عکاسی اور ترجمانی ان کی شاعری میں دیکھی جا سکتی ہے اس حوالے سے انکی ایک نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

اتنے چہرے کہ ہر چہرہ گم ہو گیا

اتنی آبادیاں ہیں کہ انسان جنگل میں گم

میرے چاروں طرف جسم کا دشت ہے نوحہ خواں

یہ امڈتے ہوئے تند سیلاب کی طرح بے چہرہ آبادیاں

مجھ کو ڈر ہے بہالے نہ جائیں کہیں زندگی کے نشاں

وحید اختر کو معاشرے کی نفسیات کا علم ہے اور اسے اپنی نظموں میں پیش کرنے میں انھیں قدرت حاصل ہے معاشرے کا اصلی چہرہ دکھانے میں کہیں کہیں ان کے یہاں ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے اور طنز کی مشتری میں تیزی ی کا بھی احساس ہوتا ہے مگر پھر بھی وہ متانت کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے وحید اختر کے یہاں مایوسی کے بعد امید کی جھلک اور روشن مستقبل کا احساس ملتا ہے

انھوں نے اپنی شعری صلاحیت کو معاشرے کی اصلاح اور بے راہ روی زبوں حالی عدم مساوات تنہائی بے بسی مظلومی کے خلاف مقصدی رنگ و آہنگ میں استعمال کیا ہے ان کی شاعری کا مقصد انسانی فلاح اور ترقی ہے. وحید اختر کا مطالعہ نہایت وسیع تھا ان کے مطالعے کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ شعری ادب کا کوئی موضوع ان کی گرفت سے باہر نہ تھا. مقصدیت اور اور انقلابی رویہ نہ ہونے کے باوجود ان کی شاعری میں خطیبانہ آہنگ بھی پایا جاتا ہے.

بشیر بدر:(15 فروری 1935)

بشیر بدر 15 فروری 1935 میں کانپور میں پیدا ہوئے۔۔وہ جدید غزل گو شعراء میں صف اول کے شاعر مانے جاتے ہیں ان کے یہاں اپنے دوسرے معاصرین کے مقابلے تجریدیت کے عناصر کم ہی ملتے ہیں، شروع میں انھوں نے روایت کی پاسداری کی تاہم چند دنوں بعد انھوں نے اس سے روگردانی شروع کر دی اور ایسے اشعار کہنے شروع کر دیے جن میں مثبت قدروں کے مقابلے میں منفی قدریں زیادہ ہیں ان کی غزلوں میں دو رجحانات واضح طور را موجود ہیں ایک تو سنجیدہ جہاں وہ اس طرح کے شعر کہتے نظر آتے ہیں

چراغوں کی لو سے ستاروں کی ضو تک
تمھیں ہم ملیں گے جہاں رات ہو گی

اور دوسرا رجحان غیر سنجیدگی اور منفی قدروں میں ڈوبا ہوا ہے جیسے کہ

دن کے سارے کپڑے ڈھیلے ہو گئے
رات کی سب چولیاں کسنے لگیں

انھیں وجوہات کی بنا پر کبھی تو وہ دلی کے دبستان سے تعلق رکھنے والے شاعر نظر آتے ہیں اور کبھی لکھنؤ کی ریختی کے شاعر معلوم ہوتے ہیں تاہم ان تمام تضادات کے باوجود ان کی غزلوں میں منفی قدروں والے مواد سے صرف نظر کر لیں تو ان کی غزلوں میں اختراعی اور اکتسابی قدریں ملتی ہیں ان کی اختراعات تشبیہات لفظیات، اور اسلوب میں موجود ہیں۔ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس کہتے ہیں

"بشیر بدر ہم عصر غزل کے نمائندہ شاعر ہی نہیں اس کی مقبولیت اور رفعت کے اہم معمار بھی ہیں، جدید تر غزل میں ان

کی آواز اپنے گوناگوں شعری محاسن کے لحاظ سے ایک پہچان رکھتی ہے"17

ان کی غزل گوئی پر پر تبصرہ کرتے ہوئے نظام صدیقی لکھتے ہیں

"بشیر بدر، ہندو پاک کی نئی غزلیہ شاعری کے درخشاں ہفت سیارہ(ناصر کاظمی، خلیل الرحمن اعظمی، شکیب جلالی، بشیر بدر، شہزاد احمد، بانی اور ساقی فاروقی) میں ایک بے حد خوشنما اور خوش اسلوب شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی غزل اپنے دور کی روح میں گھومتا ہوا آئینہ ہے، جس میں ان کی باطنیت کی وسعت اور ہمہ گیری اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے"18

ہیئت کے لحاظ سے بشیر بدر کا ایک تجربہ نثری غزل کا بھی ہے،انھوں نے غزل کی شناخت ہیئت کے بجائے اس کی تہذیبی خصوصیات کی بنا پر کی ہے اور یہ موقف اختیار کیا ہے کہ غزل کا تہذیبی جوہر اگر نثری جملوں کی صورت میں ادا ہو جائے تو وزن کی پابندی بھی اٹھا دینی چاہئے،اس حوالے سے بشید بدر کی غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

میں اپنی زبان کاٹ کر ہتھیلی پر رکھوں گا
برفانی گدھ اسے جھپٹ کر آسماں پر چلا جائے گا
دن کے خارش زدہ کتے میری ہڈیاں چچھوڑیں گے
بوڑھا باب میرے زخموں پر آگ کا مرہم لگائے جائے گا
لیکن رات کے سینے میں سیٹیاں چیخیں گی
اور انجن صبح کے منہ کالک مل کر چلا جائیگا

مظفر حنفی: 1- اپریل1936

مظفر حنفی 1- اپریل 1936 کو کھنڈوا مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئے، برکت اللہ، یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی، برصغیر کے منفرد اسلوب رکھنے والے شاعروں میں مظفر حنفی کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی درجنوں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ مظفر حنفی موجودہ شعرا میں منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

مظفر حنفی نے اپنا تخلیقی سفر ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ شروع کیا تھا۔ اس وقت ترقی پسند تحریک اگرچہ اپنی گھن گرج ختم کرچکی تھی لیکن اس سائے میں رہنے والے ابھی کافی شاعر موجود تھے۔ مظفر حنفی نے مزید اسی سائے میں رہنے کے بجائے شعر کی داخلی کیفیت کو اُبھارنے کی قابلِ قدر سعی کی اور اس کے لئے ایسا خوبصورت غیر رسمی انداز قبول کیا جو پہلے بہت کم پایا جاتا تھا۔ ان کا ایک مخصوص اسلوب ہے جس میں بلا کی ذہانت اور طنز ہے۔ مظفر حنفی شاد عارفی کے شاگرد رہے مظفر حنفی نے اپنی غزل کو کھردری غزل کہا ہے جس کے آئینے میں اس صدی کے زخم نظر آتے ہیں مظفر حنفی کی شاعری تیکھے امکانات کی شاعری ہے ان کی شاعری میں نئ ہئیت کی نسبت شعر میں مواد کی بنیاد کو لازمی قرار دیا ہے۔ مظفر حنفی کے اشعار کی منجملہ خصوصیات میں سے ایک خاصیت ان کے مقطعے ہیں، جو ہر انفرادی غزل کے مواد کو، ایک تحکمانہ فیصلہ کے ساتھ تکمیل کی منزل تک پہونچا دیتے ہیں۔ اس حوالے ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو

مظفر آپ کی ترچھی اڑانیں کام آئیں گی
سنا ہے فن کے دروازے پہ پہرے دار بیٹھے ہیں

مظفر حنفی کی غزل کا مقطع ایک ایسے شاعر کی داخلی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے، جو جبر و اختیار کی کش مکش میں شامل ہے۔ عوامی اور اجتماعی احساس سے پوری طرح وابستہ رہ کر اپنی انفرادیت اور کج کلاہی کو قائم رکھنا چاہتا ہے، مظفر حنفی نے قدیم سچائی کو جدید اسلوب میں قائم کیا ہے، وہ نہ تو خود انکشافی سے خوف کھاتے ہیں اور نہ جذبے پر بند باندھنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے اشعار میں دھیمی دھیمی بہنے والی جوئے آب کی سی سوئی ہوئی روانی نہیں ہے۔ پہاڑی چشمے کی سی تند و تیز لہر ہے۔ ان کے اشعار میں تلوار

کی کاٹ ہے۔ ایک برہم نوجوان کے لہجے کی تلخی ہے۔ اس میں کچھ توڑنے اور پھر جوڑنے کی بات بھی ہے۔ جس زمانے میں مظفر حنفی ادب میں داخل ہوئے وہ زمانہ ترقی پسندی کے زوال کا تھا۔ مظفر حنفی کا فن رسمی تزئین اور روایتی نقالی سے ممتاز ہے

مظفر حنفی کی غزل گوئی کے حوالے سے وزیر آغا کے خیالات ملاحظہ ہوں

> مظفر حنفی کی غزل، جدید اردو غزل کی سمفنی سے پھوٹا ہوا ایک منفرد تازہ، پیچ و خم کھاتا ہوا دل موہ لینے والا وہ سر ہے جس نے غزل کے "کل" سے لحظہ بھر کے لئے الگ ہو کر اپنے وجود کا اثبات کیا ہے مگر پھر لپک کر غزل کی سمفنی میں دوبارہ شامل ہو گیا ہے، تجربے اور روایت کا بنتا بگڑتا سنجوک مظفر حنفی کی غزل کا امتیازی وصف ہے"19

۱۹۶۰ء کے بعد کے غزل گو شاعروں کی اگر فہرست بنائی جائے تو ان میں صف اول کے فنکاروں میں شہر یار، احمد فراز اور مظفر حنفی وغیرہ کے اسمائے گرامی کی شمولیت ضروری ہو گی۔

مظفر حنفی کی شاعری میں تیکھا پن، تندی و تیزی، احتجاجی لے، بے تکلفی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے اس حوالے سے ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

بلا سے گرد تغزل مری غزل میں نہیں
جدید لہجہ گھٹن کو تو صاف کرتا ہے

مظفر حنفی کی شاعری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری میں تخیل کی بلندی نہیں پائی جاتی بلکہ حقیقت پسندی ان کی شاعری کا وصف ہے کیوں جب وہ حقیقت پسندی کو اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں تو تخیل کے بجائے واقعیت کا دخل زیادہ ہوتا ہے۔ احمد فراز کی طرح مظفر حنفی بھی اپنی جدید شاعری میں کلاسکیت کا دامن چھوٹنے نہیں دیتے مظفر حنفی کی احتجاجی شاعری کے حوالے سے ممتاز الحق اپنے مضمون "سفر : حنفی کی شاعری کا ایک روشن استعارہ" میں لکھتے ہیں

"وہ چیختے ہیں احتجاج کرتے ہیں ، ہر طرح کے ظلم بربریت ،
تعصب ،ناانصافی ، ، مفاہمت اور ظلمت پسندی کے خلاف ان
میں سچ کو سچ کہنے کا حوصلہ ہے وہ کسی خوف یا مصلحت کی بنا پر
اپنے کو سچائی سے باز نہین رکھ سکتے

خنجر ترا پیاسا ہے تو سچ بول رہا ہوں
پھندا ترا خالی ہے تو اونچا ہے مرا سر "20

ممتاز الحق اپنے مضمون "سفر : حنفی کی شاعری کا ایک روشن استعارہ" میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں

"مکار ، فریبی ، منافق ، لالچی ، بے ایمان، ہٹ دھرم ، تشدد ،
تفرقہ پردازی، امن دشمنی کو فروغ دینے والے کسی شخص یا کسی
ادارے سے وہ کسی قیمت پر مفاہمت کرنے کو تیار نہیں "21

مظفر حنفی ہندوپاک کے ایسے منفرد غزل گو شاعر ہیں جنھیں اپنے لہجے کی بنا پر ادور سے ہی پہچانا جاتا ہے، مظفر حنفی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں، وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ معروف ادیب، محقق ، مترجم اور افسانی نگار بھی ہیں لیکن بنیای طور پر اوہ شاعر ہی ہیں، حق گوئی، بے باکی، اجتماعی احساس سے وابستگی کے باوجود اپنے کو سب سے الگ رکھنے کی خواہش، انانیت، خودداری، نمود و نمائش کرنے والوں، منافقوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی عادت مظفر حنفی کے مزاج کی خصوصیت ہے، ان کے اندر سچ کو سچ کہنے کا حوصلہ ہے، ان کی شاعری کا طنزیہ پہلو خاص اہمیت کا حامل ہے، وہ بیک وقت تہذیب و معاشرت، مذہب، وسیاست، ادب وشاعری اور خود اپنی ذات کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں، ان کے طنز میں سنجید گی، لطافت اور ایک آزادانہ فضا کا احساس ہوتا ہے، ان کے یہاں جدیدیت کا صرف ایک ہی رخ نہیں ملتا وہ روایت سے بغاوت نہیں کرتے ، روایت سے اپنا رشتہ استوار رکھنے کی وجہ سے مظفر حنفی عام جدید شعرا کی طرح بے راہ روی کا شکار نہیں ہوتے انھوں نے روایت کے صالح اور جاندار عناصر کو اپنی شاعری میں جذب کیا۔ ساتھ ہی فرسودہ رواتوں کو توڑ کر نئ رواتوں کی تخلیق کی، جس کا اظہار انھوں نے اپنے اشعار میں یوں کیا ہے۔

شاہراہوں پر تو مجمع ہے مظفر صاحب

شعر کہنے کے کئی اور بھی رستے ہوں گے

مظفر حنفی کی غزلوں میں جدید غزل کے تقریباً تمام رگ یکجا ہو گ ہیں، ابتدائی دور کی تجرباتی شاعری لیکر علامت پسندی، پیکر تراشی، بے تکلف غزل، ابہام سے ابلاغ تک کا سفر انھوں نے بڑی جواں مردی سے طے کیا۔ مظفر حنفی اپنی غزلوں میں ہندی کے سیدھے سادھے اور عام بول چال سے قریب بہت سارے الفاظ کا ستعمال کیا ہے، مثلاً وہ کہتے ہیں ۔

سہج سہج اپلوں سے آنچ نکلتی ہے

ترل ترل بہتی ہے نالی رات ہوئی

شہریار(16جون1936)

دنیائے ادب میں جن کو شہریار کے نام سے جاناجاتا ہے ان کا اصلی نام کنور اخلاق محمد تھا، ان کے آباؤ اجداد راجپوت تھے پرتھوی راج چوہان کے زمانے میں ان کے آباؤ اجداد نے اسلام قبول کیا تھا، 16 جون 1936 ء کو آنولہ ضلع بریلی میں ان کی ولادت ہوئی اور ولادت کے دو روز بعد ہی ان کے والد ہردوئی منتقل ہو گئے تھے۔

اردو شاعری میں شہریار ایسا معتبر نام ہے جس کے بغیر جدید اردو غزل کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی، جدید غزل کی آبیاری کرنے اور اس کو سنوارنے میں شہریار کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جائیگا، انھوں نے شاعری کا خام مواد اپنے آس پاس کی زندگی سے حاصل کیا ہے۔

شہریار کی شاعری کے مطالعہ سے یہ نتیجہ بہ آسانی نکالا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری کے خمیر میں جدید اردو شاعری کی بوباس شامل ہے انھوں نے زندگی کو ہر رنگ میں دیکھا اور پرکھا ہے اور اپنی شاعری میں اس کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ شہریار نے جہاں اپنی شاعری میں انسانی تہذیب و معاشرت کو جگہ دی، وہیں انسانی رشتوں کو بھی سامنے رکھا اور لوگوں کو جسم و حسن سے اوپر اٹھ کر رشتہ قائم کرنے کی دعوت دی ہے وہ اپنی ایک نظم میں لکھتے ہیں

ہوس سوا کوئی نہیں
تمھیں بھی اس کا علم ہے
خبر مجھے بھی اس کی ہے
کبھی تم اپنے جسم سے
الگ ملو مجھے کہیں
کہ میں تو اپنے جسم سے جدا کبھی ہوا نہیں

(ہوس سوا کوئی نہیں)

شہریار کے یہاں جو بھی شاعری جسمانی لمس اور جنس پر مبنی ہیں وہ ہونٹوں سے آگے نہیں بڑھ پائی ہے اس لئے کہ اس سے آگے روحانی زوال کی منزل شروع ہوتی ہے اور بیان کا مزا بھی زائل ہو جاتا ہے

۔شہر یار کی شاعری میں ایک ایساماحول ملتاہے جس میں سکون و سرور ذرا کم ہے اس میں نفسیاتی کڑواہٹ بھی ہے اور اندر سے ٹوٹنے بکھرنے کی شکایت بھی، شہر یار کے موضوعات چاہے کچھ بھی ہوں وہ اپنے جذبات واحساسات کے متعلق پر خلوص ہیں ان کی شاعری ہمارے احساس وجذبات سے گفتگو کرتی ہے ۔انھوں نے اپنی شاعری کو براہ راست پیش کرنے کے بجائے اپنی زیادہ تر نظموں کو علامت اور استعاراتی رنگ میں پیش کیا ہے ، شہر یار نے شاعری کے موضوعات کے دائرہ کو وسیع کیا ان کے استعمال کئے ہوئے الفاظ کو صرف لغت کی مدد سے نہیں سمجھا جاسکتا ہے بلکہ انھوں نے ان الفاظ کو لغوی معنی کی سطح سے ہٹ کر استعمال کیا ہے اور اپنے ذاتی تجربات کو پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں زندگی میں وارد ہونے والے مختلف قسم کے حادثات وواقعات کو اپنی شاعری میں تخلیق کے درجہ تک پہنچایا مزید یہ کہ انھوں نے اپنی شاعری کو سیاست کے حوالے نہیں کیا۔ شہر یار نے اپنے موضوعات، طرزِ اظہار اور طرزِ احساس کے وسیلے سے اپنی انفرادیت قائم کی جس کو ان کے بعد کی نسل یاد کرتی رہے گی۔

وہ اگر خواب بھی دیکھتے ہیں تو وہ ارضی ہوتا ہے ہمیں کسی اور دنیا کی سیر نہیں کرواتے، شہر یار کی نظموں میں فلسفیانہ رو ساتھ ساتھ چلتی ہے اور علامتیں نئی معنویت کے ساتھ منکشف ہوتی ہیں، ان کی شعری دنیا بے حد وسیع ہے، ان کے یہاں تفکر اور شعریت کا دل کش رچاؤ ملتا ہے، ان کی نظموں میں اساطیر کی مدد سے تمثالوں کی معنویت کو پر تاثیر بنانے کی بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں، تاریخی تسلسل اور ارتقاء کے آئینے میں رکھ کر وہ معاصر زندگی کا جائزہ لیتے ہیں،

زرد بلبلوں کے بازؤں میں اسیر
سخت بے جان لمبی کالی سڑک

اپنی بے نور دھندلی آنکھوں سے
پڑھ رہی ہے نوشتۂ تقدیر

(عہد حاضر کی دل ربا مخلوق۔)

شہر یار اگرچہ کم گو ہیں لیکن جو بھی لکھتے ہیں سوچ کر لکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں توازن، ضبط اور سنجیدگی کا احساس ہوتا ہے۔

عجب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

بچھڑنا ہے تو بچھڑ جا اسی دوراہے پر
کہ موڑ آگے سفر میں کہیں نہیں آتا

شہر یار کے یہاں تخلیقیت کا جو اظہار ملتا ہے وہ ان کے معاصرین کے یہاں کم ہی نظر آتا ہے، شہر یار کی غزلوں میں نفسیاتِ انسانی پوری طرح جلوہ گر ہے، نئے عہد کی لایعنیت کے احساس نے انسان کو بے چین اور بے گانہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے انسان اندر سے ٹوٹ کر بکھر گیا ہے، اس کا اظہار شہر یار بڑے فنکارانہ انداز میں کرتے ہیں۔

جان بھی میری چلی جائے تو کچھ بات نہیں
وار تیرا نہ مگر ایک بھی خالی جائے

تجھ کو رسوا نہ کیا خود بھی پشیماں نہ ہوئے
عشق کی رسم کو اس طرح نبھایا ہم نے

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

شہر یار نے ابتدا سے ہی کلاسکی روایت کا احترام کیا اور روایت کے مثبت عناصر کو قبول کر کے جدید ذہن کے مطابق نئے اسلوب کی تشکیل کی، ان کی غزلوں میں مخصوص لہجے اور ان میں معنی کی نئ پرتوں سے پہچانی جاتی ہیں، وہ اپنے عہد کے تلخ حقائق اقدار کی شکست اور تہذیب کے مسائل کا اظہار نہایت موثر انداز میں کرتے ہیں، شہر یار اس لحاظ سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کی شاعری گہری تخلیقی قوت رکھتی ہے، وہ فرد کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں۔ اسی لئے انھوں نے جو بھی جذبات و احساسات اپنی غزلوں میں پیش کئے ہیں وہ ایک متعین اور معنی خیز لہجے میں ڈھل گئے۔

شہر یار کے یہاں عاشق اور معشوق کے مختلف کردار، عشق کی بدلتی ہوئی کیفیات اور احساس میں آتی ہوئی تبدیلی نے عشقیہ رویوں میں بھی تبدیلی پیدا کر دی ہے، جس کی وجہ سے عشق کی نوعیت میں بھی فرق آیا ہے اور عاشق و معشوق کے کردار بھی بدلے ہیں۔

بچھڑ کے تجھ سے مجھے یہ گمان ہوتا ہے
کہ میری آنکھیں ہیں پتھر کی، جسم سونے کے

ان کے یہاں استعاراتی نظام بہت مربوط ہے، جدید شاعری میں " شہر کی علامت کو فراز کے یہاں نمائندہ علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، شہر یار نے بھی اس علامت میں بالکل نئے معنی پیدا کئے ہیں

عافیت آوارگی کا فرق مٹ جائیگا اب
سرحدیں صحراؤں کی ملنے لگی ہیں شہر سے

پیکر سازی بھی شہر یار کی شاعری کا خاص وصف ہے ان کی پیکر سازی کا عمل اپنے اندر مفاہیم کی گہرائی اور معنویت میں بے پناہ امکانات پیدا کر دیتا ہے. ان کی شاعری میں بصری پیکروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، ان کے یہاں شاعری میں لفظی نظام، ان سے پیدا ہونے والے معنی اور ان کا آہنگ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔

شہر یار نے نئی شاعری کا رشتہ روایت سے جوڑتے ہوئے جس طرح شعری تجربوں کو جدید حسیت سے ہم آہنگ کیا ہے وہ قابل ستائش ہے ، فراز کے معاصرین میں شہریار ہی ایک ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں شعری روایت اور جدید حسیت کا خوبصورت نظام پایا جاتا ہے ، شعری روایت سے ان کی اٹوٹ وابستگی اور تشکیل پاتا ہوا منظم استعاراتی نظام شہریار کی وہ خدمات ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے

۔

شہر یار نے سمندر ، دریا، پیاس ، دشت ، صحرا، گھر ، ہوا، سفر ، شجر ، ہجر و وصال اور رات وغیرہ علامتوں کا بہت زیادہ استعمال کیا ہے ، اس کے ساتھ ہی خواب ، دھند ، گرد ، ریت ، سایہ ، پرچھائیں وغیرہ ان کی مخصوص علامتیں ہیں ان کی جدید شاعری کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

روح سے تو پہلے دن ہی ہار مان لی
بوجھ اپنے جسم کا بھی ڈھونہ پائے ہم

عمر کی لمبی مسافت ہر قدم کھلنے لگی
تیری پرچھائیں مرے ہمراہ کیوں چلنے لگی

شہر یار نے اردو زبان وادب کی نمایاں خدمات انجام دیں، شاعری کی شکل میں انھوں نے جو کارنامہ انجام دیا وہ ہمیشہ اردو ادب کی تاریخ میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا۔ ان کا پہلا شعر مجموعہ " اسم اعظم " 1965ء میں منظر عام پر آیا۔ دوسرا مجموعہ "ساتواں در" کے نام سے 1969 میں۔ تیسرا شعری مجموعہ " ہجر کے موسم" کے نام سے 1978ء میں۔ چوتھا شعری مجموعہ "خواب کا در بند ہے" کے نام سے 1985 میں۔ پانچواں شعری مجموعہ "نیند کی کرچیں" 1996 میں۔ اور 2004 میں "شام ہونے والی ہے" کے نام سے چھٹا شعری مجموعہ شائع ہوا جبکہ ان کے انتقال کے ایک سال بعد 2013 میں "سورج کو نکلتا دیکھو " کے نام سے کلیات شہریار ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع ہوا

13 فروری 2012ء کی شام 8 بجکر 15 منٹ پر علم وادب کا یہ دبستان ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

ندافاضلی(12اکتوبر1938)

ندافاضلی کااصلی نام مقتدی حسین تھاندافاضلی عمر میں احمد فراز سے تقریباً7 سال چھوٹے تھے ان کی پیدائش 12 اکتوبر 1938 میں ہوئی،اور 2016 میں احمد فراز سے تقریباً آٹھ سال بعد انتقال بھی ہوا۔ قیام پاکستان کے وقت ندافاضلی کا پوراخاندان ہجرت کرکے پاکستان چلا گیا تھا لیکن ندافاضلی نے تنہا ممبئی میں قیام کافیصلہ کیا۔

ندافاضلی کوغالب ایوارڈ،جے دیال ایوارڈ،روٹری ایکس لینٹ ایوارڈ،اور اسکرین ایوارڈ سے نوازا گیا۔

بنیادی طور پر ندافاضلی کا ذہن غزل کا ذہن تھا انھوں ے کلاسکی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے غزل میں نئے افکار،ندرتِ بیان کی شادابی سمودی ہے،ان کی غزل،جدید غزل،مابعد جدیدیت اور ساختیات پس ساختیات کے ادبی تنقید کے تعین کردہ زاویے سے بہت آگے نکل گئی تھی،فراز نے اپنی شاعری کا خمیر پاکستان کی مٹی سے اٹھایا تھاجبکہ ندافاضلی نے اپنی شاعری کا خمیر ہندوستان سے اٹھایا،ہاں یہ ضرور ہے کہ جس طرح احمد فراز نظریاتی طور پر ترقی پسند تھے اسی طرح ندافاظلی بھی نظریاتی طور پر ترقی پسند تھے۔

ندافاضلی کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت ان کی نئی لفظیات ہے اور اس اعتبار سے انھوں نے نہ صرف بڑی جراتمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی غزلوں میں عام فہم سیدھی سادی،ہندی آمیز زبان کا استعمال کیا بلکہ تشبیہات،استعارے،پیکر اور علامتیں بھی ہندوستان کے دیہاتوں،قصباتی محلوں اور شہر کی فٹ پاتھوں سے چنی ہیں،ان کی شاعری جیتی جاگتی ہندوستانی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نیل گگن میں تیر رہا اجلا اجلا چاند
ماں کی لوری سا،بچوں کی دودھ کٹوری جیسا چاند

ساجن جنگل پار گئے،میں چپ چپ راہ تکوں
بچھیا بیٹھی تھان میں اونگھ،میں کس سے بات کروں

گرج برس پیاسی دھرتی پر، پھر پانی دے مولا
چڑیوں کو دانے، بچوں کو، گڑ دھانی دے مولا

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے چوکا باسن چمٹا پھکنی جیسی ماں

ویسے تو ندا فاضلی کا شمار جدید شعراء میں ہوتا ہے اور ان کی شاعری موضوعاتی اور اسلوبی نقطۂ نظر سے ترقی پسند شاعری سے یکسر مختلف ہے تاہم وہ ترقی پسند تحریک کے فکری دھارے کے مخالف نہیں ہیں۔
احمد فراز ہی کی طرح ندا فاضلی کو بھی شاعری ورثے میں ملی تھی ان کے والد مرتضی حسن ایک قابل قدر شاعر تھے اور داغ جیسے شاعر کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے گویا کہ فراز ہی کی طرح ندا فاضلی کی پرورش بھی شعری اور ادبی ماحول میں ہوئی تھی۔
ندا فاضلی کی نظموں میں کھڑکیاں باتیں کرتی ہیں، بوڑھے دروازے سوچ بچار میں مصروف نظر آتے ہیں، شہر ماں کا ستعارہ بن جاتا ہے، سگریٹ کا دھواں گفتگو کرنے لگتا ہے اور سوئی کا دھاگا الفاظ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔
ندا فاضلی کی شاعری میں خاندانی رشتے ہندوستانی مزاج کی پوری رنگینی اور عصری انتشار کے ساتھ آتے ہیں،

میری ماں
ہر دن اپنے بوڑھے ہاتھوں سے
ادھر ادھر سے مٹی لا کر
گھر کی کچی دیواروں کے زخموں کو بھرتی رہتی ہے
تیز ہواؤں کے جھونکوں سے
بے چاری کتنی ڈرتی ہے

میری ماں کتنی بھولی ہے
برسوں کی سیلی دیواریں
چھوٹے موٹے پیوندوں سے
آخر کب تک رک پائیں گی
جب کوئی بادل آئیگا
گرجے گا
ہر ہر کرتی ڈھے جائیں گی

ندا فاضلی کی شاعری میں دنیا اور دنیا کا انتشار ملتا ہے، ہر جگہ پھیلی ہوئی سیاست، اقتدار کی جنگ، ایٹمی بلاؤں کا نزول، سائنٹفک ترقی کی رحمتیں اور مصیبتیں، سماجی تصویریں، فلسفے کی موشگافیاں، نفسیاتی ادھیڑ بن، امن و انسانیت کی ظاہری باتیں، جنگ کی تباہ کاریاں وغیرہ ندا فاضلی جغرافیائی حد بندیوں اور سرحدوں پر کھینچی گئی لکیروں کے قائل نہیں تھے۔ ان کی شاعری میں محبوب کی سادگی پر مٹنے کی تمنا، وفا کا غرور، شب ہجر کی لمبائی، جدائی کی گھڑیاں، جسم و روح کے درمیان مٹتا ہوا فاصلہ ان کی شاعری میں خوبصورت انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

کچے بخئے کی طرح رشتے اجڑ جاتے ہیں
لوگ ملتے ہیں مگر مل کے بچھڑ جاتے ہیں

احمد فراز کے مانند ندا فاضلی کی تمام تخلیقی کاوشوں کے پس منظر میں وہ تمام حالات شامل ہیں جو تقسیم ملک کے بعد پیدا ہوئے اور پھر ان کا اپنے گھر والوں سے چھپ کر ہندوستان آنا، گوالیار میں بھٹکنا اور غم روزگار سے دوچار ہونا وغیرہ۔

ندا فاضلی کا اسلوب تھوڑا سا جدا ہے وہ ہندی، اردو اور کہیں سنسکرت کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں

وہ روپ تھا یا رنگ تھا، ہر پل جو میرے سنگ تھا
میں نے کہا تو کون ہے، اس نے کہا تیری نظر

ندا فاضلی کی شاعری جہاں ایک طرف تغیراتِ زمانہ اور اصلاحی پہلو کو سمیٹے ہوئے ہے وہیں دوسری طرف ان کی شاعری جرات آمیزی اور احتجاجی لہجہ اختیار کر لیتی ہے تاہم یہ احتجاجی لہجہ اتنا شدید نہیں ہوتا جتنا شدید احمد فراز کا ہوتا ہے

ہر ایک بات کو چپ چاپ کیوں سنا جائے
کبھی تو حوصلہ کہہ کے نہیں کہا جائے

فراز کی طرح ندا فاضلی نے سیاسی ناچاقیوں ، فرقہ واریت اور عوامی استحصال جیسے موضوعات کو بھی شاعری کا پیکر دیا ہے

آج اور کل کی بات نہیں ہے صدیوں کی تاریخ یہی ہے
ہر آنگن میں خواب ہیں لیکن چند گھروں میں تعبیریں ہیں
جب بھی کوئی تخت سجا ہے میرا تیرا خون بہا ہے
درباروں کی شان و شوکت میدانوں کی شمشیریں ہیں

ندا فاضلی مزاج کے باغی ، سرشت سے رندانہ اور رواج سے صوفی تھے ۔ ندا فاضلی نہ صرف اپنی شاعری کو تہذیبی و عصری آگہی کا مظہر بنایا بلکہ انھوں نے ملک میں پھیلی فرقی پرستی پہ کڑی تنقید بھی کی ہے اور اس سے نئی نسل کو بھی متاثر کیا ہے

اچھی تھی وہ کتاب عجب اتفاق ہے
پھر ہو گئی خراب عجب اتفاق ہے

مخمور سعیدی (31-دسمبر1938)

مخمور سعیدی ۱۳دسمبر1938ءٹونک(راجستھان)میں پیدا ہوئے دنیا انھیں مخمور سعیدی کے قلمی نام سے جانتی ہے مخمور سعیدی مشہور زمانہ اور شہرت یافتہ شاعر بسملؔ سعیدی کے شاگرد رہے / فروری ۱۹۵۳ء میں تلاشِ معاش کے سلسلے میں دہلی آگئے تھے

مخمورؔ سعیدی کی شاعری کا آغاز ۱۹۴۹ء سے ہوتا ہے ان کے بیشتر معاصر شعرا ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے۔1960ء میں ترقی پسند تحریک کے ردِ عمل میں 'جدیدت' کی تحریک شروع ہوئی، اسی سال مخمور سعیدی کا پہلا شعری مجموعہ "گفتنی" شائع ہوا۔ مخمور سعیدی نے جس دور میں شاعری کی ابتدا کی وہ دور ہندوستان میں سماجی، معاشرتی اور اردو زبان و ادب میں انقلاب اور تغیر و تبدل کا دور تھا تقسیمِ ہند کا المیہ لوگوں کے ذہنوں میں بالکل تازہ تھا۔

مخمور سعیدی کے افکار و خیالات میں تنوع ہے مخمور سعیدی نے ایک حساس اور باشعور تخلیق کار کی حیثیت سے اپنے زمانے کی تمام ادبی تغیرات کو قبول کیا ہے مخمور سعیدی کے یہاں کلاسکیت اور رومانیت کا رنگ و آہنگ نمایاں ہے، نئی غزل کو مخمور سعیدی نے بہت سے اچھے اشعار عنایت کیے ہیں اس لیے کہ انھیں کلاسیکی غزل کے آداب بھی آتے ہیں اور وہ نئی زندگی کے پُرسوز سادہ المیہ سے بھی واقف ہیں۔ ان کی فکر کی جو گہرائی اور گیرائی ہے وہی ان کی موجودہ صدی کی شاعری کی جان وشان ہے۔

ان کی غزلوں کا مرکزی محور ایک موضوع اور خیال کے ارد گرد گردش کرتا ہے۔ علامتوں کی سطح پر انھوں نے نئی نئی راہیں ہموار کی ہیں، وہ دوسروں سے انہیں مستعار نہیں لیتے بلکہ خود وضع کرتے ہیں۔ عہد حاضر میں انسان کے دکھ ،درد، کرب، مسائل و مصائب، تنگ دستی، ناداری، مظلومی، ظلم وجبر، محرومی، مجبوری، لاچاری کا بیان ان کی غزلوں میں ہے ۔ مخمور سعیدی کی غزل اردو کی شعری روایت اور جدید طرزِ فکر کا ایک متوازن امتزاج ہے۔ زبان و بیان پر قابل لحاظ دسترس، سادگی، بے ساختگی اور سوز وگداز، ان کی غزلوں کی قابل قدر خصوصیات ہیں۔۔۔ اپنی شاعری میں انھوں نے دردمندی، اخلاص، احساس، متانت اور دل سوزی سے کام لیا ہے، ان کے یہاں لفظ کی بڑی اہمیت ہے وہ

لفظوں کے جادو گر بھی ہیں اور مصور بھی۔ الفاظ کی اس جادو گری نے ان کی غزلوں میں تحیر و استعجاب ، پر اسراریت، تنوع، رنگارنگی، تہہ داری اور جامعیت پیدا کی ہے۔

احمد فراز کی طرح انھوں نے شہر، شہر کے ماحول اور شہر کے لوگوں کو بے حد قریب سے دیکھا ہے اور شہر کے پورے نظام اور حالات کا مطالعہ ایک دیدہ ور فنکار کی طرح کیا ہے۔ اس بڑے شہر کی ہمہ ہمی، رنگینی، فضائی آلودگی، شوروغوغا، اضطراب وانتشار، بے حِسّی، تصنّع اور منافقت سب کو مخمور سعیدی نے قریب سے دیکھا ہے اور محسوس کیا۔ اسی لیے ان کی غزل میں شہری اور عصری حِسّیت کا واشگاف الفاظ میں اظہار ہوتا ہے جسے ہم جدید حِسّیت بھی کہہ سکتے ہیں، انھوں نے انسان کی غفلت شعاری، گم شدگی، بیگانگیت، غم زدگی، نفسی وذہنی پستی، رشتوں کی ناقدری، احساسِ کمتری، غیر تعلقی، زمانہ کی کربناکی، کشت وخون وغیرہ کی اپنی غزلوں میں بہتر انداز میں منظر کشی کی ہے، ماضی، منزل، خوف، زمین ، آسمان ، اڑان ، زندگی ، رہگزر۔ دھوپ ، روشنی ، آئینہ ، سفر ، گمشدہ ، قدم آشنا ، بھیڑ ، اکیلا ، تنہائی ، شہر وغیرہ الفاظ کو ان علامتی اظہار کا آئینہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کے شاعری میں وجودی فلسفہ کا اثر نظر آتا ہے

بہہ گئے راستے کے شور میں ہم

س نے رک کر ہمیں پکارا بھی

مخمور سعدی اور احمد فراز دونوں کی شاعری میں تنہائی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس حوالے سے مخمور سعیدی کا ایک شعر ملاحظہ ہو

سب بستیوں میں آ بسے تنہائیوں کے خوف سے

ہر شخص کی قسمت مگر اب تک وہی تنہائیاں

بنیادی طور پر فراز کی طرح مخمور سعیدی بھی محبت ہی کے شاعر ہیں ساتھ ہی ساتھ انسانیت اور انسانی زندگی کو اپنے الفاظ میں ڈھال کر اشعار کا قالب دینے کا ہنر رکھتے ہیں

ترا وجود تھا ننگِ وجود، اری دنیا

رکھی ہے اہلِ محبت نے آبرو تیری

تمہید شوق کی بھی شکایت لبوں پہ ہے

تکمیل شوق کے بھی تقاضے نگاہ میں

انسانی ت اور انسانی زندگی کو نغمگی دیتے وقت احمد فراز کی طرح مخمور سعیدی بھی احتجاجی رنگ میں نظر آنے لگتے ہیں

جتنے آزادیٔ انساں کے طلب گار ملے

اپنی ہی ذات کے زنداں میں گرفتار ملے

احمد فراز منافقت کو بہت برا جانتے تھے اسی طرح مخمور سعیدی بھی منافقت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے یوں نظر آتے ہیں

فسانے گڑھ رہا ہے جھوٹ ان کا

مگر میری صداقت بے زباں ہے

جلاوطنی احمد فراز کی گویا کی گھٹی میں بس گئی تھی ان کے اشعار میں جگہ جگہ جلاوطنہ کا احساس ملتا ہے مخمور سعیدی نے بھی جلاوطنی کو اپنے اشعار میں یوں ڈھالا ہے

ہجرت کرتا ایک پرندہ

موسم موسم میں بھٹکا ہوں

پروفیسر سیدہ جعفر مخمور سعیدی کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں

مخمور سعیدی کے کلام میں رشتوں کی بے ثباتی، غیر یقینی کیفیت، قدروں کو ٹوٹنے اور بکھرنے کے احساس، تشکیک اور انجانے خوف کی تیرگی کے پس منظر میں کہیں کہیں امید کی ایک کرن جگمگاتی نظر آتی ہے، نظم " اندھا سفر " جزو کے کل سے جدا ہونے کے کرب کی مظہر ہے، مخمور سعیدی کے اشعار میں احساس کی یہ زریں لہریں مؤجزن نظر آتی ہیں کہ چاندنی راتوں کی دلنوازی، تتلی کے رنگین پروں کی جاذبیت، آبشار کا حسین

سبزے کی شادابی اور پھولوں کی خوشبو کسی ابدی وجود کا وسیلہ

بن سکتی ہے "22

سیدہ جعفر نے اپنے اس تبصرے کے تحت مخمور سعیدی کے یہ اشعار پیش کئے ہیں

لچکتے پیڑ سنکتی ہوا مچلتی ندی

سمجھ میں آئے یہ منظر ترے حوالے سے

ترا خیال ہم ایسوں کی قبلہ گاہ رہا

کہیں جھکا تو جھکا سر ترے حوالے سے

مخمور سعیدی

سجائے ہیں مہہ وخورشید صبح وشام اس نے

مرے لئے ہی کیا ہے یہ اہتمام اس نے

مخمور سعیدی

کشور ناہید(19جون1940)

کشور ناہید ایک ایسانام ہے جو پاکستان کے ادبی حلقوں میں نہایت ہی مشہور و معروف ہے۔ کشور ناہید 1940 میں بلند شہر (ہندوستان) میں ایک قدامت پسند سید گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ کشور ناہید اپنی شاعری میں عورت پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں، ان کے یہاں ترقی پسندانہ رجحانات بھی ہیں تاہم جدیدیت کا رجحان غالب ہے۔ کشور ناہید کی شاعری میں عورتوں پر ہو رہے مظالم، حق تلفی، اور عورت کی نفسیات کو بڑی بے باکی سے بیان کیا گیا ہے ان کی شاعری میں مشرقی عورت کی محکومیت، ماحول کے جبر، جذباتی کشمکش وغیرہ جیسے مسائل کا ذکر بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری مشرقی خواتین کے حقوق کی بازیافت اور معاشرے میں ان کی اہمیت پر توجہ بھی دلاتی ہے، کشور ناہید ایک طرف بے جا پابندیوں کے خلاف ہیں تو دوسری طرف آزادی نسواں کے نام پر عورتوں کے ساتھ ہو رہے استحصال پر بھی رنج ہے، کشور ناہید کی شاعری برہنہ حقیقتوں کے اظہار کا نام ہے وہ دنیا میں عورت کو درپیش مسائل پر گہری نظر رکھتی ہیں، عصری شعور کا اظہار ان کی شاعری میں ملتا ہے اس لئے ان کے یہاں تلخی کا رنگ غالب ہے، جہاں کشور ناہید نے محبت، جدائی اور وصال کی کیفیات کو بیان کیا ہے وہیں کشور ناہید نے ان سفاک حقیقتوں کا اظہار بھی کیا ہے کہ گڑیوں سے کھیلنے والی لڑکیاں مردوں کے ہاتھوں میں کیسے کھلونا بن جاتی ہیں کشور ناہید نے عورت کی بے توقیری اور استحصال کا اپنی شاعری میں کھل کر بیان کیا ہے، کشور ناہید اپنے باغیانہ لہجے اور تیور سے جانی جاتی ہیں ان کی شاعری میں سیاسی جبر اور آمرانہ نظام کے خلاف بالکل اسی طرح غصہ نظر آتا ہے جس طرح احمد فراز کی شاعری میں، انھوں نے عدمِ مساوات اور طبقہ نسواں کے استحصال جیسے موضوعات کو سیاسی اور تہذیبی پس منظر میں بیان کیا ہے۔

کانٹوں کی چٹان پر کھڑی
میں آنکھوں کی سوئیاں نکال رہی ہوں
یہ علاقہ کس سلطنت میں شامل ہے
ملوکیت؟ میری زبان پر کانٹے
حلق میں پھندا

(کشور ناہید)

باقر مہدی کہتے ہیں

وہ(کشور ناہید) ارتقاء پذیر شخصیت رکھتی ہیں اور مغربی شاعری
سے متاثر ہونے کے باوجود ایک مشرقی ذہن و نظر سے سوچتی
ہیں ، ان کی شاعری کا ایک اہم حصہ احتجاجی ہے اور یہ شاعری
حالات کے بدلتے ہی ادبی کم، تاریخی اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔
مگر کشور کی احتجاجی آواز انفرادی ہوتے ہوئے بھی عمومی
صداقتوں کی علم بردار ہے"23

جس طرح احمد فراز جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء لگانے اور خود ساختہ صدر مملکت بن جانے کے بعد آمرانہ نظام کے تعلق سے متاثر تھے اسی طرح کشور ناہید بھی اسی تناظر میں "سنسر شپ" اور " دفع 144 " کے عنوان سے انھوں نے نظمیں لکھیں جن میں جبر واستبداد کے خلاف رد عمل کا اظہار کیا، کشور ناہید سیاسی جبر و استحصال اور حقوقِ نسواں کی پامالی کو دیکھ نہیں سکتیں۔ سقوط ڈھاکہ کے دور میں ہی کشور ناہید کا شعری مجموعہ "گلیاں دھوپ دروازے "(1978) میں منظر عام پر آیا اس مجموعے کی اشاعت نے پاکستانی معاشرے میں کہرام مچادیا۔ کشور ناہید زندگی سے متعلق مخصوص نقطہ نظر رکھتی ہیں، کشمکشِ حیات اور جہد مسلسل میں ان کا یقین ہے، ایک عورت کو مرد سماج میں جہاں تہذیب و ثقافت اور مذہب کے نام پر گھر اور ملک دونوں جگہ بے بس اور مجبور کر دیا گیا ہو اس بے چارگی کا رد عمل انھوں نے اس طر ح کیا ہے۔

بکری ذبح ہونے کا انتظار کرتی ہے اور میں صبح ہونیکا
کہ میں روز دفتر کی میز پر ذبح ہوتی ہوں
جھوٹ بولنے کے لئے یہی میری ہے
میں اور میرا وطن ایک ساتھ پیدا ہوئے

مگر دونوں کی بصارت بچپن میں ماری گئی

(کشور ناہید)

کشور کی شاعری بدلتے ہوئے سماج اور مرد اساس پر مبنی پدری نظام کے خلاف ایک زبردست احتجاج ہے ،کشور نے عورت کے دکھ درد، اس کی ہمدردی اور فکری بلندی کو محسوس کیا اور اس کو آگے بڑھانے میں خاصہ اہم کردار نبھایا،

کشور ناہید کی نظمیں اس عہد میں سیاسی جبر واستحصال کے خلاف ایک معتبر حوالہ بن کر ابھرتی ہیں، کشور ناہید کی شاعری کسی ایک مخصوص زاویے کی منظر کشی نہیں ہے بلکہ ایک ذہنی سیال ہے جو جذباتی ، معاشرتی، اور قلبی واردات پر منحصر ہے، چنانچہ کشور ناہید کا زندگی کا تجربہ شعری تجربہ میں بدل جاتا ہے ،باقر مہدی کہتے ہیں

کشور ناہید کی آواز میں وہ طنز کی نشتریت سما گئی ہے کہ وہ
بات بات میں اپنا "ڈنک" مارنے سے باز نہیں آتیں"25

،ان کی نظموں سے تمثال کاری کے بھی چند نمونے ملاحظہ کیجئے

ہر ایک سر اٹھاتی تمنا کی آنکھوں میں
بے رحمیوں کی سلاخیں چبھوتی رہی ہوں
تو اس خاک سے خوشبوئیں پھوٹ اٹھیں
معانی کے صحرا سے چشمے ہوں جاری

ذاتی طور پر بھی کشور ناہید اور احمد فراز کے اچھے مراسم تھے، جب احمد فراز کو قید کیا گیا اس موقع پر کشور ناہید نے ہی ملکہ ترنم نور جہاں سے ملاقات کے لئے گئیں تھیں تاکہ نور جہاں بھٹو صاحب سے احمد فراز کی رہائی کی سفارش کی جائے کشور ناہید خود کہتی ہیں

"ایک دن میں اور مسعود اشعر ملکۂ ترنم نور جہاں سے ملاقات
کرنے گئے، ہمیں معلوم تھا کہ وہ بھٹو صاحب کو بہت پسند کرتی
ہیں اور اسی کے ساتھ وہ اس دور کی ایک مشہور خاتون بلیک

کوئین کی گہری دوست بھی ہیں کئی دن تک بحث و مباحثہ کے بعد
ملکہ ترنم نور جہاں کراچی جانے پر رضامند ہو گئیں تاکہ بلیک
کوئین سے ملاقات کی جائے انھوں نے بلیک کوائین کو
اس بات پر قائل کر لیا کہ وہ بھٹو صاحب سے احمد فراز کی رہائی
کے لئے درخواست کریں گے یہ بڑی ہمت کا کام تھا جس کو بلیک
کوئین نے اپنے توبہ شکن حسن سے سرانجام دیا"24

جس وقت احمد فراز کی عدالتی سماعت ایک بند کمرے میں ہو رہی تھی اس موقع پر بھی احمد فراز کے چند خاص دوستوں میں سے کشور ناہید بھی تھی بند کمرے کی اس خفیہ سماعت کے موقع پر احمد ندیم قاسمی ،کشور ناہید سیف الدین سیف ،اور یوسف کامران وغیرہ موجود تھے۔

امجد اسلام امجد (4۔ اگست 1944)

امجد اسلام امجد ستّر کی دہائی میں ابھرنے والے ایسے ممتاز ترین شاعر ہیں جنھوں نے لسانی تشکیلات کے ہنگامے میں اپنی سلامتیِ طبع کو قائم رکھا۔ امجد اسلام امجد کی شاعری کا پسندیدہ موضوع محبت ہے اس محبت کا تعلق چاہے ان کی اپنی ذات سے ہو یا کسی اور سے وہ اس پر غور ضرور کرتے ہیں

اس کو بھی لگ ہی گئی شہر محبت کی ہوا

وہ بھی امجد ہے کئی دن سے پریشان بہت

یہی بہت ہے کہ دل اس کو ڈھونڈ لایا ہے

کسی کے ساتھ سہی وہ نظر تو آیا ہے

امجد اسلام امجد نے محبت کے بے شمار رنگ اپنی غزل میں پیش کئے ان کی شاعری کا کوئی لمحہ محبت کی گرفت سے آزاد نہیں ہے، انھوں نے جس بے تکلفی سے محبت کی باتیں کیں اسی بے تکلفی وہ خدا سے مخاطب ہوئے

وہ خدا ہے تو زمین پر آئے

حشر کا دن تو یہاں برپا ہے

خدا کی ہے یہی پہچان شاید

کہ کوئی اور اس جیسا نہیں ہے

امجد اسلام امجد زندگی کے شاعر ہیں، ان کا نظریہ حیات ان کی فطرت نگاری سے بھی جھلکتا ہے وہ زندگی کو ہر رخ سے دیکھتے ہیں لیکن اہمیت روشن پہلو ہی کو دیتے ہیں

سن اے ہوائے بے دلی

اگرچہ اس دیار میں ہر ایک سوگئی رتوں کی گمشدہ

بہار کا فشار ہے، غبار انتظار ہے

مگر یہ زرد گھاٹیاں یہ کاروان بے نشاں

سفر کی انتہا نہیں

دھواں دھواں ہیں جسم وجاں، مگر زباں ہے گلفشاں

کہ دل ابھی مرا نہیں

نظر میں ہے وہ فصل گل جو اب تلک نہیں کھلی

سن اے ہوائے بے دلی

(سورج کی پہلی کرن)

امجد اسلام امجد جدید نظم کے وہ شاعر ہیں، جنھوں نے محبت کو موضوع بنا کر شہرت پائی، ان کی بہت سی نظمیں زبان زد عام ہیں, رومانی کیفیات کے متنوع پہلوؤں کو انھوں نے دل کش اور مؤثر انداز میں اپنی نظموں کا حصہ بنایا ہے، ان کی نظموں میں رومانی بہاؤ کے ساتھ ساتھ ذات اور سماج کے کرب کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں، ان کی نظموں میں تمثال کاری کے بہترین نمونے پائے جاتے ہیں جن کے آہنگ میں موجود صوتی نظام قاری کو اپنا اسیر کر لیتا ہے۔

امجد اسلام امجد نے جدید رجحانات کو بھی اپنایا اور روایات کی پاس داری بھی کی، دل میں انسانوں سے محبت کے روشن جذبات لئے وہ معاشرے میں موجود ظالم طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہیں، انھوں نے اپنی تمثالوں کی جدت کی عمارت روایت کی بنیاد پر کھڑی کی اور نئے اور تازہ استعارات وعلامات کو ذریعہ بنا کر تمثال کاری کی، یہ تمثالیں ان کے رومانی مزاج کی آئینہ دار ہیں، ان کی نظموں میں ہیئت اور تکنیک دونوں میں نیاپن موجود ہے، امجد امسلام امجد کی شاعری میں، ان کے استعارات اور علامتیں بعید از فہم نہیں جن کے باعث عام قاری کے لئے ان کے کلام کی تفہیم ممکن ہے، تمثالوں میں کسی حد تک رمز و کنایہ لازمی ہے کبھی کبھی ان کی تمثالوں میں اس کمی کا احساس ہونے لگتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی تمثالیں معنی و فن کے اعتبار سے تازہ اور دل کش ہیں، امجد اسلام امجد انسان سے محبت کرنے والے شاعر ہیں، یہ محبت ان کی تمثالوں میں مختلف انداز سے جلوہ گر ہوئی ہیں محبت کا یہ اظہار دل کش اور پر تاثیر ہے، موجودہ استحصالی نظام کا خاتمہ اور پر امن معاشرے کی تعمیر ان کا خواب ہے، یہی خواب ان کی تمثالوں میں موجزن ہے، ان کی تمثالوں کا ذریعہ عموما کائینات کے فطری مظاہر بنتے ہیں، احمد فراز

کی طرح امجد اسلام امجد بھی فیض اور احمد ندیم قاسمی کی شاعری سے متاثر نظر آتے ہیں، تاہم متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ امجد اسلام امجد اپنا الگ لب و لہجہ دریافت کرتے ہیں۔ اپنی تمثالوں میں وہ ایک رومانی اور خواب پرست شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں اور ان کی تمثالیں اپنے اندر تاثر اور دل کشی رکھتی ہیں۔

امجد کی شاعری محبت' دیانت' شائستگی' دردمندی اور خیرِ کثیر کے جذبوں سے مالا مال ہے- تخلیقی شعور نے ان کی فکر کی تربیت اس طرح کی ہے کہ وہ خوشبو کو دیکھ سکتا ہے' امجد اسلام امجد کی شاعری کا بڑا حصہ نظموں پر مشتمل ہے- ان کی نظمیں اپنے موضوعات' اپنے پھیلاؤ اور اپنی اثر انگیزی کے حوالے سے ایک الگ پہچان بنا چکی ہیں- ان کی نظموں میں ایک اپنی فضا ہے جو خاص استعاروں اور اپنے اسلوب کی ندرت سے، دلپذیری اور اثر انگیزی میں اضافہ کرتی ہے- ان کی رواں دواں اور پر تاثیر نظموں میں بے ساختہ پن گہری معنویت کے ساتھ رونمائی کرتا ہے

اس قدر قرض ہے محبت کا
سوچتا ہوں تو ہول اٹھتا ہے
عشق کے واجبات کیسے دوں!
تم نے کیا میرے پاس چھوڑا ہے

امجد نے محبت کو ایک مجرد نظریہ کے طور پر قبول نہیں کیا بلکہ اسے جزو حیات سمجھا ہے-

یاد ہے اب تک مجھے وہ بد حواسی کا سماں
تیرے پہلے خط کو گھنٹوں چومتا رہتا تھا میں

امجد کی شاعری صرف ظاہر کی آنکھ سے نظر آنے والی زندگی کا ہی احاطہ نہیں کرتی' مابعد الطبیعات اور ورائے نظر حیات پر بھی غور کرتی ہے۔ ان کے یہاں روایت کے بہترین عناصر کا تخلیقی استعمال دکھائی

دیتاہے،وہ روایتی شعری عناصر سے بھی بھرپور استفادہ کرتے ہیں، "وقت" امجد کی شاعری کا بھی سب سے بڑا کردار ہے-

مرے ہم سفر تجھے کیا خبر
یہ جو وقت ہے کسی دھوپ چھاوں کے کھیل سا
اسے دیکھتے' اسے جھیلتے
میری آنکھ گرد سے اٹ گئی
مرے خواب ریت میں کھو گئے

"سیل زماں"' امجد اسلام امجد کی شاعری کا سب سے محکم استعارہ ہے-اس سیل زماں میں وہ ساری نرمی وسفاکی در آتی ہے جو زندگی کے تاروپود سے وابستہ ہے-

پروین شاکر:(24نومبر 1952)

اردو کی معروف خاتون شاعرہ پروین شاکر کی پیدائش 24 نومبر 1952 کو ہوئی۔ پروین شاکر ایک ایسی شاعرہ ہیں جو اپنے نازک جذبوں، خواہشوں، داخلی کرب، جمالیاتی احساس اور ذہنی رویے کو عصری تناظر میں پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، اس لحاظ سے اگر ہم دیکھیں تو پروین شاکر کی شاعری اپنے موضوع، ہیئت، تکنیک، اسلوب، تصور، فکر و نظر اور جمالیاتی احساس جیسے تمام خصائص ان کی شاعری میں یکجا ہو جاتے ہیں، پروین شاکر کے اشعار گو کہ عشقیہ ہوتے ہیں لیکن ان میں رومانویت کے ساتھ ساتھ زندگی کی رمق بھی پائی جاتی ہے، ایک ایسی رمق جس میں حرارت ہے، جذبوں کی ترجمانی ہے، اور سماجی علائم بھی، خیالات کی ترسیل کے لئے پروین شاکر مناسب اور موزوں الفاظ کا استعمال کرتی ہیں، ان کے اشعار میں الفاظ نئے تراکیب کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں، زبان پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے انداز بیان بھی انوکھا ہے، جو کہ جمالیاتی پیرایہ اظہار لئے ہوئے ہے۔ ان کی غزلوں میں موسیقی جیسی مٹھاس ہے۔ انتظار، وصل و فراق، تجدید وفا، گھر آنگن اور جنس کا استعارہ ان کی شاعری کو وقار بخشتا ہے ،ان کی شاعری بنیادی طور پر نسائی جذبات واحساسات کا بہترین اظہار ہے جس میں دکھ، درد والم، کرب، کے ساتھ مسرت آگیں جذبے کو بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے، پروین شاکر کے یہاں محبوب کا تصور بھی عام روایتی قسم کا نہیں ہے۔ وہ محبوب سے شکوہ تو کرتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو سپرد کرنے کا جذبہ بھی رکھتی ہیں۔ ان کے اشعار میں ہجر ووصال کا لطف اور احساس بہت خوبصورتی اور فنی مہارت کے ساتھ برتا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں وصل کی خواہش کی التجا نہیں ہے، بلکہ ہجر کے کرب آگیں لہجے اور خود پر قابو رکھنے اور شعوری طور پر اس کی یاد کو سنبھال کر رکھنے کا حوصلہ بھی ہے۔ پروین شاکر کی شناخت ان کے پہلے شعری مجموعہ "خوشبو" سے قائم ہو جاتی ہے۔ ان کو غزل اور نظم دونوں صنف سخن پر کمال حاصل تھا، انھوں نے اپنی شاعری میں تجربے بھی خوب کئے جس کا اعتراف ان کے معاصرین کو بھی رہا ہے۔ ناقدینِ فن و ادب نے بھی ان کو سراہا ہے "خوشبو" کی اشاعت پر نظیر صدیقی اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں

"خوشبو" بنیادی طور پر عشق کے جذبات و تجربات کی شاعری ہے اور اردو کے عشقیہ شاعری کے سرمائے میں ایک نہایت منفرد اور خوبصورت اضافہ ہے"26

احمد فراز اور پروین شاکر دونوں ہی جدیدیت کے رجحان سے متاثر ہیں اور اپنے اپنے طور پر اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں جس میں اس عہد کی سیاست سماج اور تہذیب ابھر کر سامنے آتی ہے احمد فراز آمرانہ نظام اور ظلم و جبر کے خلاف جہاں محاذ اٹھائے نظر آتے ہیں، وہیں پروین شاکر آمرانہ نظام کے خلاف احتجاج نہ کرنے والوں کے حسب و نسب پر ہی شک کرنے لگتیں ہیں پروین شاکر کہتی ہیں

مگر میرے شہر منحرف ہیں
ابھی ایسے غیور و صادق بہ قہر جاں ہیں
کہ صرف انکار جس کی قسمت نہیں بنا ہے
سو حاکمِ شہر جب بھی اپنے غلام زادے
انھیں گرفتار کرنے بھیجے
تو ساتھ میں ایک ایک شجرہ نسب بھی روانہ کرنا
کہ آج سے جب ہزاروں سال بعد ہم بھی
کسی زمانے کے ٹیکسلہ اور ہڑپہ بن کر تلاشے جائیں
تو اس زمانے کے لوگ کہیں ہم کو
بہت کم نسب نہ جانیں

(ماہِ تمام ۔۔ پروین
شاکر)

اسی تناظر میں احمد فراز کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجئے

ہم ہی بقراط ہیں

ہم ہی سقراط ہیں
ہم ہی کون و مکاں کے خداوند ہیں
سر پھرو
تم کو ہم سے گلہ ہے کہ ہم نے تمھیں
خاک وخوں کے سمندر میں نہلا دیا
صرف اپنے تسلط کی خاطر تمھیں
ہم نے اپنوں کے ہاتھوں سے کٹوادیا
چاند سورج تو اپنے لیے رکھ لیے
اور تم کو کھلونوں سے بہلا دیا
تم کو اس کی مگر کچھ خبر ہی نہیں
یہ تسلط یہ جاہ و حشم یہ زمیں
بس تمھارے لیے ہے تمھارے لیے

(تنہا تنہا)

معاصر شعرا کی طرح پروین شاکر نے بھی اپنے حالات اور عہد سے بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے تاہم پروین شاکر کا معاملہ ذرا اس کے برعکس ہے وہ اپنے اسلوب اور لب و لہجے میں معاصر شعرا سے منفرد ایک الگ پہچان کے ساتھ بساطِ شاعری پر نمودار ہوتی ہیں، ان کی شاعری میں جمالیاتی کیفیت بہت موثر طریقے سے بیان ہوئی ہے۔ سیاسی جبر اور مارشل لائی عہد ان کی شاعری میں اس حوالے سے دیکھنے کو ملتا ہے جس میں حکامِ وقت اور سیاسی رہنماؤں کی بے حسی کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے اس میں ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جب وہ حالاتِ حاضرہ پر شعری زبان میں تبصرہ کرتی ہیں تو طنز و ملامت کا ہدف بناتے وقت خطابیہ لہجے اختیار کرتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی نظموں میں غزل کی مٹھاس قائم رہتی ہے اور شعریت بھی مجروح نہیں ہوتی

حبس بہت ہے

اشکوں سے پورا آنچل گیلے کرکے ہم

دل پر کب تک ہوا کریں

باغ کے در پر قفل پڑا ہے

اور خوشبو کے ہاتھ بندھے ہیں

کسے صدا دیں

لفظ سے معنی بچھڑ چکے ہیں

لوگ پرانے اجڑ چکے ہیں

نابینا قانون وطن میں جاری ہے

آنکھیں رکھنا

جرم قبیح ہے

قابل دست اندازئی حاکم اعلیٰ ہے

حبس بہت ہے

اب زرا احمد فراز کے بھی کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

دوست جب ٹھہرے چمن کے دشمن جانِ بہار

زخم دکھلائیں کسے پھر سینہ چاکانِ بہار

(فراز)

امیر شہر کے فرمان سب بجا لیکن

فقیر شہر بھی کچھ عرض حال کرتے ہیں

ہمیں تو جاں سے زیادہ عزیز درد وطن

مگر حضور بھی ایسا خیال کرتے ہیں (فراز)

پروین شاکر کے یہاں نسوانی جذبات کی عکاسی خوبصورت انداز میں بیان کی گئی ہے وہ عورت کے جذبات واحساسات کی ترجمانی صحیح انداز میں کرتی ہیں انھوں نے روایتی تصور محبت کے برعکس محبت میں عورت کی شرکت اورانتہائی جذباتی کیفیات کو پیش کیاہے،انھوں نے کلاسکی لب ولہجے کو اپنا کر شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا۔ عصری مسائل، عورت کی جذباتی کشمکش، جنسی کشش اور خوف کے علاوہ جذبوں کے اظہار کی زبردست خواہش کے ساتھ حالات کے جبر اور خود سپردگی کو بہت سلیقے اور ہنر مندی کے ساتھ برت کر علامات اور استعاراتی پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئی ہیں

عالمی اور مقامی اثرات کی وجہ سے ان کی شاعری میں فکری وحدت کی مرصع کاری نظر آتی ہے انھوں نے اپنی شاعری میں زندگی کی ماہیت، فرد اور سماج کے رشتے عالمی اور مقامی سیاسی سماجی اور تہذیبی فکر و نظر کو پیش نظر رکھ کر، معاصر تصور حیات کی علمبر داری کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے غزلوں اور نظموں کو جدید تصور اور تقاضہ دونوں سے ہم آہنگ کر کے جذبوں کی روانی کو پیش کیاہے۔، پروین شاکر نے روایتی اور جدید دونوں ہی لب و لہجے کا پاس رکھا اور اپنے اظہار کے لئے جمالیات کے حوالے اس راستے کا انتخاب بھی کیا یہ ان کی جمالیاتی فکری وحدت کا نتیجہ ہے۔ اپنے مخصوص جمالیاتی لہجے کے ذریعہ انھوں نے عصری فکر اور زندگی کے دوسرے مسائل کو رومانی پیرائے میں ادا کیاہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود آگہی کا کرب اور اضطرابی کیفیت ان کی شاعری میں نمودار ہوئی ہے۔

پروین شاکر کی شاعری میں اپنے موضوع ہیئت، تکنیک، اسلوب، تخیل آرائی، تصور فکر و نظر اور جمالیاتی احساس جیسے تمام خصائص یکجا ہو جاتے ہیں اور ان کا لب لہجہ معاصر شعرا کے مقابلے میں انفرادیت کا حامل ہو جاتاہے.

جدید اور آزاد غزل کے ہجوم میں پروین شاکر کی غزلیں تازگی اور شفتگی کا ایک منفرد انداز لیے ہوئے ہیں۔ پروین شاکر کی شاعری میں نسائی کرب، تنہائی، خوف، ناآسودگی، خود سپردگی کا احساس اور شکستگی کے احساسات ایک بامعنی پیکر بن کر ابھرتے ہیں پروین شاکر نے اپنی ان نظموں "جواز"۔"میر الال"، "تیری موہنی صورت"، "کائنات کے خالق"، اور "نوشتہ" میں خالص نسائی جذبات کی ترجمانی کی ہے

،پروین شاکر کی شاعری داخل سے خارج کی طرف مراجعت کا نمونہ ہے جس میں انھوں نے سماج میں پنپ رہے منافقانہ رویوں کو بہت سلیقے سے پیش کیا جس میں ان کے باطن میں پنپ رہے دکھ، درد و الم اور کرب کو پیش کیا گیا ہے، سماجی ناانصافیوں اور نابرابری پر جس طریقے سے چوٹ کرتی ہیں وہ ایک لطیف اور خوش گوار جھونکے کی طرح دھیمی آنچ کی لَو سے نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے نظم "بدن کے موسم بے اختیاری میں" میں یہ شان بخوبی دیکھی جاسکتی ہے

کوئی دن زندگی میں ایسا آئے

تو میرے دھیان کھو کر

رموز شہریاری بھول جائے

میں اس شدت سے یاد آؤں

شکوہِ کج کلاہی بھول جائے

مرے بھی سارے رشتے سارے ناطے

خود فراموشی بہالے جائے

کل دنیا سمٹ کر تیری باہوں میں سما جائے

بدن کے موسم بے اختیاری میں

کسی پل۔۔۔۔

فصیلِ شہر سے باہر

حصارِ چادر و دستار کی حد سے نکل کر

ایک لمحے کو۔۔۔۔بس ایک لمحے کو

ہم اپنے مقدر آزمالیں

شب ممنوع سے اک پل چرالیں

ان کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت، ان کا جمالیاتی اسلوب، والہانہ جذبۂ عشق اور خودسپردگی کا احساس ہے اس کے علاوہ پروین شاکر کی خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں گہری رمزیت، اشاریت،

امیجری، علامات و استعارات سازی کی شعاعیں اٹھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری میں الفاظ کا صاف ستھرا رچاؤ اور عمدہ سلیقہ موجود ہے الغرض یہ کہ پروین شاکر کے یہاں شعر فہمی اور شعری روایت کا پاس ہے۔ ان کے اشعار فکر و خیال کی طرح شفاف ہیں۔ کہیں بھی کسی طرح کا ابہام یا الجھاؤ نہیں ہے۔ فکر و خیال میں جمالیاتی رچاؤ بہت خوش اسلوبی کے ساتھ ادا ہوا ہے۔ داخلی جذبے کو بڑی سادگی اور صفائی کے ساتھ پیش کرتی ہیں، ہر زندہ اور عظیم فنکار کی طرح پروین شاکر کو بھی آرزو کے خاکستر ہونے کا شدید احساس ہے، بے بسی، محرومی، دبی دبی خواہشات کے محبوس ہونے کا مترنم اظہار ان کی نظموں اور غزلوں کا خاص وصف ہے۔

کوئی آہٹ کوئی آواز کوئی چپ نہیں

دل کی گلیاں بڑی سنسان ہیں آئے کوئی

جس طرح خواب میرے ہوئے ریزہ ریزہ

اس سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی

جدید شاعری میں جہاں احمد فراز نے شہر کو علامت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے کہا تھا

تمام شہر ہے شائستگی کا زہر پیئے

نہ جانے کیا ہو جو دو چار بے ادب بھی نہ ہوں

(احمد فراز)

اسی شہر کو پروین شاکر نے کچھ اس طرح استعمال کیا ہے

قاضی شہر نے قبلہ بدلا

لیکن خطبے میں روانی ہے وہی

شہر کا شہر یہاں ڈوب گیا

اور دریا کی روانی ہے یہی

(پروین شاکر)

حوالہ جات

1. (بحوالئہ ،باقر مہدی عصری آگہی و شاعری ،یعقوب راہی، تکمیل پبلی کیشنز ممبئی، بھیونڈی، 2005 ص 247
2.)بحوالئہ ،باقر مہدی عصری آگہی و شاعری ،یعقوب راہی، تکمیل پبلی کیشنز ممبئی، بھیونڈی، 2005 ص ص: 182(
3.)بحوالئہ ، باقر مہدی عصری آگہی و شاعری ،یعقوب راہی ، تکمیل پبلی کیشنز ممبئی ، بھیونڈی ، 2005 ص 160(
4. (فضیل جعفری بحوالئہ احتجاج کا دوسرا نام باقر مہدیعقوب راہی، ص 36 ایڈ شاٹ پبلی کیشنز ممبئی۔ سن اشاعت 2002 (
5. (احتجاج کا دوسرا نام باقر مہدی، یعقوب راہی۔ ص 30۔ ایڈ شاٹ پبلی کیشنز ممبئی۔ سن اشاعت 2002)
6. خلیل الرحمن میر ابھائی، از پرواز اصلاحی۔ خلیل الرحمن اعظمی نمبر شاعر 1980۔ ص 44)
7. (خلیل الرحمن مرحوم، از رشید الدین، خلیل الرحمن اعظمی نمبر "شاعر "1980 ص۔ 139)
8. (دیباچہ نیا عہد نامہ۔ خلیل الرحمن اعظمی۔ ص 16)انڈین بک ہاؤس محمد علی روڈ، علی گڑھ دسمبر 1965)
9. (غزل کا نیا منظر نامہ، شمیم حنفی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سن اشاعت۔ 1981ء ص: 141)
10. (القمر آن لائن۔ لندن نومبر 2006)
11. (مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری، ڈاکٹر آغا ظفر حسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2007 ص 161)
12. (احمد ندیم قاسمی، شکیب جلالی فن اور شخصیت۔ ص 22)
13. (احمد ندیم قاسمی، شکیب جلالی فن اور شخصیت۔ ص 22)
14. (صامت وقار، شکیب جلالی فن اور شخصیت، ص: 106)
15. (ہندوستانی ادب کا معمار وحید اختر: کوثر مظہر ص 30 ساہتیہ اکادمی دہلی 2008)
16. ماخوذ از مضامین سجاد ظہیر، اترپردیش اردو اکادمی، ص، 93)
17. (قمر رئیس۔ بشیر بدر ، شخصیت اور فن ۔ ص: 6۔ مرتبین رفعت سلطان، ڈاکٹر رضیہ حامد۔ بھوپال بک ہاؤس بدھوارہ بھوپال 1988۔)
18. (نظام صدیقی ۔ بشیر بدر ، شخصیت اور فن ۔ ص: 20۔ مرتبین رفعت سلطان، ڈاکٹر رضیہ حامد۔ بھوپال بک ہاؤس بدھوارہ بھوپال 1988۔)

19.(وزیر آغا۔ مظفر حنفی ایک مطالعہ۔ ص:63
20.(سفر: حنفی کی شاعری کا ایک روشن ستارہ۔ ممتاز الحق۔ بحوالہ مظفر حنفی ایک مطالعہ ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس نئی دہلی 1999ص:210)
21.(مظفر حنفی ایک مطالعہ ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس نئی دہلی1999ص:213)
22.(پروفیسر سیدہ جعفر۔ مخمور سعیدی ہم جہت فنکار۔ ص69۔70)
23.(باقر مہدی عصری آگہی و شاعری، ص:138)
24. کشور ناہید، تنہا تنہا۔ جاناں جاناں، مشمولہ ماہ نو(احمد فراز نمبر)ص23
25.(باقر مہدی عصری آگہی و شاعری، ص133)
26.(نظیر صدیقی، عصری ادب خواتین(خصوصی نمبر)ص:204)

پانچواں باب

احمد فراز کی شاعری کا عمومی جائزہ

احمد فراز کا شمار عالمی شہرت یافتہ ادباء و اشعراء میں ہوتا ہے ، انھوں نے اپنے شعری سرمایہ کی بدولت نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے، فراز جہاں لفظوں کو سانس لینا سکھاتے ہیں وہیں ان لفظوں کو اعتبار کی دولت بھی عطا کرتے ہیں اپنے چالیس سے پینتالیس سالہ شاعری کے دور میں انھوں نے منفرد تراکیب ،رواں بحریں،ندرت خیال، تمثیل کی بلندی ،ذاتی منفرد لہجہ۔اچھوتی منظر کشی،نئے نئے ردیف و قوافی اور اسلوب کی اثر آفرینی سے دنیائے ادب میں روشن ستارہ بن کر ابھرے،انھوں نے اپنے کلام میں عوام اور خواص دونوں کا خیال کیا ،وہ بھر پور زندگی کے شاعر تھے فراز کی شاعرانہ تخلیقات میں تاحال چودہ شعری مجموعے اور اور "شہر سخن آراستہ ہے" کے نام سے ایک کلیات ہے۔

1) تنہا تنہا

احمد فراز کا پہلا شعری مجموعہ "تنہا تنہا" ہے جو 1958 میں شائع ہوا اس مجموعے کو فراز نے ضیاء الدین ضیاء کے نام معنون کیا ہے، جس زمانے میں فراز کا یہ مجموعہ منظر عام پر آیا اس زمانے میں اردو غزل میں غنائیت کی دیوار لمحہ لمحہ گرتی جارہی تھی ہند و پاک کی تقسیم کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا احمد فراز کے پہلے مجموعے تنہا تنہا کی اشاعت سے احمد فراز کی شاعری کے سنہرے دور کا آغاز ہوا ابتدا ہی سے ان کے کلام میں خیال اور جذبہ شیر و شکر ہو کر ایک آہنگ بن کر ایک زور دار اسلوب کی صورت میں سامنے آیا، ان کے کلام کو پڑھ کر ایک تازگی اور نئے پن کا احساس ہوتا ہے، یہ مجموعہ دیکھتے دیکھتے نوجوان نسل کا ترجمان بن گیا اس مجموعے میں جو نظریات پیش کئے گئے تھے وہ نوجوانوں کے دل کے بہت قریب تھے یہاں عشق افلاطونی نہیں، اس کا تعلق گوشت پوست کے بدن سے ہے، شاعر نے تکلف وضع داری اور تصنع کے تمام روایات سے بغاوت کی ہے۔

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا

دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

(تنہا تنہا)

1947ء سے لیکر 1958ء تک کے دور کی تمام شاعری ان کے اسی پہلے مجموعے "تنہا تنہا" میں موجود ہے، جن سے اس دور کے تمام معاشرتی و سماجی حالات، سیاسی اُتار چڑھاؤ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ محبوب ظفر کہتے ہیں

> "یہ وہ زمانہ ہے جب اردو غزل میں غنائیت کی دیوار لمحہ بہ لمحہ گر رہی ہے۔ بہار میں خزاں اور خزاں میں بہار کے وسوسے سر اٹھانے لگے ہیں۔ ہر شاخِ چمن جل رہی ہے۔ کوئی نوائے عندلیب حزیں سننے والا نہیں۔ زندگی اپنے ہونے کا جواز ڈھونڈ رہی ہے۔ تقسیم کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ہجرت کے زخم ابھی

ہرے ہیں ۔ بچھڑنے والوں کی یادیں سلگتے انگاروں کی طرح
دامنِ دل کو سلگائے دیتی ہیں ۔ ہر شئے کی ترتیب بدل گئی ہے ،
چیزیں اپنے ٹھکانے ڈھونڈ رہی ہیں ۔ تشخص کی بحالی کے دن ہیں
۔۔۔۔ماضی اب قصوں میں رہ گیا۔نئے آقا اور نئے قصیدہ خواں
ہیں ۔اسی شکست وریخت میں احمد فراز کی پہلی کتاب "تنہا تنہا "
آتی ہے "1

ان کے پہلے شعری مجموعہ "تنہا تنہا" میں اگرچہ رومانی جذبات کی فراوانی ہے لیکن اس مجموعے میں "بانو کے نام"،"مجسمہ"،"اے بھو کی مخلوق"اور "صراف" جیسی نظمیں بھی موجود ہیں جو شاعر کے پختہ سیاسی و سماجی اور معاشی شعور کی غماز ہیں ، اس مجموعے میں ایسی غزلیں بھی شامل ہیں جو جذباتی تہذیب، فکری ترفع اور فنی تکمیل کی عکاس ہیں ۔ تنہا تنہا کی شاعری میں احمد فراز کا اسلوب ایک خاص نوعیت کی رومانیت کا حامل ہے ، اس خاص رومانیت میں شاعر کی توجہ کا مرکز اس کی اپنی ذات ، اپنی حسیات اور اپنے تجربات ہوتے ہیں فراز نے اپنے اولین دور میں بھی اس نازک مرحلے کو بڑی چابک دستی کے ساتھ نبھایا۔

نگاہِ یار کا کیا ہے ، ہوئی ہوئی نہ ہوئی

یہ دل کا درد ہے پیارے گیا گیا نہ گیا

تنہا تنہا کے حوالے سے پروفیسر فتح محمد ملک کہتے ہیں

"تنہا تنہا" میں جہاں غزل کے ایسے اشعار موجود ہیں "تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ / لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ "وہاں "لحتنی" جیسی نظم بھی مل جاتی ہے جہاں فراز کی ترقی پسندی مقامیت سے پھوٹی ہے۔۔،

یہاں احمد فراز نے اپنے گردو پیش کی زندگی میں سرگرداں
کرداروں میں سے ایک ایسے کردار کو اپنا موضوع بنایا ہے جو
دوسروں کے لئے تفریح و تفنن اور لطف و مسرت کا سامان بہم
پہنچاتا ہے، لیکن خود اس کی اپنی زندگی مصائب و آلام کے پہاڑ
کے نیچے کراہتی اور خون تھوکتی رہتی ہے۔ فراز کی نگاہیں اس
رقاص لڑکے کی ظاہری آرائش وزیبائش کو چیرتی ہوئی اس کے
چہرے کی ویرانی اور مغموم تہہ تک جا پہنچتی ہیں "2

اس مجموعے میں شکووں کی جذباتی لے کثرت سے دیکھنے کو ملتی ہے، یہاں جوانی کا گرم خون جوش مارتا اور جذبات کی رو میں بہہ کر شکوے میں تلخ لہجہ استعمال کرتے ہیں، کہیں کہیں پر تو ایسا لگتا ہے کہ فراز اللہ تعالیٰ سے لڑ جھگڑ کر اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتے ہوں، فراز نے اپنی شاعری میں آغاز ہی سے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی، "تنہا تنہا" کی اکثر نظمیں سرمایہ دارانہ نظام، اونچ نیچ اور طبقاتی کشمکش کے خلاف ہیں انھوں نے بڑی گہرائی سے سیاسی سماجی حالات کا جائزہ لیا تھا اور اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ اس نو وارد ملک پاکستان کو سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں سے بچانا ہی ہے کیوں کہ اگر صورت حال یہی رہی تو ایک دن یہ ملک کھوکھلا ہو جائیگا ان کے خیال میں چند افرد ہی ہیں جو اس ملک پر قابض ہونا چاہتے ہیں فراز نے ان کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی نظم "اے بھو کی مخلوق" میں کہتے ہیں۔

"اے بھو کی مخلوق"

آج تری آزادی کی ہے ساتویں سالگرہ،
چار طرف جگمگ جگمگ کرتی ہے شہرپنہ،
پھر بھی تری روح بجھی ہے تقدیر سیہ،

پھر بھی ہیں پاؤں میں زنجیریں، ہاتھوں میں کشکول،

کل بھی تجھ کو حکم تھا آزادی کے بول نہ بول،

آج بھی تیرے سینے پر ہے غیروں کی بندوق،

-----------------اے بھوکی مخلوق،

بیس نہ سو، نہ ہزار، نہ لاکھ ہیں، پورے آٹھ کروڑ،

اتنے انسانوں پر لیکن چند افراد کا زور،

مزدور اور کسان کے حق پر جھپٹیں کالے چور،

کھیت تو سونا اگلیں پھر بھی ہے ناپید اناج،

تیرے دیس میں سب کچھ اور تو غیروں کی محتاج،

گوداموں کے پیٹ بھرے ہیں بوجھل ہیں صندوق،

-------------------اے بھوکی مخلوق،

آج گرفتہ دل تو کیوں ہے، تو بھی جشن منا،

آنسو گر نایاب ہیں اپنے لہو کے دیئے جلا،

پیٹ پہ پتھر باندھ کے اِم شب ننگا ناچ دکھا،

آج تو ہنسی خوشی کا دن ہے، آج یہ کیسا سوگ؟

تیری بہاریں دیکھنے آئیں دُور دُور کے لوگ،

تیرے خزانے پل پل لوٹیں کتنے ہی فاروق،

-------------------اے بھو کی مخلوق

"تنہا تنہا" سے ہی ان کی ترقی پسندی اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے، بلکہ اس مجموعے کا آغاز ہی مزاحمتی جذبات سے ہوتا ہے، اس مجموعے کی پہلی نظم "شاعر" ہی ترقی پسند عناصر سے بھرپور ہے علاوہ ازیں نظم "معذرت""صراف" اور سیلاب" میں ترقی پسند عناصر کی عکاسی ملتی ہے۔اس مجموعے میں موجود ان کی نظم "بانو کے نام" ملوکیت کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے، اس نظم میں وہ اپنا کرب ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

یہ رسم تازہ نہیں ہے اگر تری لغزش

مزاج قصر نشیناں کو ناگوار ہوئی

ہمیشہ اونچے محلات کے بھرم کے لئے

ہر ایک دور میں تزئین طوق دار ہوئی

کبھی چنی گئی دیوار میں انار کلی

کبھی شکنتلا پتھراؤ کی شکار ہوئی

فراز کے یہاں طبقاتی کشمکش، عدم مساوات، فرقہ واریت اور مذہب کے نام پر فسادات کے خلاف مزاحمت شکوے کے انداز میں بھی سامنے آتی ہیں جب ان کی امیدیں بر نہیں آتیں تو وہ خدا سے شکوہ کرنے لگتے ہیں "تنہا تنہا" کے شکوؤں میں لہجے کی تلخی، جذبات کی شدت نمایاں ہے ان کی نظم "منصور" اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہے یہاں وہ اللہ تعالیٰ سے باغیانہ لہجے میں شکوہ کرتے ہیں کہ انسان نے آخر وہ کونسا جرم کیا ہے جس کی پاداش میں اس نے روز ازل سے اپنی تمام زندگی تیری عبودیت میں گزار دی لیکن پھر بھی اس کی زندگی میں امن و آشتی، چین و سکونِ قلب کا لمحہ میسر نہ آسکا ۔

فراز نے اپنے اس مجموعے میں جمہوریت کو بچانے اور اپنے ملک پاکستان کو راہ راست پر لانے کے مشورے بھی دئے۔ فراز کے خیال میں پاکستانی مسلمانوں میں ترقی وخوش حالی کا نیا دور ملا ہے ، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کی حفاظت کی جائے اور ترقی کے لئے محنت کی جائے وہ کہتے ہیں

زہے نصیب جواب بھی غم مآل رہے

یہ دورِ نو ہے مبارک اگر سنبھل کے چلے

شعری مجموعہ "تنہا تنہا" کے اس مختصر تعارف کے بعد اس مجموعے کی چند اہم نظموں کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں 45 نظمیں اور 42 غزلیں شامل ہیں

شاعر:

اپنے پہلے مجموعے کلام کی پہلی ہی نظم "شاعر" میں فراز نے اس طرح کا عہد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں

اب میرا ہنر ہے مرے جمہور کی دولت

اب میرا جنوں خائف تعزیر نہیں ہے

اب دل پہ جو گزرے گی وہ بے ٹوک کہوں گا

اب میرے قلم میں کوئی زنجیر نہیں ہے

فراز آخر تک اس عہد پر قائم رہے گویا کہ نظم درباری شاعری سے انحراف کی روایت کا سراغ دیتی ہے ، یہ نظم ان کی انقلابی شاعری کا پہلا منشور ہے ،۔

نظم خیر مقدم:

احمد فراز کی نظم " خیر مقدم" اس قت کی تخلیق ہے جبکہ پاکستان کا سیاسی دربار منظر عام پر آچکا تھا اور لوگوں کو دربار سے امیدیں وابستہ تھیں مگر وہ امیدیں برائے امیدیں ہی نظر آئیں اس موقع پر فراز یہ نظم لکھتے ہوئے کہتے ہیں

قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ وہ یوں تو عہدے میں ہیں
قصرِ شاہی کے جاروب کش سے بھی کہتر
مگر عالم کلک و قرطاس کے بادشہ ہیں
وہ چاہیں تو اپنے قلم کے اشارے سے
ذروں کو ہم رتبہ مہر و مہتاب کر دیں
وہ چاہیں تو اپنے کمالِ بیاں سے
فقیروں کو اورنگ و افسر کا مالک بنا دیں
کہ وہ عالمِ کلک و قرطاس کے بادشہ ہیں

یہی وہ نظم ہے جس سے دربار میں تہلکہ مچ جاتا ہے اور فراز کو اپنے پہلے ہی شعری مجموعے سے شہرت و قبولیت ملنے لگتی ہے ، یہ نظم وطن اور عوام دشمن حکمرانوں کے قصیدے لکھنے والوں کے لئے ایک تازیانہ اور درباری سیاست کا نوحہ ہے۔

بانو کے نام:

فراز کے پہلے مجموعے میں ایک نظم "بانو کے نام" ہے۔ بانو ایک کم سن کنیز ہے جس کو بیگم جونا گڑھی نے قتل کر دیا تھا اس نظم میں وہ اس کنیز کے غم کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں

ملوکیت کے محل کی گناہ گار کنیز
وہ جرم کیا تھا کہ تجھ کو سزائے مرگ ملی
وہ راز کیا تھا کہ تعزیرِ ناروا کے خلاف
وہ کون سا تھا گناہِ عظیم جس کے سبب
تری نگاہ نہ بھڑکی تری زباں نہ ہلی
ہر ایک جبر کو تو سہہ گئی بطیبِ دلی

یہی سنا ہے بس اتنا قصور تھا تیرا
کہ تو نے قصر کے کچھ تلخ بھید جانے تھے
تری نظر نے وہ خلوت کدوں کے داغ گنے
جو خواجگی نے زر و سیم میں چھپانے تھے
تجھے یہ علم نہیں تھا کہ اس خطا کی سزا
ہزار طوق و سلاسل تھے تازیانے تھے

یہ رسم تازہ نہیں ہے اگر تری لغزش
مزاج قصر نشیناں کو ناگوار ہوئی
ہمیشہ اونچے محلات کے بھرم کے لئے
ہر ایک دور میں تزئین طوق و دار ہوئی
کبھی چنی گئی دیوار میں انار کلی
کبھی شکنتلا پتھراؤ کا شکار ہوئی
مگر یہ تخت یہ سلطاں یہ بیگمات یہ قصر
مؤرخین کی نظروں میں بے گناہ رہے
بہ فیض وقت اگر کوئی راز کھل بھی گیا
زمانے والے طرف دارِ کج کلاہ رہے
ستم کی آگ میں جلتے رہے عوام مگر
جہاں پناہ ہمیشہ جہاں پناہ رہے

یہ خواجہ لوگوں کا دستور ہے کہ جب کوئی بات قصرِ نشیونوں کے مزاج کے خلاف گزرتی ہے اور اونچے محلات کے بھرم کو کوئی خدشہ لاحق ہوتا ہے تو یہ غریب لوگ تزئین طوق دار ہوتے ہیں، یہ

طبقہ اشرافیہ پر ایک زبردست طنز ہے جو نچلے طبقے کے لوگوں کو رینگنے والے کیڑے مکوڑے سی اہمیت دیتے ہیں۔

اس مجموعے کو فراز نے اپنے ایک دوست ضیاء الدین کے نام منسوب کیا ہے اس مجموعہ کے آخر میں فیض احمد فیض جیسے عظیم شاعر نے اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔

"ان کے کلام میں خیال اور جذبے کا قالب اور شعر کا لباس الگ الگ دکھائی نہیں دیتے آپس میں پیوست ہیں، شاعر کو یہ بات جب نصیب ہوتی ہے جب اس کا جذبہ اور اس کا فن دونوں یکساں پر خلوص اور سچے ہوں، گداز اور سچائی احمد فراز کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں، اسی خلوص، گداز اور سچائی احمد فراز کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں اسی خلوص کی وجہ سے یہ حدیث دل کے علاوہ زندگی کے وسیع تر حقائق کا بیان بھی ایسی ہی خوبی اور لگن سے کرتے ہیں، بیک وقت غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی وسیع دنیاؤں سے آگہی اور اس کی مؤثر تفسیر مشکل کام ہے"3

ہر تخلیق کار اور فن کار اپنی ذات سے اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے، کچھ اسی دائرے میں اسیر ہو کر رہ جاتیں اور کچھ ذات کی سچائی کو آفاقی سچائیوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں کوشاں رہتے ہیں "تنہا تنہا" رومانی اسلوب کا حامل مجموعہ کلام ہے، فراز کو اس بات کا احساس تھا کہ اپنی ذات کی کڑھن سے باہر نکل کر ہنر آزمائی کرنی ہے اس لئے انھوں نے اپنے پہلے ہی مجموعے میں اپنا عزم یوں تحریر کر دیا تھا

اب دل پہ جو گزرے گی وہ بے ٹوک کہوں گا

اب میرے قلم میں کوئی زنجیر نہیں ہے

(احمد فراز)

2)درد آشوب

"درد آشوب" فراز کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو 1966ء میں منظر عام پر آیا، اس مجموعے کو شاعری کی بہترین کاوش قرار دیا گیا اور اس مجموعے پر احمد فراز کو پاکستان رائٹرز گلڈ کے تحت آدم جی آوارڈ سے نوازا گیا درد آشوب کے بارے میں لکھتے ہوئے جمیل یوسف کہتے ہیں "احمد فراز کا پہلا مجموعہ "تنہا تنہا" آٹھ سال قبل 1958 میں شائع ہو چکا تھا مگر توجہ کا مرکز اسے "درد آشوب "نے ہی بنایا اس مجموعہ میں "35 نظمیں 66 غزلیں شامل ہیں اس مجموعہ کو فراز نے محبوب اختر کے نام منسوب کیا ہے

جب یہ مجموعہ شائع ہوا تو پڑھنے والوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اس مجموعے کے بارے میں انور خواجہ لکھتے ہیں

"تنہا تنہا" رومان اور انقلاب کا امتزاج تھا۔ یوں محسوس ہوا کہ زندگی ایک لمبی محبت کی کہانی ہے ، لیکن "درد آشوب "میں رویہ بدلتا نظر آتا ہے، رومان کے ساتھ زندگی کی تلخ حقیقتیں بھی سامنے آتی ہیں"4

"درد آشوب" میں انقلابی نظریہ تھا اس مجموعہ کی شاعری کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے اندر نہ صرف نیا اسلوب اختیار کئے ہوئے تھا بلکہ ساری اردو شاعری کو ایک نیا لہجہ اور نیا احساس دلا رہا تھا، ذیل میں درد آشوب کی اہم نظموں کا تجزیہ کیا جا رہا ہے

فنکاروں کے نام

"درد آشوب "میں احمد فراز کی یہ نظم دراصل شعراء وادباء کو ایک طرح کا خراجِ عقیدت ہے، کہ شاعر وفنکار خود تو اندھیری فضاؤں میں زندگی بسر کرتے ہیں مگر اہل دنیا کے لئے خوابوں کی جنت تعبیر کرتے

ہیں اس نظم میں فراز اہل قلم طبقہ کی خصوصیات بیان کرتے ہیں کہ اس طبقے نے تمام عمر انسانیت کی خدمت کی لیکن خود ان کی زندگیاں کسمپرسی اور بے امنی سے دوچار رہیں۔ اس عوام دوست طبقے نے اگرچہ ہر لمحے عوام کے تحفظ اور ان کے حقوق کی پاسداری کے لئے آواز اٹھائی، لیکن ان کی ہمیشہ حق تلفی ہوتی رہی، فراز کے مطابق " انصاف میں تاخیر، انصاف کو قتل کرنے کے مترادف ہے " فراز کہتے ہیں کہ امن کے ان سوداگروں اور داعیوں کو جیتے جی کچھ نہ ملابس موت کے بعد صرف چند گلدستے اور بس: " فن کاروں کے نام " میں وہ طبقاتی نقطہ نظر کے حامل اور حق گو شاعروں اور فنکاروں پر جابر حکمران طبقوں کے مظالم اور زبان بندی کی اذیتوں کی ایک گمبھیر تصویر کھینچتے ہیں

نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں

تم نے دھرتی کے ماتھے پہ افشاں چُنی
خود اندھیری فضاؤں میں پلتے رہے
تم نے دنیا کے خوابوں کی جنت بُنی
خود فلاکت کے دوزخ میں جلتے رہے
تم نے انسان کے دل کی دھڑکن سُنی
اور خود عمر بھر خوں اُگلتے رہے

جنگ کی آگ دنیا میں جب بھی جلی
امن کی لوریاں تم سناتے رہے
جب بھی تخریب کی تُند آندھی چلی
روشنی کے نشاں تم دکھاتے رہے
تم سے انساں کی تہذیب پھولی پھلی
تم مگر ظلم کے تیر کھاتے رہے

تم نے شہکار خونِ جگر سے سجائے
اور اس کے عوض ہاتھ کٹوا دیئے
تم نے دنیا کو امرت کے چشمے دکھائے
اور خود زہرِ قاتل کے پیالے پیے
تم نے ہر اک کے دکھ اپنے دل سے لگائے
تم جیے تو زمانے کی خاطر جیے

تم پیمبر نہ تھے عرش کے مدعی
تم نے دنیا سے دنیا کی باتیں کہیں
تم نے ذروں کو تاروں کی تنویر دی
تم سے گو اپنی آنکھیں بھی چھینی گئیں
تم نے دُکھتے دلوں کی مسیحائی کی
اور زمانے سے تم کو صلیبیں ملیں
ھے آج بھی ہیں وہی سلسلے
جیتے جی تو نہ پائی چمن کی مہک
موت کے بعد پھولوں کے مرقد ملے
اے مسیحاؤ! یہ خودکشی کب تلک
ہیں زمیں سے فلک تک بڑے فاصلے

معبود

نظم "معبود" میں بھی احمد فراز اہل قلم کی ناقدری کا گلہ کرتے ہیں۔ فنکار جو عوام کی تحسین و آفریں پہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کی خوشی کے لمحے انتہائی مختصر ہوتے ہیں۔ فراز کے خیال میں پجاریوں کے یہ عقیدت مند۔ ان ہی کی خاطر دار پر چڑھ جاتے ہیں

بہت حسیں ہیں تیری عقیدتوں کے گلاب

حسین تر ہے مگر ہر گلِ خیال ترا

ہم ایک درد کے رشتے میں منسلک دونوں

تجھے عزیز مرا فن، مجھے جمال ترا

مگر تجھے نہیں معلوم قربتوں کے الم

ترے نگاہ مجھے فاصلوں سے چاہتی ہے

تجھے خبر نہیں شاید کہ خلوتوں میں مری

لہو اگلتی ہوئی زندگی کراہتی ہے

تجھے خبر نہیں شاید کہ ہم وہاں ہیں جہاں

یہ فن نہیں اذیت ہے زندگی بھر کی

یہاں گلوئے جنوں پر کمند پڑتی ہے

یہاں قلم کی زباں پر ہے نوک خنجر کی

ہم اس قبیلہ وحشی کے دیوتا ہیں کہ جو

پجاریوں کی عقیدت پہ پھول جاتے ہیں

اور ایک رات کے معبود صبح ہوتے ہی

وفاپرست صلیبوں پہ جھول جاتے ہیں

شاخِ نہال غم

"شاخ نہال غم" احمد فراز کی زندگی سوانح کا ایک باب ہے جس میں فراز کی شخصیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے یہ نظم فنی اعتبار سے مکمل نظم ہے، اس نظم میں ایک مربوط تسلسل اور حیرت انگیز حد تک واضح اور معنی خیز سمبلزم سے کام لیا گیا ہے، لیکن جذبے کا بہاؤ ہے کہ ذہن کو تنکے کی طرح بہا کر لے جاتا ہے اور

الفاظ کا طلسم ہے کہ گنجینہ معانی کے دروازے وا ہوتے چلے جاتے ہیں، اس کے ساتھ اس نظم میں طبع زاد تراکیب اور نادر اشارات کا دریا موجزن ہے بقول نسیم حبیب

"شاخِ نہالِ غم" تشبیہات و استعارات سے پیدا کئے گئے ابہام کی مکمل مثال ہے، جس سے معنویت میں وسعت پیدا ہو کر نظم پہلو دار ہو گئی ہے، نظم کو داخلی اور خارجی ہر دو رنگ میں دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے، داخلی رنگ میں آپ یوں تصور کر سکتے ہیں کہ ایک بت تراش دن رات کی انتھک محنت سے ایک مجسمہ تیار کرے لیکن جیسے ہی اس میں زندگی کی لہر پیدا ہو اس کی سب سے پہلی جنبش یہ ہو کہ اس تیشے سے اپنے خالق کا کام تمام کر دے، اس نظم کا دوسرا رخ یہ ہے کہ وہ تحریک جس میں شاعر ایک فرد کی حیثیت سے اپنے پیشرؤں اور ہمسفروں کے ساتھ چلا اسے جس منزل کی تلاش تھی اس تک پہونچتے پہونچتے کئی ہمسفر پتھر کے مجسمے بن گئے ہیں یا مصلوب ہو چکے ہیں اب اس کا دل اس اندیشے سے لرز رہا ہے کہ میں جو ہر دیوار کو پاٹ کر آئی ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے اپنے نصب العین حقیقی روپ میں آکر مایوس کر دے اور میری جد وجہد مرگِ مراد ہو"5

فراز نے اپنے تخیل سے ایک رات سے دوسری رات تک کے وقفے کو یوں سمیٹ دیا ہے جیسے برسوں کے عرصے لمحوں میں سمٹ آتے ہیں اور وہ محض ایک خواب معلوم ہوتے ہیں، نظم ملاحظہ ہو

میں اک برگِ خزاں کی مانند

کب سے شاخِ نہالِ غم پر

لرز رہا ہوں

مجھے ابھی تک ہے یاد وہ جاں فگار ساعت

کہ جب بہاروں کی آخری شام
مجھ سے کچھ یوں لپٹ کے روئی
کہ جیسے اب عمر بھر نہ دیکھے گا
ہم میں ایک دوسرے کو کوئی
وہ رات کتنی کڑی تھی
جب آندھیوں کے شب خوں سے
بُوئے گل بھی لہو لہو تھی

سحر ہوئی جب تو پیڑ، یوں خشک و زرد رُو تھے
کہ جیسے مقتل میں میرے بچھڑے ہُوے رفیقوں کی
زخم خوردہ برہنہ لاشیں
گڑی ہُوئی ہوں
میں جانتا تھا
کہ جب یہ بوجھل اشجار
جن کی کہنہ جڑیں زمیں کی عمیق گہرائیوں میں برسوں سے جاگزیں تھیں
ہجومِ صرصر میں چند لمحے یہ ایستادہ نہ رہ سکے تو
میں ایک برگِ خزاں بھی
شاخِ نہالِ غم پر رہ سکوں گا

وہ ایک پل تھا کہ ایک رُت تھی
مگر مرے واسطے بہت تھی
مجھے خبر ہے کہ کل بہاروں کی اولین صبح
پھر سے بے برگ و بار شاخوں کو
زندگی کی نئی قبائیں عطا کرے گی

مگر مرا دل دھڑک رہا ہے

مجھے، جسے آندھیوں کی یورش

خزاں کے طوفان نہ چُھو سکے ہیں

کہیں نسیمِ بہار۔۔۔۔شاخِ نہالِ غم سے

جُدا نہ کر دے

خود کلامی

احمد فراز کی نظم خود کلامی میں تشبیہات و استعارات اور امیجری پائی جاتی ہے ساتھ ہی ساتھ وحدت تاثر بلا کا ہے، یہ نظم معنی اور انداز بیان کے اعتبار سے مکمل اور بھرپور ہے

دیکھے ہی نہیں وہ لب و رخسار وہ گیسو

بس ایک کھنکتی ہوئی آواز کا جادو

حیران و پریشاں لیے پھرتا ہے بہر سُو

پابندِ تصور نہیں وہ جلوۂ بے تاب

ہو دُور تو جگنو ہے قریب آئے تو خوشبو

لہرائے تو شعلہ ہے چھنک جائے تو گھنگرو

باندھے ہیں نگاہوں نے صداؤں کے بھی منظر

وہ قہقہے جیسے بھری برسات میں کُو کُو

جیسے کوئی قمری سرِ شمشاد لبِ جُو

اے دل تری باتوں پہ کہاں تک کوئی جائے

جذبات کی دنیا میں کہاں سوچ کے پہلو

کب آئے ہیں فتراک میں وحشت زدہ آہُو

مانا کہ وہ لب ہوں گے شفق رنگ و شر رخُو

شاید کہ وہ عارض ہوں گُلِ تر سے بھی خوش رو

دل کش ہی سہی حلقۂ زلف و خمِ ابرو

یہ کس کو خبر کس کا مقدر ہے یہ سب کچھ

خوابوں کی گھٹا دُور برس جائے گی اور تُو

لَوٹ آئے گا لے کر فقط آہیں فقط آنسو

درد آشوب میں بھی شکوے کثرت سے ملتے ہیں، یہاں بھی "تنہا تنہا" کی طرح مذہب کا کوئی مثبت رنگ نظر نہیں آتا لیکن "درد آشوب" کے شکوے میں وہ جذباتی لے مدھم نظر آتی ہے جو "تنہا تنہا میں عروج پر دکھائی دیتی ہے۔

3)نایافت(۱۹۷۰)

فراز کا یہ تیسرا شعری مجموعہ ہے، یہ مجموعہ اس وقت منظر عام پر آیا جب پاکستان میں جمہوریت کا آغاز ہو چکا تھا اس مجموعے میں احمد فراز نے زیادہ تر نظموں کی جانب توجہ دی اگرچہ تعداد کے اعتبار سے اس مجموعے میں غزلیں اور نظمیں برابر ہیں یعنی اٹھائیس غزلیں بھی ہیں اور اٹھائیس نظمیں بھی تاہم نایافت کی نظموں میں جو پختگی ہے وہ غزلوں میں نہیں دکھتی۔"نایافت" کی شاعری میں فراز تشکک کے ماحول سے نکل آتے ہیں اور پہلی دفعہ ان کے یہاں مذہب کا مثبت رنگ دیکھنے کو ملتا ہے، یہاں وہ اللہ تعالیٰ، پیغمبر اور آسمانی کتابوں کی عظمت و رفعت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان پر جلد ہی اس بات کا بھی انکشاف ہو گیا تھا کہ ایک ہی معاشرے میں رہنے والے مختلف افراد میں مادی وسائل، دولت اور انسانی ضرورت کی اشیاء کی غیر منصفانہ تقسیم ہوئی ہے، اور انھوں نے اپنے اس مشاہدے کو اپنے شعر میں اس انداز میں پیش کیا ہے

صحرا تو بوند کو بھی ترستا دکھائی دے
بادل سمندروں پہ برستا دکھائی دے

جیسے جیسے فراز کے مشاہدات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور انھوں نے ایک ہی شہر میں محلوں، جھونپڑوں، کارخانوں، عمارتوں اور کچے گھروں کو ساتھ ساتھ دیکھا تو انھیں یہ جاننے میں دشواری نہ ہوئی کہ یہ کیفیات اور حالات ایک غیر منصفانہ نظام کے تحت وقوع پذیر ہو رہے ہیں، سماج کا ایک طبقہ ناانصافیوں کو برقرار رکھنا چاہتا ہے تاکہ ان کو آسودگی اور معاشرے میں ان کی عزت پر فرق نہ پڑے۔ وہ زندگی کے سارے حقوق اور وسائل اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرا طبقہ ان کا غلام ہو کر رہے۔ خواہ اس کے لئے اس طبقے کو کتنی بھی اذیتیں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں اور کتنے بھی ستم کیوں نہ سہنا پڑیں، مگر ان کی اپنی آسائش میں کمی نہ آنے پائے:

دریدہ پیرہنوں کا خیال کیا آتا
امیر شہر کی اپنی ضرورتیں تھیں بہت

وہ ظالموں کے ہتھکنڈے دیکھ کر ضبط سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن عوام کی ویران زندگی کو دیکھ کر وہ دکھ بیان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ کہیں اس دکھ کے بوجھ سے خود ان کا دم نہ گھٹ جائے

ظبط لازم ہے مگر دکھ ہے قیامت کا فراز
ظالم اب کے بھی نہ روئے تو مر جائیگا

وہ جب دیکھتے ہیں کہ حق گوئی کا قحط پڑ چکا ہے اور کوئی بھی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والا سوائے ان کے نہیں ہے تو انھیں خود سا گنہگار بھی پیمبر نظر آتا ہے

وہ قحط حرف حق ہے کہ اس دور میں فراز
خود سا گناہ گار پیمبر لگے مجھے

اس مجموعے میں موجود ایک نظم "سلامتی کونسل" ہے اس نظم کو احمد فراز نے بہانگ دہل بنا کسی خوف و جھجھک کے لکھا ہے اس نظم کے بارے میں انعام حسین کہتے ہیں

"یہ نظم کل چودہ اشعار پر مشتمل ہے جس میں بدترین عالمی عدالت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ادارے کے بھیس میں تمام یورپین اقوام، امریکہ، بہادر کے زیر کمان، امن عالم کو مکمل تناہی وبربادی کی طرف لے کر بڑھ رہی ہے "6

اس نظم میں فراز نے عالمی تنظیم برائے حقوقِ انساں کو "فتنہ گرِ دہر" قرار دیا اور اس کی پر زور انداز میں مخالفت کی وہ کہتے ہیں

پھر چلے ہیں مرے زخموں کا مداوا کرنے
میرے غمخوار اُسی فتنہ گرِ دہر کے پاس
جس کی دہلیز پہ ٹپکی ہیں لہو کی بوندیں
جب بھی پہنچا ہے کوئی سوختہ جاں کشتۂ یاس
جس کے ایوانِ عدالت میں فروکش قاتل
بزم آراو سخن گستر و فرخندہ لباس
ہر گھڑی نعرہ زناں 'امن و مساوات کی خیر'
زر کی میزان میں رکھے ہوئے انسان کا ماس

کون اس قتل گہِ ناز کے سمجھے اسرار
جس نے ہر دشنے کو پھولوں میں چھپا رکھا ہے
امن کی فاختہ اڑتی ہے نشاں پر لیکن
نسلِ انساں کو صلیبوں پہ چڑھا رکھا ہے
اس طرف نطق کی بارانِ کرم اور ادھر
کاسۂ سر سے مناروں کو سجا رکھا ہے

جب بھی آیا ہے کوئی کشتۂ بیداد اُسے
مرہمِ وعدۂ فردا کے سوا کچھ نہ ملا
یہاں قاتل کے طرفدار ہیں سارے قاتل
خواہشِ دیدۂ پرخوں کا صلہ کچھ نہ ملا
کاشمر کوریا ویت نام دومنکن کانگو
کسی بسمل کو بجز حرفِ دعا کچھ نہ ملا

قصرِ انصاف کی زنجیر ہلانے والو
کجکلاہوں پہ قیامت کا نشہ ہے طاری
اپنی شمشیر پہ کشکول کو ترجیح نہ دو
دم ہو بازو میں تو ہر ضربِ جنوں ہے کاری
اس جزیرے میں کہیں نور کا مینار نہیں
جس کے اطراف میں اک قلزمِ خوں ہے جاری
"جوہرِ جامِ جم از کانِ جہانِ دگر است
تُو توقع ز گلِ کوزہ گراں می داری"

"نایافت" میں فراز کے یہاں مذہب کا مثبت رنگ نظر آتا ہے۔ یہاں وہ پہلی دفعہ مقدس صحیفوں کی عظمت کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ یہاں بھی شکووں کا سلسلہ برقرار ہے، لیکن پہلی مرتبہ ان کے یہاں مذہبی حوالے مثبت صورت میں سامنے نظر آتے ہیں اس حوالے سے وہ اپنی نظم "عقیدت" میں کہتے ہیں

میں ایک اک بات
ایک اک جرم کی کہانی
دھڑکتے دل، کانپتے بدن سے سنا رہا تھا
مگر وہ پتھر بنی
مجھے اس طرح سے سنتی رہی

کہ جیسے مرے لبوں پر
کسی مقدس تریں صحیفے کی آیتیں تھیں

احمد فراز کسی شہر ملک یا خطے کے شاعر نہیں، وہ پوری کائینات کے دکھ سکھ لکھتے ہیں وہ ان کے سماجی، سیاسی، اقتصادی مسائل کو اپنی روح میں محسوس کرتے ہیں، "نایافت" میں موجود ان کی نظم "نذر نذرل" میں وہ عوام دوست فن کار کی عظمت اور اہمیت بیان کرتے ہیں ان کے فن میں ایک شعور انگیز جادو ہے اور وہ اپنی حق گوئی سے مظلوم انسانوں میں مزاحمت کا جذبہ پیدا کرتے ہے۔ لوگوں کی بے زبانی کو زبان عطا کرتے ہیں۔ ان میں ظلم کا احساس پیدا کر کے انھیں خود شناس بناتے ہیں۔ فراز نے شاعر کی حیثیت سے ہر حالت میں حق گوئی کو بر قرار کھا ہے، اسی لئے وہ فن کار کی حق گوئی کو بے پناہ اہمیت دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب مصلحتوں کی بنا پر فنکار ظلم کی سینہ زوری دیکھ کر خاموش رہتا ہے تو ظالم اپنے ظلم کی یورش کو اور تیز کر دیتا ہے اس طرح وہ دوسرے انسانوں کے مقدس حقوق کو پامال کرتا چلا جاتا ہے، اس لئے انھیں ہر حال میں اپنی حق گوئی کو قائم رکھنا چاہئے خواہ اس کا صلہ صلیب ہی کیوں نہ ہو "نذر نذرل" (نذر الاسلام) کے عنوان سے لکھی گئی نظم کا لہجہ بھی تقریباً ایسا ہی ہے وہ کہتے ہیں

فنکار اگر زباں نہ کھولے
انبار گہر نصیب اس کا
ورنہ ہر شہریار دشمن
ہر شیخ و حرم رقیب اس کا
چاہے وہ فراز ہو کہ نذرل
بولے تو صلہ صلیب اس کا

وہ الگ بات ہے کہ "نایافت" میں کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں احمد فراز نے اپنا غم رومانوی لہجے میں چھپا کر بات کی ہے اس سلے کی ایک نظم "گئی رت" کافی اہمیت رکھتی ہے
چند اشعار ملاحظہ ہوں
ہر ایک نقش وہی آج بھی ہے جو کل تھا

یہ راکھ خواب بنے خواب سے گلاب بنے

ہر اک ستارہ مژگاں سے ماہتاب بنے

برس فراق کا جیسا وصال کا پل تھا

استحصالی نظام پر فراز کا طنز ہمیشہ بہت واضح اور سخت ہوتا ہے، ان کی ایک نظم "یہ کیسی رت ہے " تیسری دنیا کے معاشروں میں ٹھہری ہوئی بد حالی پر ایک مسلسل طنز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کیسی رت ہے کہ شجر اداس، پرندے خاموش اور تر ہوائیں نوحہ گر ہیں، کیا جانے باغ میں موسم بہار کب لوٹ کر آتا ہے موسم سرما بھی نہیں ہے کہ برف باری سے شاخوں کے پیرہن سفید ہوں۔ نہ موسم گل ہے کہ ہر طرف پھول مہک رہے ہوں اور آواز پرندوں کی نغمہ سرائی ہو، یہ رت فراز کے لئے پہیلی بن جاتی ہے اور وہ اپنے طنز کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں

نہ دور پت جھڑ کا ہے

کہ بے جان کونپلوں کو

امید فردائے مہرباں ہو

یہ کیسی رت ہے

کوئی تو بولے کوئی تو دھڑکے

کوئی تو بھڑکے

فراز کی اس نظم کے حوالے سے انعام حسین لکھتے ہیں

> " سرزمینِ وطن اس نظم کا پس منظر ہے اور شاعر کے دل و دماغ پر ایک انقباضی کیفیت طاری ہے۔ وطن عزیز اور جنوبی ایشیاء پر خوف ناک یلغار امریکہ اور اس کے سیاسی اتحادیوں کی طرف دمبدم کروٹیں لے رہی ہے، جس کی باعث خطے کا امن ایک ہولناک خطرے کی لپیٹ میں آچکا ہے اور پاکستان کے سیاست دانوں، افواجِ پاکستان اور ملک کے دانشوروں کو للکارتا رہا ہے،

شاعر کی چھٹی حس، سب کو بے چینی کا پیغام دیرہی ہے، وہ اقبال
کی زبان میں پوچھنے پر اور سوچنے پر مجبور ہو چکا ہے، دیکھئے اس بحر
کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا؟ گنبدِ نیلو فری، رنگ بدلتا ہے کیا؟"7

احمد فراز کی عالمی سوچ اور قلم کی آفاقیت کا مشاہدہ "نایافت" میں موجود ان کی نظم "ویتنام" میں کیا جا سکتا ہے، یہ نظم، ویتنام جنگ کے حوالے سے کہی گئی ہے، اس نظم میں یہ عندیہ دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ وہ مہذب قومیں جو جنگ ویتنام کے لئے امریکہ کو مجرم ٹھہرا رہی ہیں وہ خود کے گریبان میں کیوں جھانک کر نہیں دیکھتی، جبکہ خود ان کے قبیلوں، اور شہروں میں انسانیت کو بری طرح کچلا جارہا ہے اور وہ خاموش تماشائی بنے کھڑے ہیں نظم کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو

مگر مجھے اس کا بھی یقیں ہے کہ کل کی تاریخ
نسلِ آدم سے یہ بھی پوچھے گی
اے مہذب جہان کی مخلوق
کل ترے روبرو یہی بے ضمیر قاتل
ترے قبیلے کے بے گناہوں کو
جب تہہ تیغ کر رہا تھا / تو تو تماشائیوں کی صورت
خموش و بے حس / درندگی کے مظاہرے میں شریک
کیوں دیکھتی رہی ہے
تری یہ سب نفرتیں کہاں تھیں
بتا کہ اس ظلم کیش قاتل کی تیغ براں میں
اور تری مصلحت کے تیروں میں
فرق کیا ہے؟
تو سوچتا ہوں کہ ہم سبھی کیا جواب دیں گے

ٹارگیٹ کلنگ کا بڑھتا ہوا رجحان پاکستانی عوام کے لئے کوئی نئی بات نہیں، کیوں کہ یہ بے چہرہ جرائم کی کہانی پاکستان کے وجود کے ساتھ ہی شروع ہوئی ہے۔ فراز نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ اس حوالے سے بھی رد عمل کا اظہار کیا ہے، اسی مجموعے میں ایک نظم "قاتل" ہے اس نظم "قاتل" میں فراز کہتے ہیں

قاتل چُپ ہے
خوں آلودہ ہاتھ میں اب تک
خنجر تھر تھر کانپ رہا ہے
لوگوں کا انبوہ اُسے
گھیرے میں لے کر
چیخ رہا ہے
یہ قاتل ہے
یہ قاتل ہے
خاک اور خوں میں لت پت لاش
کے ہونٹوں پر
اک بات جمی ہے
یہ قاتل ہے
لیکن کس کا
یہ اپنی تخلیق کا قاتل
اس نے خود کو قتل کیا ہے
لوگوں کا انبوہ مگر
کب سُنتا ہے
کون ہے قاتل
کس نے

کس کو قتل کیا ہے؟

اس مجموعہ میں فراز کی 28 نظمیں اور 28 ہی غزلیں شامل ہیں

4)شب خون(۱۹۷۱)

احمد فراز کا یہ چوتھا مجموعہ "شب خون "اس دور کی پیداوار ہے جب فراز باقی لوگوں کی طرح خود کو محب وطن ہونے کا ثبوت دیرہے تھے، انھوں نے وطن کی محبت میں امن کے گیت گائے اور بے شمار ترانے لکھے، جو""شب خون" " میں شامل ہیں،"""شب خون" " کے مطالعے کے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ ہم عرب کے امر القیس کا کوئی ملی قصیدہ پڑھ رہے ہوں ،"""شب خون" " کی شہرت کی وجہ یہ بنی کہ اس مجموعے میں موجود کلام میں 1965ء اور 1972 کی جنگوں سے پیدا شدہ صورتحال کی عکاسی کرتا ہے دشمن کے خلاف فراز کا بھرپور احتجاجی رویہ اس مجموعے میں عروج پر ہے، وہ امن کے داعی ہیں اور اپنے ملک کی مٹی پر خون کی بہتی ندیاں نہیں دیکھ سکتے، انھوں نے ہمیشہ جنگ و جدل سے نفرت کی اور 1965ء اور 1972 دونوں جنگوں کی بھرپور مذمت کی۔ ان کی وطن دوستی ان کی خوبصورت نظم "اے مرے ارضِ وطن "میں کچھ اس طرح سامنے آتی ہے

تونے بخشا تھا مرے فن کو وہ اعجاز کہ جو

سنگِ خارا کو دھڑکنے کی ادا دیتا ہے

تونے وہ سحر مرے حرف نوا کو بخشا

جو دل قطرہ میں قلزم کو چھپا دیتا ہے

تونے وہ شعلۂ ادراک دیا تھا مجھ کو

جو کفِ خاک کو انسان بنا دیتا ہے

6 ستمبر 1965 کو جب ہندوستان نے پاکستان کی سرحدوں پر حملہ کرکے """شب خون" " مارا اس جنگ کے پس منظر میں بہت سے مسائل تھے مثلاً کشمیر کا مسئلہ مگر ساتھ ہی ساتھ اس جنگ کے اثرات کو قلم قبیلے نے بھی محسوس کیا اور اپنے ملک کی فوج اور عوام کے حوصلے بلند کرنے کے لئے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے قومی و ملی نغمے و ترانے لکھے ، فراز نے بھی اس جنگ سے پیدا شدہ صورتِ حال کو شدت سے محسوس کیا۔ انھوں نے اس جنگ کے حوالے سے اپنے تحفظات کا بھرپور اظہار کیا اور اس کی

بھرپور مذمت کی، اس جنگ کے نتیجے میں پیدا شدہ صورتِ حال پر فراز خون کے آنسو روتے نظر آتے ہیں، جنگ سے جہاں کہیں بھی تباہی برپا ہوئی، جہاں کہیں بھی پورے ملک کا امن و سکون غارت کیا گیا، وہاں ہر محب وطن کی طرح فراز نے کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

دلاورانِ وفا کیش کی شہادت پر

مرا جگر بھی لہو ہے پہ وقفِ یاس نہیں
سیالکوٹ کے مظلوم ساکنوں کے لئے
جز آفریں کے کوئی لفظ میرے پاس نہیں
میں کیسے خطۂ لاہور کے پڑھوں نوحے
یہ شہر زندہ دلاں آج بھی اداس نہیں
جنت میں بھڑک رہے تھے شعلے
پھولوں کی جبیں جھلس گئی تھی
شبنم کو ترس گئی تھی شاخیں
گلزار میں آگ بس گئی تھی
نغموں کا جہاں تھا ریزہ ریزہ
اک وحشتِ درد کُو بکُو تھی
ہر دل تھا بجھا چراغ گویا
ہر چشمِ طلب لہو لہو تھی
میں اور میرے رفیق برسوں
خاموش و فسردہ دل کھڑے تھے
پر جاں کا زیاں قبول کس کو
منزل کے تو راستے بڑے تھے
لیکن یہ سکوتِ مرگ آساں

تادیر نہ رہ سکا فضا میں

اک شور سا چار سمت اٹھا

کچھ مشعلیں جل اٹھیں ہوا میں

اک رقصِ جنوں ہوا ہے جاری

یہ رقصِ جنوں نہ رُک سکے گا

یہ شمعِ نوا نہ بجھ سکے گی

یہ پرچمِ جاں نہ جُھک سکے گا...

وطن کی محبت کا جذبہ آبائی گاؤں سے پھیلتا ہوا عالمی سطح تک پہنچتا ہے اور عالمی سطح پر جہاں کہیں بھی ظلم ہو رہا ہے فراز کا دل خون کے آنسو روتا ہے، ان کے سینے میں انسانیت سے انس رکھنے والا دل موجود ہے ،وہ صرف اپنی ذات ، گاؤں ، وطن کے لئے نہیں سوچتے بلکہ تمام دنیا میں امن کے داعی ہیں، ملکی اور عالمی سطح پر امن، آزادی اور انسانی مساوات کے اصولوں کی جابر قوتوں کی طرف سے پامالی دیکھ کر ان کا دل تڑپ اٹھتا تھا، اس حوالے سے ان کی نظم اے مرے شہر "اہمیت کی حامل ہے،"اے مرے شہر" ان کے آبائی گاؤں کوہاٹ کے متعلق ہے۔1965 میں کوہاٹ ،ہندوستان کی بمباری کی وجہ سے برباد ہو گیا تھا اور وہاں کافی جانیں بھی تلف ہوئیں تھیں، کوہاٹ کے حالات پر نظر دوڑا کر ان کو پوری دنیا میں ظلم و ستم کی تصویر دکھائی دیتی ہے گویا کہ نظم "اے مرے شہر" ایک قسم کی احساسِ ندامت ہے، اس نظم میں شاعر نے اپنی ذات کو نشانہ بنایا ہے

مرے شہر!

میں تجھ سے نادم ہوں

اِس خامشی کے لئے

جب عدو تیری خوابیدہ گلیوں پہ

بھیگی ہوئی رات میں

آگ برسا رہا تھا

میں چپ تھا

مرے شہر!

میں تیرا مجرم ہوں

اس بے حسی کے لئے

جب ترے بام و در

طاق و دہلیز و دیوار

تیرے مکینوں کے

خونِ حنا رنگ سے

تربتر ہو رہے تھے

تو میں چشم بستہ تھا

اے مرے آباء کے مسکن!

میں تیرا گنہگار ہوں

جب ترے آئینۂ رنگ چشموں سے

اک جوئے خوں آملی تھی

تو میرے لبوں پر

کوئی حرفِ ماتم نہ آیا

کہ جب تیرے زرتاب خرمن پہ

سفاک بجلی گری تھی

تو میں تیری جلتی ہوئی کھیتیوں کی طرف

با دلِ چاک و با چشمِ پُرنم نہ آیا

میں شرمندہ ہوں

اے مرے برگزیدہ بزرگوں کی بستی

کہ اِس درد کی فصل میں
تیرے فرزند شاعر کی نوکِ قلم پر
ترا اسمِ اعظم نہ آیا
یہ سب کچھ بجا ہے---
یہ سب کچھ بجا ہے
مگر اے مقدس زمیں!
تیری مٹی نے جب میری صورت گری کی
تو ورثے میں تُو نے
مجھے ایسا دل دے دیا تھا
جو اپنے دُکھوں کے سمندر نہ دیکھے
مگر دوسروں کے نمِ چشم سے باخبر ہو
مجھے تیری گِل نے وہ احساس بخشا
جو اپنے عزیزوں کی لاشوں پہ
پتھر بنا دم بخود ہو
مگر خواہشِ دیگراں پر
سدا نوحہ گر ہو
مرے شہر!
جب تیرے سینے سے
مینارِ خوں اٹھ رہا تھا
میں اُس وقت
غافل نہیں تھا
میں بے حس نہیں تھا

مگر اُس گھڑی میرا سارا وطن
ظلم کی زد میں تھا
میرا سارا چمن
آگ کی حد میں تھا
ساری دنیا کی مظلومیت، میری آہوں میں تھی
ساری دنیا میری نگاہوں میں تھی
اس سمے
تُو ہی تُو تھا
پشاور کا
لاہور کا
اور
بنگال کا نام، کوہاٹ تھا
کاشمیر
کوریا
ہیروشیما کا ویتنام کا نا، کوہاٹ تھا
ساری مظلوم دنیا کے ہر شہر کا نام کوہاٹ تھا
اے مرے شہر!
میرا قلم اپنے کردار پر
تجھ سے نادم سہی
خود سے نادم نہیں
تو مرا شہر ہے
پر مرا شہر تو آج ساری زمیں ہے

فقط تو نہیں ہے

فراز کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ جنگ و جدل کے ماحول میں اپنے وطن کے لئے کچھ نہ کر سکے، لیکن اس بات پر ضمیر کے سامنے سر اٹھائے ہوئے ہیں کہ اس وقت وہ صرف کوہاٹ کے غم میں نہیں، بلکہ پوری دنیا میں ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانے والوں میں شامل تھے۔ اس نظم میں جہاں فراز میں احساسِ ندامت ہے وہیں ان کو اپنے قلم کی آفاقیت پر فخر بھی ہے۔

"شب خون" کی آخری نظم "سلام اس پر" میں امام حسین رضی اللہ عنہ کی عظمت اور کارناموں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، واقعہ کربلا کی تاریخ ایک عظیم الشان اور عدیم المثال واقعہ ہے، یہیں سے انسانیت نے نئی رفعتوں کی جانب قدم آگے بڑھائے ہیں اور تاریخ نے ایک نئے راستے پر سفر شروع کیا ہے، یہ نظم مؤثر اور دل پذیر ہونے کے ساتھ ہی اس حقیقت کی مظہر بھی ہے کہ جدید اردو شعراء نے امام حسین کی عظیم شخصیت اور کربلا کے بے مثال تاریخی واقعے کو دیکھنے کی روش ایجاد کی ہے۔ وہ امام حسین کے جسم اقدس پر لگنے والے زخموں کے نشانات نہیں گنتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ امام حسین کی تاریخ ساز شخصیت اور کردار نے کتنی صدیوں کو متاثر کیا ہے فراز، شہید کربلا کی عظیم قربانی کے سامنے اپنی زندگی کو ہیچ بتاتے ہیں

میں آج اس کربلا میں

بے آبرو۔۔۔۔۔۔۔۔

شکست خوردہ خجل کھڑا ہوں

جہاں سے میرا عظیم ہادی

حسین کل سرخ رو گیا تھا

میں جاں بچا کر

فنا کے دلدل میں جاں بلب ہیں

زمین اور آسمان کے عز و فخر

سارے حرام مجھ پر

وہ جاں لٹا کر

منارہ عرش چھو گیا

سلام اس پر

سلام اس پر

اسلام کا ظہور اس کے نزدیک

اک داستاں کا حصہ نہیں ہے

اک واقعہ نہیں ہے

یہیں سے تاریخ

اپنے منارہ سفر کا آغاز کر رہی ہے

یہیں انسانیت

نئی رفعتوں کو پرواز کر رہی ہے

(سلام اس پر۔شب خون:93)

ان کا یہ پورا مجموعہ ہی ہندوپاک جنگ اور تقسیم بنگال سے متعلق ہے، انھوں نے بے شمار وطن سے محبت کے قومی ترانے اور گیت لکھے جن میں "اے میرے ارضِ وطن" اے میرے شہر "،" یہ کھیت یہ کھلیان،" اور "ترانہ" وغیرہ شامل ہیں ساتھ ہی ساتھ "شب خون" تک آتے آتے فراز کا تصور مذہب بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں مذہب کا مطالعہ بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا ہے یہاں مذہب کے مثبت حوالے مسلسل نظر آنے شروع ہو جاتے ہیں، یہاں مختلف حوالوں سے فراز شہداء کا ذکر کرتے ہیں اور شہیدوں کو سلام پیش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مجاہد، کفن، غازی، قیامت کے زلزلے جیسے الفاظ پہلی دفعہ دیکھنے کو ملتے ہیں سب سے بڑھ کر نظم " سید الشہداء" ہے جس میں حضرت امام حسین کی عظمت ورفعت کو تسلیم کرتے ہوئے حق کی خاطر ان کی قربانی کو سراہتے ہیں۔

(5)میرے خواب ریزہ ریزہ1972ء

فراز کا پانچواں مجموعہ "میرے خواب ریزہ ریزہ "چار منظوم ڈراموں پر مشتمل ہے مرے خواب ریزہ ریزہ فراز کا پانچواں مجموعہ ہے اس مجموعے میں فراز کے چار منظوم ڈرامے ہیں یہ ڈرامے فراز نے اس زمانے میں لکھے تھے جبکہ وہ پاکستان ریڈیو میں بر سر ملازمت تھے۔پاکستان ریڈیو کے لئے جو ڈرامے لکھے تھے انھیں کو فراز نے "مرے خواب ریزہ ریزہ "کے نام سے شائع کیا یہ مجموعہ نصرت عظیم کے نام منسوب کیا گیا اور یہ درج ذیل شعر بھی انھیں کے نام منسوب کیا ہے

میرے ہر نقش میں پنہاں ہے کہانی تیری

فن کی معراج ہے تصویر بنانی تیری

پہلا ڈرامہ "روشنیوں کا شہر "۔دوسرا "ساحل کی ریت "۔تیسرا ڈرامہ "موم کے پتھر۔چوتھا ڈرامہ " آخری شب کے ہم سفر "ہے

"روشنیوں کا شہر "میں چھ مناظر ہیں اور اس ڈرامے کے پہلے منظر میں۔بوڑھا، آمنہ ،خالدہ کے کردار ہیں

دوسرے منظر میں سلمی،زاہدہ،خالدہ،مصور اور بوڑھا اور آمنہ ہیں،

تیسرے منظر میں صرف بوڑھا اور آمنہ ہیں

چوتھے منظر میں۔صرف مصور اور خالدہ ہیں

پانچویں منظر میں ،بوڑھا، آمنہ اور خالدہ ہیں

چھٹے منظر میں خالدہ۔مصور کی خیالی آواز بوڑھا اور آمنہ ہیں۔اس ڈرامہ کا اختتام اسی منظر پر ہوتا ہے

ڈرامے کے اختتام کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

آہ اے شہر چمکتے ہوئے ہنستے ہوئے شہر

کتنا بے رحم ہے،سفاک ہے تو

تیرے بے خواب دریچوں کے اجالے جلاد

تیرے شب تاب ستونوں کی ضیا تیغِ ستم

تیرے نغموں کی کھنک ساغر سم

تیری ضو بار عمارات ہیں، مقتل گاہیں

تیری رعنائیاں آنکھوں کا فریب

یہ ترا حسن ملمع ہے نمائش ہے فقط

ریگ رواں، موج سراب

تو ہی قاتل ہے مرا اور مری بیٹی کا

تو ہی قاتل ہے مرا اور مری بیٹی کا

اے چمکتے ہوئے شہر

اے چمکتے ہوئے شہر

فراز کا دوسرا ڈرامہ جو اس مجموعے میں موجود ہے وہ "ساحل کی ریت " ہے اس ڈرامے کے آغاز میں اسٹیج کا منظر کچھ اس طرح ہے

" سمندر کی لہروں کا خروش ۔۔۔۔۔ آبی پرندوں کی
صدائیں بعض ساحل نشینوں کی آوازیں اور قہقہے۔۔۔۔
دور سے دھیمی آوازوں میں ملاحوں کا گیت سنائی دیتا ہے
"

اس ڈرامے کے کرداروں میں، سلیماں، ہمزاد، نبیلہ اور خاتون ہیں اس ڈرامے کا اختتام اس طرح ہوتا ہے

ہوا تیز ہونے لگی ہے

پرندوں کی آواز میں ایک وحشت سی ہے

جیسے طوفان آنے کو ہو

زندگی ریت ساحل کے مانند ہے

جس کے ہر نقش کو وقت کی تیز لہریں مٹا ڈالتی ہیں

سمندر کی لہریں مرے نقش کی منتظر ہیں
سمندر کی لہریں مرے نقش کی منتظر ہیں
اس مجموعہ کا تیسرا ڈرامہ "موم کے پتھر" ہے اس مجموعے کے اہم کردار، بوڑھا، فریدوں، عالیہ، پروفیسر اور سیاح ہیں، اس ڈرامہ کا اختتام عالیہ کی اس گفتگو پر ہوتا ہے

تری عالیہ مر چکی ہے تری عالیہ
ہاں مگر اک مری آخری التجا ہے۔
کہ تم اپنے فن کو بلندی کی ان چوٹیوں تک اٹھانا
کہ میں جس جگہ ہوں۔۔۔۔۔ تمھیں فخر سے اور محبت سے دیکھوں
ترا فن مری زندگی ہے فریدوں۔۔۔۔۔ فریدوں۔۔۔۔۔۔ فریدوں

میرے خواب ریزہ ریزہ میں چوتھا اور آخری منظوم ڈرامہ "آخری شب کے ہم سفر" ہے اس ڈرامے کے کردار سپاہی اور عورت ہیں
اس تمثیلی ڈرامے میں عورت کا وجود ہی مرکزی کردار ہے، فراز کی نظموں میں عورت محض حسن کا نام نہیں بلکہ وہ امن و آشتی اور تخلیق کی تابندہ علامت بھی ہے، وہ اس کائینات میں محبت اور ایثار کا لازوال سرچشمہ ہے۔ نظم "آخری شب کے ہم سفر" میں ایک مصیبت زدہ عورت جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد اپنے شوہر کی لاش کو تلاش کرنے آتی ہے اور دشمن سپاہی سے یوں مخاطب ہوتی ہے

اگر تو نہیں تو کوئی تیرا ہم جنس ہو گا
کہ قاتل تو سب ایک ہیں
ایک سے ہیں
مجھے اس سے کیا
کس کے کنجر سے گھائل ہوئی ہوں
مجھے اس سے کیا

کس کی مشعل کے شعلے نے میرا جہاں پھونک ڈالا
وہ خنجر تیرا ہو کہ تیرے رفیقوں کا ہو
میں تو گھائل ہوئی
آگ تو نے لگائی ہو یا تیرے ہمراہیوں نے
میرا آشیاں تو چلا
(آخری شب کے ہم سفر۔ میرے خواب ریزہ ریزہ۔ ص:134)
اس مجموعے پر قیوم نظر نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا

"احمد فراز اردو کے ان جواں فکر شاعروں میں سے ہے جنھوں نے غنائیہ شاعری کی گرتی ہوئی دیوار کو قدیم روایات اور جدید تقاضوں کے دل کش رنگ اور آہنگ سے قابل قدر سہارا دیا ہے، فراز کی عشقیہ شاعری میں قرب محبوب سے زیادہ ہنگامِ جدائی کے مرقعے ملتے ہیں اور یہ بات فراز تک محدود نہیں اردو غزل کا بیشتر سرمایہ فراق کی طویل گھڑیوں کو گننے اور ہجر کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے مراحل سے بھرا ہوا ہے۔ فراز کو بھی دنیائے محبت کی اس بے آب و گیاہ اور بے رنگ و نورو ادی سے حسب معمول گزرنا پڑا ہے، لیکن اس کے ذہن نے جس طرح اس کے اثرات کو قبول کیا اس میں مریضانہ فریاد کی جگہ صحت مندانہ رد عمل ملتا ہے اور وہ اس تنگ و تاریک گوشے میں بھی زندگی کی جھلک دکھاتا ہے"8

(6)جاناں جاناں ۱۹۷۶

جاناں جاناں یہ فراز کا چھٹا شعری مجموعہ ہے جو کہ ۱۹۷۶ء میں منظر عام پر آیا فراز نے اس مجموعے کو عطاء اللہ سجاد کے نام کیا ہے، فراز کا جب یہ شعری مجموعہ منظر عام پر آتا ہے تو وہ پاکستان نیشنل سنٹر کے ڈائریکٹر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ ذوالفقار علی بھٹو کے جمہوری حکومت کا دور تھا اور ذو الفقار علی بھٹو فراز کے آئیڈیل تھے، لیکن اس کے باوجود اس زمانے میں جمہوری حکومت کے خلاف مزاحمت کا بھرپور اظہار کیا ہے،اس حوالے سے مسعود اشعر اپنے مضمون "یہ نوحہ نہیں ہے" میں کہتے ہیں

"حیات محمد خان شیر پاؤ کے دھماکے میں انتقال کے بعد جب بھٹو
صاحب نے نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی لگائی اور ولی خان کو
گرفتار کیا تو فراز نے حکومت یا اپنی ملازمت کی بالکل پرواہ نہیں
کی اور کھلم کھلا ولی خان کی حمایت میں آواز اُٹھائی"9

جاناں جاناں تک آتے آتے فراز کا مذہبی مطالعہ وسعت اختیار کرتا ہے،یہی وہ دور ہے جب ان کا درج ذیل شعر منظرِ عام پر آکر ہنگامہ خیز ماحول پیدا کر دیتا ہے

اب رسولوں کی کتابیں طاق میں دھر دو فراز
نفرتوں کے یہ صحیفے عمر بھر دیکھے گا کون؟

دراصل فراز یہاں رسولوں کی کتابوں کا نعوذ باللہ انکار نہیں کر رہے اور نہ مقدس کتابوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ مختلف مذاہب کے نام پر ہی لوگوں میں نفرتیں پھیل رہی ہیں، اس لئے اس قسم کی بے جا بحثوں اور مذہب کے نام پر جنگ وجدل سے اجتناب میں ہی عافیت ہے۔

فراز کی حوصلہ مندی، ہمت اور عزم و امید کے حوالے سے پروفیسر حمید شاہین اپنے مضمون ،"سلسلہ ٹوٹا نہیں درد کی زنجیر کا" میں کہتی ہیں

"1972ء میں ان کی کتاب "میرے خواب

ریزہ ریزہ" تھا لیکن 1976ء میں " جاناں جاناں "تک آتے آتے انھیں اس حقیقت کا ادراک ہو چکا تھا کہ ریزہ ریزہ خوابوں کو کشتِ آرزو میں بویا جا سکتا ہے اور امید کے پھول کھلائے جا سکتے ہیں، نئے موسموں کی بات کی جا سکتی ہے اور ان کے انتظار میں ہمت و حوصلہ قائم رکھا جا سکتا ہے"10

اس حوالے سے احمد فراز کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہو

اتنا بے رنگ دکھ کو نہیں جانئے ہر رگ جاں شعاعِ بدن ہوئے گی

لوگ پھر سے اچھالیں گے اپنا لہو اور گلگوں قبائے وطن ہوئے گی

تم نے ہونٹوں پہ مہریں لگا دیں تو کیا تم نے شمعیں نوا کی بجھا دیں تو کیا

جو حکایت سنی ان سنی ہو گئی، اب وہی انجمن انجمن ہوئے گی

جنرل ضیاء لاحق کے دورِ اقتدار میں بھی وہ سرکاری عہدے پر کام کر رہے تھے اور پاکستان نیشنل سنٹر کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر تھے، لیکن انھوں نے جنرل ضیاء الحق کے خلاف ہر قسم کی مزاحمت کی۔ اس وقت انھوں نے نوکری کی پرواہ کیے بغیر جنرل ضیاء الحق سے ٹکر لی۔ انھوں نے "پیشہ ور قاتلو" لکھی اور قیدِ تنہائی کی اذیت ناک زندگی گزاری۔ یہاں تک کہ ان کو نوکری سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔

جاناں جاناں میں موجود خوبصورت نظم "اب کس کا جشن مناتے ہو" میں کہتے ہیں

اب کس کا جشن مناتے ہو، اس دیس کا جو تقسیم ہوا

اب کس کے گیت سناتے ہو، اس تن من کا جو دو نیم ہوا

اس خواب کا جو ریزہ ریزہ ان آنکھوں کی تقدیر ہوا

اس نام کا جو ٹکڑا ٹکڑا اگلیوں میں بے توقیر ہوا

اس پرچم کا جس کی حرمت بازاروں میں نیلام ہوئی
اس مٹی کا جس کی حرمت منسوب عدو کے نام ہوئی

اس جنگ کو جو تم ہار چکے، اس رسم کا جو جاری بھی نہیں
اس زخم کا جو سینے پہ نہ تھا، اس جان کا جو واری بھی نہیں

اس خون کا جو بد قسمت تھا راہوں میں بہا یا تن میں رہا
اس پھول کا جو بے قیمت تھا، آنگن میں کھلا یا بن میں رہا

اس مشرق کا جس کو تم نے نیزے کی انی، مرہم سمجھا
اس مغرب کا جس کو تم نے جتنا بھی لوٹا، کم سمجھا

ان معصوموں کا جن کے لہو سے تم نے فروزاں راتیں کیں
یا ان مظلوموں کا جس سے خنجر کی زباں میں باتیں کیں

اس مریم کا جس کی عفت لٹتی ہے بھرے بازاروں میں
اس عیسیٰ کا جو قاتل ہے اور شامل ہے غم خواروں میں

ان نوحہ گروں کا جس نے ہمیں خود قتل کیا خود روتے ہیں
ایسے بھی کہیں دم ساز ہوئے، ایسے جلاد بھی ہوتے ہیں

ان بھوکے ننگے ڈھانچوں کا جو رقص سر بازار کریں
یا ان ظالم قزاقوں کا جو بھیس بدل کر وار کریں

یا ان جھوٹے اقراروں کا جو آج تلک ایفا نہ ہوئے
یا ان بے بس لاچاروں کا جو اور بھی دکھ کا نشانہ ہوئے

اس شاہی کا جو دست بدست آئی ہے تمہارے حصے میں
کیوں ننگ وطن کی بات کرو، کیا رکھا ہے اس قصے میں

آنکھوں میں چھپائے اشکوں کو، ہونٹوں میں وفا کے بول لیے
اس جشن میں میں بھی شامل ہوں نوحوں سے بھرا کشکول لیے

اس نظم کے حوالے سے ڈاکٹر سید حسن عباس کہتے ہیں:

> "اب کس جشن کا مناتے ہو" ایک ایسا گل پیش کرتی ہے جس کے ٹکڑے پوری نظم میں بکھیر دیے ہیں، وطن پرستی، دوستی، ایثار، قربانی، غم خواری، ہمدردی ودم سازی ۔۔۔ بلکہ پوری انسانیت کا مجموعہ اس نظم میں شاعر کے آنسوؤں سے ڈھلتا جاتا ہے"11

احمد فراز اس مجموعے میں جنرل ایوب خان کے خلاف بھی مزاحمت کرتے نظر آتے ہیں فراز جنرل ایوب خان کے مارشل لاء کے خلاف اس لیے ہوگئے کہ وہ بہت جلد سمجھ گئے کہ یہ بھی پاکستانی عوام پر جبرِ مسلسل کی اگلی کڑی ہے۔ انھوں نے جنرل ایوب خان کی حکومت کو عوام کے حق میں زہرِ قاتل قرار دیا۔ ان کے شعری مجموعے "نایافت" میں جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت کے خلاف کثرت سے مزاحمتی عناصر ملتے ہیں۔ جنرل یحیٰ خان کی مارشل لائی حکومت انھوں نے بڑی تبدیلی کی صورت میں قبول کیا لیکن بہت جلد ان پر واضح ہوگیا کہ یہاں بھی صرف ڈکٹیٹر کا چہرہ بدل گیا، حالات نہیں بدلے۔ انھوں نے جنرل یحیٰ خان کی مخالفت دیگر چند وجوہات کے علاوہ اس لئے شدت سے کی کہ اُن کی وجہ سے پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ فراز اس سانحے پر آخر دم تک خون کے آنسو روتے رہے اور غداران وطن کو یاد کرکے کوستے رہے " جاناں جاناں " میں یحیٰ خان کے دورِ حکومت کے خلاف مزاحمتی عناصر کثرت سے موجود ہیں۔

(7) بے آواز گلی کوچوں میں ۱۹۸۲

"بے آواز گلی کوچوں میں "احمد فراز کا ساتواں مجموعہ کلام ہے اس مجموعے میں فراز کے قید تنہائی کی چند عبارتیں موجود ہیں، اور پاکستان کی سیاسی بد حالی کو انھوں نے "ایک بد نما صبح" کے نام سے کچھ نظمیں پیش کی ہیں۔ یہ مجموعہ کلام اپنے دور کی بھرپور عکاسی کرتا ہے، پاکستان میں مارشل لاء کے زمانے میں پاکستان کی صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا گیا اس مجموعہ کلام کو فراز نے ڈاکٹر عطیہ کے نام سے منسوب کیا ہے اس مجموعہ کے انتساب میں یہ شعر بھی لکھا ہوا ہے

شہر غزل کی گلیوں میں دیگر تیرے

تجھ سے تیری باتیں کرتے جاتے ہیں

اسی مجموعہ میں فراز کی مشہور نظم محاصرہ بھی ہے اس سے پہلے کہ اس مجموعے کی شاعری کا جائزہ لیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعے کی شاعری کے پس منظر کی ہلکی سی جھلک پیش کر دی جائے 14 اپریل 1979 کو پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذو الفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی، فراز نے اس دن کے بارے میں اپنے اسی مجموعے "بے آواز گلی کوچوں میں "چند نظمیں بالخصوص اس موضوع پر لکھیں ہیں اس حوالے سے پروفیسر فتح محمد ملک کہتے ہیں

> فراز کا مجموعہ کلام "بے آواز گلی کوچوں میں "اسی انتہائی المناک قومی سانحے سے پھوٹنے والی منظومات کا مجموعہ ہے۔ ہر چند بعد کے تمام مجموعہ ہائے کلام میں بھی بھٹو شہید کی یاد اور اس کے قاتل کی مذمت احمد فراز کی شاعری کے اہم ترین موضوعات ہیں تاہم "بے آواز گلی کوچوں میں " مرکزی موضوع بھٹو کی شہادت اور ہماری قومی زندگی اور اس کے بھیانک اثرات ہیں۔ اس کتاب میں "ایک بد نما صبح کے بارے میں۔۔۔کچھ نظمیں" کے عنوان سے وہ منظومات یکجا کر دی گئی ہیں جو اس عظیم قومی المیہ کے فوری رد عمل میں تخلیق ہوئی تھیں"12

نظم محاصرہ

فراز کی معرکتہ الآراء نظم "محاصرہ "کی سبب تخلیق کچھ یوں ہے کہ 6 / 7 اپریل 1979 میں جب ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد جنرل ضیاء الحق نے لاہور میں ادیبوں کی ایک کانفرنس "قومی رائٹرز کانفرنس" کے نام سے بلائی جس میں بہت سے شاعر و ادیب شامل تھے، فراز بھی مدعو تھے لیکن فراز نے جانے سے انکار کر دیا، وجہ یہ تھی کہ ان کو ضیاء کی پالیسیوں سے اختلاف تھا، مزید بھٹو کی پھانسی کے بعد نفرت کرنے لگے تھے۔نہ تو وہ اس محفل میں شریک ہوئے، ساتھ ہی دوسرے ادیبوں کو بھی کانفرنس میں جانے سے منع کرتے رہے، فراز کی اس جسارت پر جنرل ضیاء کی طرف سے ایک پیغام بر گیڈیر نے پہنچایا، وہ پیغام کیا تھا اس کی وضاحت خود فراز نے حقیقت اور شاعرانہ تخیل کے ملے جلے انداز میں کی ہے۔ڈاکٹر محمد شاہ مری نظم "محاصرہ" کا پس منظر کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں

> **"ضیاء نے جب دانشوروں کے ریوڑ اپنی خدمت میں جمع کئے تو احمد فراز نے بھیڑ بننے سے انکار کیا۔ اس نے ضیاء اور اس کی محفل پر لعنت بھیجی اور یوں عصر کا ترانہ بن گئے۔ یہ "محاصرہ" تھا بھئی۔ بہت زمانہ بعد جب اس خطے کی بہت اچھی چیزوں کا ذکر کیا جائیگا تو ان میں محاصرہ کا نام ضرور ہو گا"13**

یہ نظم کئی بندوں پر مشتمل ہے تاہم اس نظم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کی طرف سے جو پیغام آیا ہے پہلے حصے میں اس کی وضاحت ہے دوسرا وہ جو شاعر کی طرف سے جواب ہے ۔پہلا حصہ ملاحظہ ہو

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے

کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اس کے

فصیل شہر کے ہر برج ہر منارے پر

کماں بہ دست ستادہ ہیں عسکری اس کے

قلندران وفا کی اساس تو دیکھو

تمہارے ساتھ ہے کون آس پاس تو دیکھو

سو شرط یہ ہے جو جاں کی امان چاہتے ہو

تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھ دو

وگرنہ اب کے نشانہ کمان داروں کا

بس ایک تم ہو سو غیرت کو راہ میں رکھ دو

در اصل پہلے حصے میں ذکر کردہ ترکیبیں تمام صوفی، وسالک، سبھی شیوخ و امام، معززین عدالت، گدا گران، سخن کے ہجوم، آسمان ہنر کے ہجوم، یہ تمام وہ معزز ہستیاں ہیں جو جنرل ضیاء الحق کے ہاتھ پر بیعت کر چکی تھیں اور ایوان اقتدار میں سر بسجود تھیں، ان پر فراز کا نہ صرف گہرا طنز ہے بلکہ اپنے حوصلہ کا غائت درجہ ثبوت بھی، چونکہ جنرل ضیاء الحق فراز سے جواب مانگ رہے تھے، ایسے میں فراز کا جواب اس سیاہ دور کا روشن ترین ستارہ ہے اور اس جواب نے ان کو ضیاء آمریت کے دور کا سب سے بڑا ہیرو بنا دیا۔ فراز کا جواب ملاحظہ ہو

یہ شرط نامہ جو دیکھا تو ایلچی سے کہا

اسے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے

کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے

تو صبح اک نیا سورج تراش لاتی ہے

سو یہ جواب ہے میرا مرے عدو کے لیے

کہ مجھ کو حرص کرم ہے نہ خوف خمیازہ

اسے ہے سطوت شمشیر پر گھمنڈ بہت

اسے شکوہ قلم کا نہیں ہے اندازہ

مرا قلم نہیں کردار اس محافظ کا

جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے

مرا قلم نہیں کاسہ کسی سبک سر کا

جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے

مرا قلم نہیں اوزار اس نقب زن کا

جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے

مرا قلم نہیں اس دزد نیم شب کا رفیق

جو بے چراغ گھروں پر کمند اچھالتا ہے

مرا قلم نہیں تسبیح اس مبلغ کی

جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے

مرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کی

جو اپنے چہرے پہ دہرا نقاب رکھتا ہے

مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی

مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے

اسی لیے تو جو لکھا تپاک جاں سے لکھا

جبھی تو لوچ کماں کا زبان تیر کی ہے

میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقیں ہے مجھے

کہ یہ حصار ستم کوئی تو گرائے گا

تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم

مرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا

احمد فراز نے اپنے غنیم پر شکوہِ قلم کے راز وا کئے ہیں، قلم کی اہمیت کو بتلایا ہے، اور وہ ہمیشہ "مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے" کے وعدے پر قائم رہے۔

احمد فراز کی یہ نظم محاصرہ ایک ایسی نظم ہے کہ اس پورے عہد میں مزاحمتی شاعری کے حوالے سے کوئی اوراس قدر جاندار نظم شاید منظر عام پر آئی ہو۔ اس نظم سے فراز کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا، بقول ڈاکٹر محمد اشرف کمال:

احمد فراز کی نظم "محاصرہ" جبر و آمریت کے خلاف وہ نظمیہ شاہکار ہے جس نے احمد فراز کا شعری قد کئی گنا بڑھا دیا ہے، یہ ایک مؤثر اور توانا شعری و فکری شہ پارہ ہے"14

اس نظم کا لہجہ نہایت پر اثر اور بیان دل نشین ہے۔ حقیقت اور تخیل کے امتزاج نے ایک الگ لطف سے ہم کنار کیا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق حسین لکھتے ہیں

" محاصرہ والی نظم کے پس منظر سے کون واقف نہیں لیکن پھر بھی ایک بار میں نے ان سے یوں ہی پوچھا کہ کیا واقعی کسی غنیم وقت نے ان کو اس قسم کی سچ مچ کی دھمکی دی تھی یا یہ صرف زورِ تخیل والا معاملہ ہے تو انھوں نے بہت مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ ویسے تو شاعری ہے ہی تخیل کی کارستانی لیکن اس نظم کے سلسلے میں یہ صرف تخیل والی بات نہیں ہے، واقعی مجھے اس قسم کا ایک بریگیڈیر کے ذریعہ بھجوایا گیا تھا اور پھر اس کے بعد اسی نظم کا آدھا مصرعہ پڑھا کہ تمام صوفی و سالک۔۔۔۔۔اور پھر ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی دوڑ گئی"15

اس نظم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر اشفاق حسین مزید لکھتے ہیں

"ٹورنٹو کے مشاعرے میں پہلی بار جب احمد فراز اپنا یہ کلام سنا رہے تھے تو ہر طرف ایک سکوت کا عالم تھا لیکن یہ سکوت سخن شناس نہیں بلکہ سکوت حیرانگی اور احترام سخن شناسی کی منزل تھی مگر جب وہ اس منزل کے آخری موڑ پر پہونچے اور اپنی نظم "محاصرہ"سنانے لگے تو ہر کوئی ان کے احترام میں نہ صرف یہ کہ کھڑا ہو گیا تھا بلکہ ان کے قدموں میں اپنے دل بچھائے ہوئے تھا یہ شاعری نہیں، ساحری تھی اور تمام سامعین مسجود ہو چکے تھے، میں نے بھی آج ہی پہلی بار ان کے منہ یہ نظم سنی تھی اور خود میں بھی ایک عجیب محویت کے عالم میں کھو گیا تھا، بعد کے دنوں میں بھی صرف مشاعروں ہی میں نہیں بلکہ نجی محفلوں میں اس نظم کو خود انہی سے کئی بار سنا لیکن اس بار کا عالم تو کچھ اور ہی تھا عجیب اتفاق ہے کہ احمد فراز نے اپنی زندگی کے

آخری مشاعرے واشنگٹن میں جو آخری نظم پڑھی وہ بھی نظم " محاصرہ"ہی تھی"16

احمد فراز نے پہلی بار " محاصرہ " کراچی کے ایک مشاعرے میں پڑھی، اس مشاعرے میں فراز کے ساتھ حبیب جالب بھی مدعو تھے، چونکہ دونوں وقت کے حکمرانوں کے خلاف تھے اس لئے مشاعرے کے اختتام پر دونوں کو حکومتِ وقت نے سندھ بدری کا حکم دیدیا، سندھ بدری کے تین ماہ بعد دوبارہ کراچی گئے اور دو تین دن قیام کرکے، خود ساختہ جلاوطنی کے لئے لندن روانہ ہو گئے۔

محاصرہ کے حوالے سے مسعود مفتی کہتے ہیں

> **" محاصرہ " گلشن کے بندوبست برنگِ دگر کے خلاف احتجاج ہے، جس میں جبر اور لالچ کی مدد سے اہل حرف کو گداگرانِ سخن بنانے کے سامان تھے "17**

اس نظم نے فراز کو اس عہدِ تاریک کا روشن ترین ستارہ اور ضیاء آمریت کے دور کا سب سے بڑا ہیرو بنا دیا کیوں کہ اس نظم میں ان کا لہجہ پر شکوہ اور سبق آموز ہے یہ نظم لکھ کر انھوں نے اپنے مخالفوں کو منہ توڑ جواب دیا فراز کی دلیری اور حوصلہ مندی کے حوالہ سے ڈاکٹر محمد سلیم کہتے ہیں

> **" فراز کی نظم محاصرہ انسانی وقار کی بے حرمتی اور جمہوری عمل کی تباہی کے خلاف شدید احتجاج ہے ۔ شاعر آزادی کا علم بلند کرتے ہوئے اپنے عزم وہمت کا اظہار کرتا ہے اور اپنی جدوجہد کو جاری رکھنے کا یقین دلاتا ہے "18**

اسی نظم کے بارے میں اشفاق احمد لکھتے ہیں

> **" اس نظم کو پڑھتے ہوئے وہ (فراز) اپنے آپ میں اس قدر ڈوب جاتے کہ انھیں آس پاس کا ہوش ہی نہیں رہتا ہے، بلکہ اس نظم کے دوران واہ واہ اور سبحان اللہ کے تعریفی کلمات بھی**

سنا پسند نہیں کرتے تھے ۔ چاہے کتنی ہی فرمائشیں کیوں نہ
ہوں اپنی اس نظم کے اختتام کے بعد وہ کچھ اور کلام سنانا پسند
نہیں کرتے تھے۔ تاوقتیکہ دوسرا دور شروع ہو جائے"19

فراز اپنی ذات کے نہاں خانوں کے اندرونی جذبات کا اظہار تو مختلف حوالوں سے اپنی شاعری میں کرتے ہی ہیں ، مگر اس کے ساتھ ساتھ ہر عہد کی اجتماعی صورتِ حال اور خلق خدا کی اذیت و کرب کی نمائندگی بھی بھرپور طریقے سے کرتے ہیں جنرل ضیاء الحق کے دور میں بھی پاکستان کی مجموعی صورت حال کا نقشہ اسی مجموعے میں موجود نظم "ناموجود" میں کچھ اس طرح کھینچتے ہیں۔

اے خدا تیری مخلوق
جبر کے اندھیروں میں
دفن ہو چکی کب کی
تیرے آسمانوں سے
نامزد فرشتوں کی
اب سفارتیں کیسی

فراز نے ضیائی دور کو صبح کاذب سے موسوم کیا، ان کے خیال میں صبح کاذب کی طوالت نے معصوم لوگوں کو ضیاء کے بجائے طویل اندھیروں میں جھوک دیا۔

فضا بے ابر شاخیں بے ثمر ہیں
پرندوں سے شجر محروم تر ہیں

یہ صبح کاذب تورات سے بھی طویل تر ہے
کہ جیسے صدیاں گزر گئیں آفتاب دیکھے

فیض احمد فیض اور حبیب جالب کے بعد احمد فراز ایسے شاعر ہیں جنھوں نے ہر عہد میں آواز حق بلند کی اور لفظوں کو آمریت کے سفاکانہ دور میں بھی مرنے نہیں دیا۔ وہ تمام عمر آمروں سے اپنے قلم کے زور

پر بر سرِ پیکار رہے، ان کی شاعری میں جنرلیوں اور فوج کی مخالفت جا بجا پائی جاتی ہے، خاص کر ضیاء آمریت اور ان کی فوج کو نشانہ بنایا گیا ہے اس مجموعے میں موجود نظم "شہر آشوب" ضیاء آمریت کی جیتی جاگتی مثال ہے ۔ اس نظم میں ان کا نشانہ فوج اور آمریت ہے، جہاں بے گناہ عوام کو لاوارث لاشیں سمجھ کر تیر قضا کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ فتح محمد ملک کہتے ہیں۔

" اس دور میں اس انداز کی انقلابی حقیقت نگاری فقط احمد فراز کے یہاں ملتی ہے، ظاہر ہے کہ ضیاء آمریت اور اس کے ہواخواہوں کے نزدیک یہ طرزِ فکر و اظہار انتہائی باغیانہ قرار پایا 20"

اپنی بود و باش نہ پُوچھو
ہم سب بے توقیر ہوئے
کون گریباں چاک نہیں ہے
ہم ہوئے تم ہوئے میر ہوئے

سہمی سہمی دیواروں میں
سایوں جیسے رہتے ہیں
اس گھر میں آسیب بسا ہے
عامل کامل کہتے ہیں

دیکھنے والوں نے دیکھا ہے
اک شب جب "شب خون" پڑا
گلیوں میں بارود کی بُو تھی

کلیوں پر سب خون پڑا

اب کے غیر نہیں تھا کوئی
گھر والے دشمن نکلے
جن کو برسوں دودھ پلایا
ان ناگوں کے پھن نکلے

رکھوالوں کی نیت بدلی
گھر کے مالک بن بیٹھے
جو غاصب تھے محسن کُش تھے
صوفی سالک بن بیٹھے
جو آواز جہاں سے اُٹھی
اس پر تیر تبر برسے
ایسے ہونٹ سلے لوگوں کے
سرگوشی کو بھی ترسے
گلی گلی میں بندی خانے
چوک چوک میں مقتل ہیں
جلادوں سے بھی بڑھ چڑھ کر
منصف وحشی پاگل ہیں
کتنے بے گنہوں کے گلے پر
روز کمندیں پڑتی ہیں
بُوڑھے بچے گھروں سے غائب

بیبیاں جیل میں سڑتی ہیں
اس کی ناخن کھینچ لئے ہیں
اس کے بدن کو داغ دیا
گھر گھر قبریں در در لاشیں
بجھا ہر ایک چراغ دیا
ماؤں کے ہونٹوں پر ہیں نوحے
اور بہنیں کُرلاتی ہیں
رات کی تاریکی میں ہوائیں
کیسے سندیسے لاتی ہیں
قاتل اور درباری اس کے
اپنی ہٹ پر قائم ہیں
ہم سب چور لُٹیرے ڈاکو
ہم سب کے سب مجرم ہیں
ہمیں میں کوئی صبح سویرے
کھیت میں مُردہ پایا گیا
ہمیں سا دہشت گرد تھا کوئی
چُھپ کے جسے دفنایا گیا
سارا شہر ہے مُردہ خانہ
کون اس بھید کو جانے گا
ہم سارے لاوارث لاشیں
کون ہمیں پہچانے گا

بے آواز گلی کوچوں میں موجود " نظم "ہواؤں کی بشارت " جنرل ضیاء الحق کے دور کی فوجی آمریت کی بین دلیل ہے۔ نظم ملاحظہ ہو

تمام ماؤں کے ہونٹ پتھر ہیں

اور آنکھوں میں زخم ہیں

رات کہتی ہے

ان کے بیٹوں کو

شب گئے

چند لشکری

ساتھ لے گئے تھے

تو اب تلک ان کی واپسی کی خبر نہیں ہے

نہ واپسی کا گمان رکھنا

ہوائیں سہمے ہوئے چراغوں سے کہہ گئ تھیں

کہ آنے والی رتوں کے آغاز تک

تمہارے نصیب میں روشنی کا کوئی سفر نہیں ہے

یہ مائیں پتھر بنی رہیں گی

اور ان کے آنسو جمے رہیں گے

اور ان کی آہیں تھمی رہیں گی

نہ جی سکیں گی

نہ مر سکیں گی

یہ اس دور کی تلخ حقیقت ہے، جنرل ضیاء نے اسلامائزیشن کے نام پر نہ صرف اسلام کی روح سے رو گردانی کی بلکہ پورے ملک پاکستان کو آگ میں جھونک دیا۔اسی مجموعے کی ایک اور نظم "حرف کی شہادت "جو دراصل بھٹو کا مرثیہ ہے، فراز اس نظم میں کہتے ہیں کہ صلیب گر کو صلیب مبارک ہو، اس حوالے سے شہباز نقوی کہتے ہیں

> **" بھٹو صاحب کی پھانسی ملکی تاریخ کا ایسا افسوس ناک باب ہے جس نے ملک بھر میں جمہوریت اور عوامی حقوق کی جدوجہد کے کارکنوں کو تڑپا کر رکھ دیا موقع پر فراز نے اس بدنما صبح کے بارے میں اپنی نظم " جلاد " لکھی اور بھٹو کی پھانسی پر ایک اور نظم "حرف کی شہادت "21**

نظم " حرف کی شہادت " میں کہتے ہیں

آؤ جس عیسیٰ کو ہم نے سولی پر لٹکایا ہے

اس کے لہولہان بدن پر بین کریں

اور اشک بہائیں

فرض پہ پورا اتر چکے

اب قرض چکائیں

اس کی کھڑاوؤں وہ لے جائے

جس نے صلیب اٹھائی تھی

چادر کا حقدار وہی ہے

جس نے کیل لگائی تھی

اور کانٹوں کا تاج ہے اس کا

جس کی آنکھ بھر آئی تھی

آواب ہم سب عیسیٰ ہیں

لوگوں کو بتلائیں

مردوں کو اب چھو کر دیکھیں

اور کچھ اعجاز دکھائیں

لیکن اس کا حرف تھا سب کچھ،

حرف کہاں سے لائیں؟؟؟

نظم جلاد بھی بھٹو کی شہادت کے حوالے سے لکھی گئی، اس نظم میں احمد فراز، بھٹو کی بے گناہی، ثابت قدمی اور الوالعزمی اور منفرد شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنرل ضیاء الحق جو بھٹو کے حق میں جلاد ثابت ہوئے اس نظم کا آخری مصرعہ تضمین کے طور پر میر کا آیا ہے جس میں قاتل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،

جلاد

تو نے کب یہ سوچا ہے معصوم ہے کون اور قاتل کون

تو نے کب یہ دیکھا ہے کوئی چہرہ کیسا لگتا ہے

ایسے بھی ہوتے ہوں گے جن سے سُولی بھی شرماتی ہو

ایسے بھی جن سے دار کا تختہ سجا سجا سا لگتا ہے

جھوٹ کا عمّامہ ہے کوئی یا پرچم ہے سچائی کا

تو کیا جانے کس کے منارۂ سر پہ کمند افگندہ ہے

وہ منصور کا حرفِ اناہو یا عیسیٰ کی شمعِ دُعا

تجھ کو کیا نخچیر ترا کوئی مولا ہے کوئی بندہ ہے

درباروں سے ہو کر جب انصاف کا قاصد آتا ہے

سب کو خبر ہے بے گُنہی کا اکثر جو انجام ہوا

میزانیں کِن ہاتھوں میں تھیں، جُنبشِ ابرو کس کی تھی

کس پر اہلِ عدالت گرجے، کس پر لطفِ اکرام ہوا

محفل محفل مقتل مقتل سب بِسمل جلّاد ہے کون

کوئی سمجھ کر بھی نہیں سمجھے، کوئی اشارہ جانے ہے

نام ہے کس کا، دام ہے کس کا اور یہاں صیّاد ہے کون

"جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے"

پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت کے حوالے سے فراز نے کافی نظمیں کہیں ہیں، جو ان کے اسی شعری مجموعے "بے آواز گلی کوچوں میں" موجود ہے، ان نظموں کے حوالے سے پروفیسر فتح محمد کہتے ہیں:

"جس روز صبح دم بھٹو شہید کی پھانسی کی خبر عام ہوئی اس روز پاکستان عوام کے دل و دماغ کی ایسی جیتی جاگتی تصویر کشی میں میں نے اس سانحہ عظیم پر لکھی گئی تحریروں میں کہیں نہیں دیکھی۔۔۔۔۔"جلاد"۔۔۔"چلو اس شہر کا ماتم کریں"، "حرف کی شہادت"، "دشمن کا قصیدہ"،، مت قتل کرو آوازوں کو"، یہ عنوانات ہی چیخ چیخ کر اس زمانے کی پاکستانی زندگی کے بد نما مناظر کے حقیقت افروز اور باغیانہ اسلوب و ادا کے شاہد ہیں۔ اس شاعری میں سفاک اور ظالم حکمرانوں کے شیطانی کرتوت بے مثال ہیں جراتِ اظہار کے ساتھ اجاگر کیے گئے ہیں"22

(8)نابینا شہر میں آئینہ (۱۹۸۴)

فراز کا یہ آٹھواں شعری مجموعہ ہے اس مجموعے کو فراز نے منصور جاوید کے نام منسوب کیا ہے اور منصور جاوید کے نام معنون کرتے ہوئے ایک شعر بھی لکھا ہے

فراز آج کی دنیا مرے وجود میں ہے

مرے سخن کو فقط میرا تذکرہ نہ سمجھ

اس مجموعہ میں 45 غزلیں ایک نعت اور 55 نظمیں شامل ہیں، شروع میں فراز کا یہ شعر بھی لکھا گیا ہے

یہی کہا تھا مری آنکھ دیکھ سکتی ہے

تو مجھ پہ ٹوٹ پڑا سارا شہر نابینا

فراز اپنے مجموعے "نابینا شہر میں ائینہ " کے آغاز میں ہی رسول ﷺ کی شان میں نعت پیش کرتے ہیں اور روایتی حمد و ثنا اور رسمی توصیف کے بجائے رسول اکرم ﷺ کے انقلابی کردار سے کسبِ نور کرتے ہیں

مرے رسول کہ نسبت تجھے اجالوں سے

میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے

نہ میری نعت کی محتاج ذات ہے تیری

نہ تیری مدح ہے ممکن مرے خیالوں سے

تُو روشنی کا پیمبر ہے اور مری تاریخ

بھری پڑی ہے شبِ ظلم کی مثالوں سے

ترا پیام محبت تھا اور میرے یہاں

دل و دماغ ہیں پُر نفرتوں کے جالوں سے

یہ افتخار ہے تیرا کہ میرے عرش مقام

تو ہمکلام رہا ہے زمین والوں سے

مگر یہ مفتی و واعظ یہ محتسب یہ فقیہہ

جو معتبر ہیں فقط مصلحت کی چالوں سے

خدا کے نام کو بیچیں مگر خدا نہ کرے

اثر پذیر ہوں خلقِ خدا کے نالوں سے

نہ میری آنکھ میں کاجل نہ مُشک بُو ہے لباس

کہ میرے دل کا ہے رشتہ خراب حالوں سے

ہے تُرش رو مری باتوں سے صاحبِ منبر

خطیبِ شہر ہے برہم مرے سوالوں سے

مرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا

میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے

میں بے بساط سا شاعر ہوں پر کرم تیرا

کہ باشرف ہوں قبا و کلاہ والوں سے

اس نعت کے حوالے سے اشفاق حسین کی طرف سے پوچھے گئے سوال کے جواب میں فراز نے اپنی اس نعت کی وضاحت کرتے ہوئے کہاں تھا۔

> "میں نے ان (رسول اللہ ﷺ) کی شخصیت کے پیغام کو اپنے عہد کے حالات میں شامل کر کے وہ چیز تخلیق کی جہاں ان کی عظمت کا اعتراف بھی ہے، وہیں اپنے عہد کے مظالم کا ذکر بھی 23"

اس مجموعے میں فراز انسان دوستی کے مفہوم کو سمجھانے کے لئے سر گرم عمل دکھائی دیرہے ہیں۔ وہ جنگ و جدل کے خطرناک اثرات سے بچنے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ انسان دوستی اور جنگ کی تباہ کاریوں کے حوالے سے ڈاکٹر سلامت اللہ کہتے ہیں۔

"موجودہ صورت حال میں ہمارے نزدیک انسان دوستی کا مفہوم
اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ انسانیت کو جنگ کی ہولنا
کیوں سے محفوظ رکھا جائے اور ان سے نجات حاصل کرنے کی
منظم جدوجہد کی جائے "24

فراز کا پیغام بھی یہی ہے۔ وہ بھی ظلم و جبر والی قوتوں کے چہروں سے نقاب الٹنے کی بھر پور کوشش کرتے ہیں تا کہ دنیا میں تعلیم مساوات دینے والوں کے دوہرے چہرے سے نقاب الٹ جائے۔ عالمی سطح پر فلسطین ہو کہ لبنان، افریقہ ہو کہ افگانستان یا عراق، جہاں کہیں انسانیت پر جبر و تشدد ہو فراز تڑپ اٹھتے تھے، شمیم اکرام الحق کہتی ہیں

"بغداد میں مسافرت کے دوران ایک دن ہم کربلائے معلیٰ کی
زیارت کے لئے گئے۔ ان دونوں عراق جنگ زوروں پر تھی
۔۔۔ جنگ میں شہید ہونے والوں کے جنازے ملک کے کونے
کونے سے اس طرح آرہے تھے گویا بارش ہو رہی ہو۔۔۔ فراز
غائب، ڈھونڈنے پر ایک ستون کے ساتھ دم بخود، غم کی تصویر
بنے، کھڑے نظر آئے، مجھے دیکھتے ہی بولے " بھئی ہم یہاں
رکیں گے، یہ کم بخت (صدام حسین) بے مقصد کی جنگ میں
اپنے لوگوں کو مروا رہا ہے "25

یہاں انسانیت پر دکھ کے ساتھ ان کا سیاسی شعور بھی بول رہا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی صدام جب بش کے زیر عتاب آتے ہیں تو فراز ان کے حق میں بھی آواز اٹھاتے ہیں، کیوں کہ ان کے خیال میں پہلے انھیں استعمال کیا گیا اور بعد میں سزاوار ٹھہرنا ان کے ساتھ زیادتی تھی، احسان اکبر کہتے ہیں

"بڑے بش کے زمانے میں صدام اول اول گھیرے میں آیا تھا
تب فراز کی قیادت میں ہم لکھنے والوں نے کمیٹی چوک پر دھرنا
دیا تھا "26

فراز جلاوطنی میں بھی غاصب قوتوں کے بارے میں دریافت کرتے رہے اس حوالے سے "نابینا شہر میں آئینہ" میں موجود ایک نظم "او دیس سے آنے والے بتا" میں کہتے ہیں

وہ شہر جو ہم سے چھوٹا ہے وہ شہر ہمارا کیسا ہے؟

سب دوست ہمیں پیارے ہیں مگر وہ جان سے پیارا کیسا ہے؟

شب بزم حریفاں سجتی ہے یا شام ڈھلے سو جاتے ہیں

یاروں کی بسر اوقات ہے کیا ہر انجمن آرا کیسا ہے؟

جب بھی میخانے بند ہی تھے اور وا درِ زنداں رہتا تھا

اب مفتیٔ دیں کیا کہتا ہے موسم کا اشارہ کیسا ہے؟

میخانے کا پندار گیا پیمانے کا معیار کہاں

کل تلخی سے بھی کھلتی تھی اب زہر گوارہ کیسا ہے؟

وہ پاس نہیں احساس تو ہے اک یاد تو ہے اک آس تو ہے

دریائے جدائی میں دیکھو تنکے کا سہارا کیسا ہے؟

ملکوں ملکوں گھومے ہیں جاگے ہیں بہت روئے ہیں بہت

اب تم کو بتائیں کیا یارو دنیا کا نظارہ کیسا ہے؟

یہ شام ستم کٹتی ہی نہیں یہ ظلمت شب گھٹتی ہی نہیں

میرے بد قسمت لوگوں کی قسمت کا ستارہ کیسا ہے؟

کیا کوئے نگاراں میں اب بھی عشاق کا میلہ لگتا ہے؟

اہل دل نے قاتل کے لئے مقتل کو سنوارا کیسا ہے؟

کیا اب بھی ہمارے گاؤں میں گھنگرو ہیں ہوا کے پاؤں میں

یا آگ لگی ہے چھاؤں میں اب وقت کا دھارا کیسا ہے؟

قاصد کے لبوں پر کیا اب بھی آتا ہے ہمارا نام کبھی

وہ بھی تو خبر رکھتا ہو گا یہ جھگڑا سارا کیسا ہے ؟

ہر ایک کشیدہ قامت پر کیا اب بھی کمندیں پڑتیں ہیں ؟

جب سے وہ مسیحا دار ہوا ہر درد کا مارا کیسا ہے ؟

کہتے ہیں کہ گھر اب زنداں ہیں سنتے ہیں کہ زنداں مقتل ہیں

یہ جبر خدا کے نام پہ ہے یہ ظلم خدارا کیسا ہے ؟

پندار سلامت ہے کہ نہیں بس یہ دیکھو یہ مت دیکھو

جاں کتنی ریزہ ریزہ ہے۔۔۔ دل پارا پارا کیسا ہے ؟

اے دیس سے آنے والے مگر تم نے تو نہ اتنا پوچھا بھی

وہ کوئی جسے بن باس ملا وہ درد کا مارا کیسا ہے ؟

ان اشعار کے حوالے سے صابر لودھی کہتے ہیں

> **" ان اشعار میں روحِ عصر بھی سمٹ آئی ہے " کشیدہ قامت " اور " کمند " کی اصطلاحوں اور " چاند تارے کی سبز زمین " نے جو معنویت پیدا کی ہے اور جو علامتی اظہار اشعار میں کیا گیا ہے ، وہ اختر شیرانی کے لہجے کی روایت میں نہ کیا جاتا تو درد کی کیفت ہر گز دو چند نہ ہوتی"27**

احمد فراز نے علامتی پیرائے میں جنرل ضیاء الحق کے دور میں اپنے قبیلے کے لوگوں کی خاموشی اور ان کے نابینا پن کو بڑی خوب صورتی سے علامتی پیرائے میں اجاگر کیا ہے۔ ان کے خیال میں ادیب اور اہل قلم بھی ان بے بصیرت لوگوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں، جن کی آنکھوں پر پٹیاں بندھ گئیں ہیں اور حقیقتِ حال ان کے نظر سے اوجھل ہے۔ ان کے خیال میں یہ سب کے سب عقل کے اندھے ہیں اس مجموعے میں موجود ایک نظم "سفید چھڑیاں" میں لکھتے ہیں۔

جنم کا اندھا

جو سوچ اور سچ کے راستوں پر

کبھی کبھی کوئی خواب دیکھے

تو خواب میں بھی

عذاب دیکھے

یہ شاہراہِ حیات جس پر

ہزارہا قافلے رواں ہیں

سبھی کی آنکھیں

ہر ایک کا دل

سبھی کے رستے

سبھی کی منزل

اس ہجومِ کشاں کشاں میں

تمام چہروں کی داستاں میں

نہ نام میرا

نہ ذات میری

مرا قبیلہ

سفید چھڑیاں

فراز ان تمام قوتوں کو خبر دار کرتے ہیں، کہ جتنا بھی حق کی بات کرنے والوں کو تختہ مرگ پر چڑھایا جائے، پھانسی پر لٹکایا جائے، سنگسار کیا جائے، ان کے ہاتھ کاٹ دیے جایے، طوق و سلاسل پہنائے جائیں، حق کو کسی صورت دبایا نہیں جا سکتا۔ وہ جانتے ہیں کہ شاعر و ادیب اور دانشوروں کی آواز میں طاقت ہے، اس لیے وہ ان سب غاصبوں کے خلاف اٹھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک باضمیر

لوگ ہمیشہ ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہیں ۔حق کی جنگ لڑنے والے کبھی نہیں مرتے اس شعری مجموعے میں موجود نظم "میں زندہ ہوں" میں کہتے ہیں

میں ابھی زندہ ہوں

تم نے سنگباری کی

مرے پیکر کو دیواروں کے قالب میں چنا

ناگوں سے ڈسوایا

صلیبوں پر چڑھایا

زہر پلوایا

جلایا

پھر بھی میں سچ کی طرح پائندہ ہوں

میں زندہ ہوں

میرا چہرہ، میری آنکھیں، میرے بازو

میرے لب

زندہ ہیں سب

میں شہابِ شب

ہزاروں بار ٹوٹا

اور بکھرا

پھر بھی میں رخشندہ ہوں

میری طاقت میرے بالوں میں

نہ میرے ناخنوں میں تھی نہاں

میں حصاروں میں چھپا تھا

اور نہ تیغوں کی پناہوں میں چلا

میری طاقت میری قوت

حرف تھا

سلسبیلِ حرف سے میں نے پیا

آبِ بقا

حرف جو سچائیوں کی ابتدا اور انتہا

وجدان کی شمعِ نوا

سب کا خدا

تم نے کالے سورجوں کو

اپنے ہاتھوں پر دھرا

مصنوعی مہتابوں کو

ماتھوں پر چُنا

کافور کی شمعوں سے طاقِ ذات کو

روشن کیا

تم نے چاہا تھا

کہ خال و خد تمہارے بھی

کہیں چمکیں

سنو اے کجکلاہو

اے خداوندو سنو

اب تم فقط ماضی ہو

میں آئندہ ہوں

میں نہ اپنے دوش سے نادم نہ اپنے حال سے شرمندہ ہوں

میں زندہ ہوں

تابندہ ہوں

رقصندہ ہوں پائندہ ہوں

فراز نے مذہب کا کاروبار کرنے والوں کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بجائے اپنے دل کی آواز کو جن الفاظ کے رنگ میں بیان کیا ہے، اس کا اندازہ ان کی مشہور نعت سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

مگر یہ مفتی واعظ یہ محتسب یہ فقیہ

جو معتبر ہیں فقط مصلحت کی چالوں سے

خدا کے نام کو بیچیں مگر خدا نہ کرے

اثر پذیر ہوں خلق خدا کے نالوں سے

نہ میری آنکھ میں کاجل نہ مشکبو ہے لباس

کہ میرے دل کا ہے رشتہ خراب حالوں سے

ہے ترش رو میری باتوں سے صاحب منبر

خطیب شہر ہے برہم مرے سوالوں سے

فراز کی اس نعت کے حوالے سے پروفیسر حمیدہ شاہین کہتی ہیں

> **"جب ان حروف کے آغاز کے ساتھ وہ "نابینا شہر میں آئینہ" لے کر آتا ہے، تو مکروہ چہرے اپنا عکس دیکھ کر غصے سے تلملاتے ہیں۔ احمد فراز نے اس غصے کو اپنی جان پر جھیلا"28**

فراز نے ہر موڑ پر ضرورت مندوں، غریبوں اور بے سہاروں کا ساتھ دیا۔ درد آشنا اور ایثار مشرب فراز نے، اپنا غم روتے روتے دوسرے ہم قفسوں، اور دوسرے ہم مقتلوں کے غم کو ہر وقت کاندھا دیا نابینا شہر میں آئینہ میں موجود ایک نظم "خون فروش" میں کہتے ہیں

اے خدا ہسپتالوں میں بھی
اب مرے خون کی کوئی قیمت نہیں ہے
کسی کو بھی میرے لہو کی ضرورت نہیں
میں اپنے بدن میں
(کئی خون کی بوتلیں بیچ کر بھی)
ابھی تک لہو کے کٹورے لیے
صبح دم
اس توقع پر گھر سے نکلتا ہوں
شاید۔۔۔۔
مگر شام کو بے ثمر لوٹتا ہوں
اُسی گھر میں
جس میں مرے خون کے لوتھڑے
جرعۂ شیر اور پارہ نان کی آرزو میں
مرا راستہ دیکھتے ہیں
میں ہر روز
ہر وارڈ کو
ملتجی جسم سے دیکھتا ہوں
مگر ڈاکٹر مجھ سے کہتے ہیں
مردود
اب تیرے خون ناب میں
زندگی کی حرارت نہیں ہے
خدایا

میں کیسے بتاؤں انھیں

خوں فروشی ضرورت ہے میری

تجارت نہیں ہے

فراز نے جب اسی کی دہائی میں خود ساختہ جلاوطنی اختیار کی تو ان کو عالمی سطح پر بھی حالات کو قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ جس طرح اقبال نے سفر یورپ کے دوران مغربی تہذیب کا بغور مشاہدہ کیا، اسی طرح فراز نے بھی مغربی اقوام کا بڑے غور و فکر سے تجزیہ کیا۔ اس دوران پہلی بار انھیں احساس ہوا کہ جس نااتفاقی، نفرت اور انسان دشمنی کے عناصر ملکی سطح پر در پیش ہیں، عالمی سطح پر بھی حالات اتنے ہی دگر گوں ہیں قمر رئیس کہتے ہیں

"وہ فلسطین ہو، لبنان ہو، افریقہ ہو، جہاں جہاں مجاہدین آزادی پر ظلم و استبداد ہوتا تھا، احمد فراز کے لب و لہجے میں احتجاج کی لے تیز ہو جاتی تھی"29

عالمی سطح پر بھی کچھ تنظیمیں کچھ ملوکیت اور انسان دشمن قوتیں انسانیت سے بر سرپیکار ہیں، نفرت کی دیواریں وہاں بھی کھڑی نظر آتی ہے۔ انسان الگ تھلک وہاں بھی ہے۔ جلاوطنی ہی کا نتیجہ ہے کہ فراز یہاں عالمی سطح پر ظلم و جبر، نااتفاقی اور مختلف مسائل اور ناہمواریوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، نظم " سرحدیں" میں کہتے ہیں۔

کس سے ڈرتے ہو کہ سب لوگ تمہاری ہی طرح

ایک سے ہیں، وہی آنکھیں وہی چہرے وہی دل

کس پہ شک کرتے ہو، جتنے بھی مسافر ہیں یہاں

ایک ہی سب کا قبیلہ، وہی پیکر وہی گِل

ہم تو وہ تھے کہ محبت تھا وطیرہ جن کا

پیار سے ملتا تو دشمن کے بھی ہو جاتے تھے

اس توقع پہ کہ شاید کوئی مہماں آجائے

گھر کے دروازے کھُلے چھوڑ کے سو جاتے تھے

ہم تو آئے تھے کہ دیکھیں گے تمہارے قریے
وہ در و بام کہ تاریخ کے صورت گر ہیں
وہ ارینے، وہ مساجد، وہ کلیسا، وہ محل
اور وہ لوگ جو ہر نقش سے افضل تر ہیں
رُوم کے بُت ہوں کہ پیرس کی ہو مونالیزا
کیٹس کی قبر ہو یا تربتِ فردوسی ہو
قرطبہ ہو کہ اجنتا کہ موہنجو داڑو
دیدۂ شوق نہ محرومِ نظر بوسی ہو
کس نے دنیا کو بھی دولت کی طرح بانٹا ہے
کس نے تقسیم کئے ہیں یہ اثاثے سارے
کس نے دیوار تفاوت کی اٹھائی لوگو
کیوں سمندر کے کنارے پہ ہیں پیاسے سارے
خیر تم شوق سے دیکھو مرا سب رختِ سفر
میں تو پاگل ہوں، مری بات پہ مت کان دھرو
یہ کتابیں ہیں، یہ تحفے ہیں، یہ کپڑے میرے
مہر کو ثبت کرو اور مجھے راہداری دو

فراز "بیروت" میں ہونے والے انسانیت سوز واقعات پر آنسو بہاتے ہیں۔ 1982 میں جب بیروت پر اسرائیلی حملے میں سینکڑوں فلسطینی مجاہدین شہید کر دیے گئے اس کی گونج ان کی کئی نظموں میں ملتی ہے، خلیق انجم کہتے ہیں

"احمد فراز کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ انسان دوست تھے اور انھوں نے کبھی ملک و قوم، مذہب اور علاقئیت کی بنیاد پر انسانوں کو تقسیم نہیں کیا"30

بیروت میں جس طرح انسانوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا گیا۔ انھیں قتل کیا گیا، جلایا گیا، ستایا گیا۔ معصوم بچوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا اور ماؤں کے ساتھ درندوں جیسا سلوک کیا گیا فراز نے بیروت کے حوالے سے ان تمام مناظر کی تصویریں پیش کی ہیں۔ ہر عہد کے فرعون، نمرود، ہلاکو، چنگیز، اور تیمور جیسے وحشیوں نے انسانیت پر مظالم کا جو سلسلہ جاری رکھا، فراز نے ان پر اپنے رنج کا بر ملا اظہار کیا، وہ ان شاعروں میں سے ہیں، جنھوں نے انسان پسندی اور رومان کو ایک دھاگے میں پرونے کی کوشش کی ہے۔ نظم بیروت۔1 میں کہتے ہیں

یہ سر بریدہ بدن ہے کس کا

یہ جامئہ خوں کفن ہے کس کا

یہ زخم خوردہ ردا ہے کس کی

یہ پارہ پارہ صدا ہے کس کی

یہ کون بے آسرا ہیں

جو تیغِ قاتلاں سے

کٹی ہوئی فصل کی طرح

جا بجا پڑے ہیں

یہ کس قبیلے کے سر بکف جانثار ہیں

جن کو کوئی پہچانتا نہیں ہے

کوئی بھی پہچاننا نہ چاہے

کہ ان کی پہچان امتحاں ہے

کہ ان کی پہچان میں زیاں ہے

نہ کوئی بچہ، نہ کوئی بابا، نہ کوئی ماں ہے

محل سراؤں میں خوش مقدر شیوخ چُپ

بادشاہ چُپ ہیں

حرم کے پاسبان

عالم پناہ چپ ہیں

منافقوں کے گروہ کے سربراہ چپ ہیں

تمام اہلِ ریا کہ جن کے لبوں پہ ہے

لا الہ چپ ہیں

نظم کے آخر میں فراز شدتِ جذبات میں تلخ لہجہ اختیار کرتے ہیں، اور ان تمام قوتوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، جو اس ظلم و جبر پر خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں، چاہے وہ مشرق وسطی کی حکومتیں ہوں، یا اسلامی ممالک کی تنظیمیں ہوں، اقوام متحدہ ہو یا عالم اسلام کے باسی اور اہل حرم، جو منافقوں کے لباس میں ایک طرف تو مذہب کے نام پر حکومتوں میں بیٹھ جاتے ہیں، لیکن اندر ہی اندر کفر و الحاد کی قوتوں کا ساتھ دیتے ہیں اور مسلمانوں پر ہونے والے ظلم پر خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں، اس حوالے سے فراز کہتے ہیں

" ادھر امریکن قصاب لوگوں کو ذبح کر رہے ہیں۔ بچوں پر بم برسا رہے ہیں ۔ عوام آگ میں جھلس رہے ہیں ۔ بھری آبادیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے، ان کی بندوقیں، توپیں آگ اُگل رہی ہیں۔ گلیاں بازار بارود کی بو اور لہو کی مہک سے بھرے پڑے ہیں۔ ایسے میں مسلمان بے رس اور چس اذان دے رہے

ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اذان دے لو، ساری مصیبت ٹل جائے گی۔ نماز پڑھ لو امن و سکون ہو جائے گا"31

فراز کی نظم "بیروت۔2" بھی ایسی ہی ایک نظم ہے جس میں مسلمانوں کا خون پینے والے انسانیت کے سوداگروں کے بارے میں حقائق کا اظہار ملتا ہے وہ کہتے ہیں

میرے بچوں کے جسموں پر

زخموں کے پیراہن ہیں

ممتاؤں کی خالی گودیاں

بن کتبوں کے مدفن ہیں

کچھ خیمے کچھ زندہ سائے

اب میدان میں باقی ہیں

چند علم کچھ گرا بھی تک

اس طوفان میں باقی ہیں

تیل کے چشموں کے سوداگر

ان داتا خوش بیٹھے ہیں

محل سرا کی حرم سرا میں

خواجہ سرا خوش بیٹھے ہیں

فراز نے جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت کا مجموعی طرز احساس اور اس دور میں معاشرتی خدوخال اپنی ایک نظم "لبِ گویا" میں واضح کر دیا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے فنی اور شاعرانہ حوالے سے کمال کا مظاہرہ کیا ہے اور اقبال کو ہم کلام کر کے عوام الناس کو سمجھایا گیا ہے کہ اقبال کا پیغام کیسے بھلایا گیا

دے اذن کہ میں تجھ کو بتاؤں کہ تیرے بعد

جو حال ہوا ہے ترے خوابوں کے چمن کا

تو برشِ شمشیر حریفاں سے تھا بسمل

ہم کو ہے گلہ دشنۂ اربابِ وطن کا

ناوک ہی رہا قسمت ہر دیدہ بینا

نیزہ ہی مقدر رہا ہے بے باک دہن کا

نظم "لبِ گویا" میں فراز نے اقبال کے حضور جو فریاد کی ہے اس کے حوالے سے پروفیسر فتح محمد ملک کہتے ہیں

> **" اقبال کے خوابوں کے چمن ، پاکستان میں خزاں نے کیونکر ڈیرے ڈال رکھے ہیں ؟ تصورِ پاکستان سے اہل اقتدار کا مجرمانہ انحراف کن انتہاؤں کو چھو رہا ہے ؟خودی اور خود مختاری کے تصورات کیسے حرفِ غلط کی طرح مٹ رہے ہیں؟ منبر و محراب سے اسلام کے نام پر اسلام سے روگردانی کے کیسے کیسے شرعی جواز ایجاد کیے جا رہے ہیں؟ معاشرے میں انسانی مساوات اور معاشی انصاف کے اسلامی تصورات کا تصورات کا تذکرہ کس کس عنوان سے جرم قرار پایا؟ احمد فراز تحریکِ پاکستان کے خواب و خیال اور آج کی پاکستانی زندگی کے درمیان روح فرسا تضادات کو بڑی درد مندی کے ساتھ اجاگر کرتے ہوئے علامہ اقبال کو صدا دیتے ہیں"32**

تھی فقر و توکل کی مغنی تری ہستی

یاں کذب و تصوف ہی کی تلقین ہوئی ہے

دربار سے وہ رشتہ رہا مفتیٔ دیں کا

منبر سے ہر ارشاد پہ آمین ہوئی ہے

ہیں اب بھی وہی بندہ مزدور کی اوقات

گو دولتِ ارباب امارت ہوئی وہ چند

ہے اوج پہ سرمایہ پرستی کا نصیبہ

دریوزہ گر نان شبینہ ہے ہنر مند

پیغام مساوات کہ دنیا کے لئے تھا

واعظ نے کیا کوزہ و تسبیح کا پابند

مسجد میں تو محتاج و غنی ایک ہے لیکن

منعم کی قبا میں ہے مرے جسم کا پیوند

نظم کے آخر میں فراز مستقبل کے حوالے سے امید کی بات کرتے ہوئے دعا کے طالب نظر آتے ہیں

دے بازوئے فرہاد کو وہ تابِ جسارت

جو طرہ دستارِ رقیباں کو جھکا دے

اب قافلۂ شوق نئی دھن سے رواں ہے

اب پیشِ نظر ہے، نئی منزل نئے جادے

اب کچکلی سر بگریباں نظر آئے

اب چاک ہوں ذروں سے ستاروں کے لبادے

ہر عہد کا نخچیر رہا ہے لب گویا

یہ عہد بھی منصور کو سولی پہ چڑھا دے

اس مجموعہ کلام پر مسعود مفتی نے اظہار خیال کیا ہے۔

(9)سب آوازیں میری ہیں ۱۹۸۵

احمد فراز کا یہ مجموعہ تراجم پر مشتمل ہے اس میں کل چھتیس نظمیں شامل ہیں فراز کے خیال میں ساری دنیا کی مظلوم خلقِ خدا ان کی اپنی ہے، یہ حقیقت افریقی حریت پسند شاعروں کی منتخب نظموں کے تراجم پر مشتمل فراز کا شعری مجموعہ "سب آوازیں میری ہیں" سے معلوم ہوتا ہے، اس مجموعہ کلام کے شروع میں ہی حرف سادہ" سے فراز نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں وہ کہتے ہیں

"سب آوازیں میری ہیں کے تراجم محض تخلیقی ہتھیاروں کو صیقل رکھنے کی غرض سے نہیں کیئے گئے بلکہ کچھ اور محرکات بھی تھے، ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں خود ہی ان حالات سے گزر رہاہوں جن سے بیشتر افریقی جلاوطن شاعر دوچار ہیں اور اپنی سرزمین سے دور اپنے لوگوں کی انقلابی جدوجہد میں قلمی حوالے سے شریک ہیں، دوسرا سبب یہ کہ پاکستان اور جنوبی افریقہ کے تاریخی اور سیاسی کوائف مختلف ہوتے ہوئے بھی کئی طرح کی مماثلت رکھتے ہیں، جنوبی افریقہ میں سفید فام اقلیت نے جس ظلم اور ڈھٹائی سے مقامی سیاہ فام اکثریت کو انسانی توقیر اور حقوق سے محروم کرر کھاہے، اسی طرح پاکستان میں فوجی آمریت نے بھی ظالمانہ اور غاصبانہ رویہ سے اپنے ہی لوگوں کو محکوم بنار کھاہے، فرق اتناہے کہ وہاں بندوق کی لبلبی پر گوری انگلیوں کی جانب حریت پرستوں کے خون سے ہولی کھیل رہی ہے اور پاکستان میں جمہوریت پسند

دانشوروں سیاسی کارکنوں صحافیوں اور طلبہ کا لہو زمین کا
رزق بن رہا ہے ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ افریقی شاعری
موضوعات کی حریت لیکر مماثلت کے سبب پاکستان کے
حالات کی بھی عکاس معلوم ہوتی ہیں"33

فراز نے اس مجموعے کو فیض احمد فیض کے نام منسوب کیا ہے۔

(10)پس انداز موسم(۱۹۸۹)

پس انداز موسم احمد فراز کا دسواں شعری مجموعہ ہے یہ مجموعہ 1989 میں منظر عام پر آیا، اس مجموعہ پر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں

" فراز کی شاعری غمِ دوراں اور غم جاناں کا ایک حسین سنگم ہے ۔ ان کی غزلیں اس تمام کرب والم کی غمازی کرتی ہیں جس سے ایک حساس اور رومانٹک شاعر کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان کی نظمیں غمِ دوراں کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں اور ان کی کہی ہوئی بات "جو سنتا ہے اسی کی داستان معلوم ہوتی ہے "34

اس مجموعے کو احمد ندیم قاسمی کے نام منسوب کیا ہے اس مجموعے میں 49 غزلیں اور 14 نظمیں شامل ہیں پس انداز موسم پر اکادمی ادبیات پاکستان کے تحت سب سے بڑا ایوارڈ "علامہ اقبال ایوارڈ" بھی ان کو ملا۔

فراز کے اس مجموعے میں اوجڑی کیمپ کے حوالے سے لکھی گئی مشہور نظم " شہر نامہ"، ترقی پسند نظرے کی غماز نظم "**مسند پیر مغاں" اور** "واشنگٹن کے مشاعرے میں پاکستانی شعراء کی آمد کے موقع پر لکھی گئی نظم "اے میرے وطن کے خوش نواؤ" موجود ہے۔ اس مجموعے میں احمد فراز کی شاعری کا گہرا رنگ دکھائی دیتا ہے، چنانچہ اس مجموعے میں فیض احمد فیض جیسی جارحیت اور اور حبیب جالب کی طرح طنزیہ لہجہ ملتا ہے۔ پس انداز موسم میں اوجڑی کیمپ کے المیے کے حوالے سے لکھی گئی نظم **"شہر نامہ "** احمد فراز کی بلند حوصلگی کا ثبوت ہے، چھوٹی بحر کی یہ نظم احمد فراز نے ہر خوف سے بے نیاز ہو کر لکھی ہے

یہ نظم بیس بند پر مشتمل ہے

ایک بند کے اشعار ملاحظہ ہوں

کوئی تاجرِ حسب و نسب

کوئی دیں فروش قدیم ہے

یہاں کفش بر بھی امام ہے

یہاں نعت خواں بھی کلیم ہے

مرے پاسباں مرے نقب زن

مرا ملک ملکِ یتیم ہے

مرا دیس میر سپاہ کا

مرا شہر مالِ غنیم ہے

فراز نے اس نظم میں قیامت خیز دن کی تصویر پیش کی ہے، اوجڑی کیمپ کے المیے کے حوالے سے لکھی گئی یہ نظم ان کی بلند حوصلگی کا ثبوت ہے، خاصی طویل نظم دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ستم کے ماروں کی تصاویر، خون کی ہولی، چیخ و پکار، بچھڑنے کا درد، کوچہ و بازار وغیرہ کے اجڑنے پر بین اور نوحے ملتے ہیں، دوسرے حصے میں اس سانحے کے ذمہ داروں پر تنقید کے نشتر برسائے گئے ہیں، پہلے اس نظم کا عنوان " دس اپریل کی صبحِ بہار " تھا بعد میں فراز نے اس کو " شہر نامہ " کا عنوان دیا، نظم کے دوسرے حصے میں فراز بڑے طنزیہ انداز میں ان تمام قوتوں کی مذمت کرتے ہیں جو اس عظیم سانحے کے ذمہ دار ہیں۔ ان کے مطابق منصف ہو کہ وکیل، دین کے ٹھیکے دار ہوں یا اہل حرف و سخن، سارے کے سارے ظلم و جبر پر خاموشی اور مصلحت سے کام لے کر کسی قسم کی مذمت سے بے نیاز دکھائی دے رہے ہیں۔ نظم کے آخر میں فراز امن کے نعرے لگانے والوں کا راز فاش کرتے ہیں، جو بظاہر امن پسندی کی ترغیب دیتے ہیں، لیکن اندر سے ظالموں و جابروں کے ساتھ ہیں، پھر فوج کی بربریت پر نشتر زنی کرتے ہیں، فراز کے خیال میں فوج نے پاسبانی کا راستہ ترک کر کے نقب زنی شروع کر دی ہے وطن کو مالِ یتیم اور شہر کو مال غنیم سمجھا جاتا ہے، فراز کو دکھ تو اس بات کا ہے کہ کوتوال اور شیخ حرم بھی ان غاصب طاقتوں کے ساتھ ملے ہیں، اگر کوئی غریب خوں بہا مانگے تو مار ڈالا جاتا ہے، اس نظم کے حوالے سے شگفتہ فراز لکھتی ہیں

" یہ نظم آمریت کے دور میں لکھی گئی تھی، لیکن اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی احمد فراز کی مخصوص ادائیگی کے ساتھ لہو لہو رلا گئی "35

اسی مجموعے میں موجود فراز کی نظم "**مسند پیر مغاں**" ان کے ترقی پسند نظریے کی غماز ہے، ان کے نزدیک ترقی پسندی صرف ترقی کرنے کا دوسرا نام، جہاں ملک ترقی کرے امن وخوش حالی ہو، مزدور کو اس کا حق ملے اور غاصبوں کی حکمرانی ختم ہو اور عوام کا راج ہو۔

اڑا کے باد فنا لے گئی ہے شہر

نہ بام و در رہے باقی نہ جسم و جاں میری

کسے کسے میں پکاروں کسے کسے روؤں

تڑپ رہے ہیں شناسا کہاں کہاں میرے

کسی کا کاسئہ سر ہے فضا میں سر گرداں

کوئی نگارِ دل آرا دو نیم ہو کے گرا

تڑپ گیا ہے کسی کا بدن صراحی سا

کسی کا شیشئہ جاں دستِ ناتواں سے گرا

دلوں میں برق گری سنگِ محتسب کی طرح

نہ کوئی رند نہ رطل گراں سلامت ہے

بساطِ میکدہ ویراں ہوئی تو غم کیسا

خوشا کہ مسند پیرِ مغاں سلامت ہے

ایک اور نظم "**اے میرے وطن کے خوش نواؤ**" میں حرق حق بیچنے والوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں

اک عمر کے بعد تم ملے ہو

اے میرے وطن کے خوش نواؤ

ہر ہجر کا دن تھا حشر کا دن

دوزخ تھے فراق کے الاؤ

روؤں کہ ہنسوں سمجھ نہ آئے

ہاتھوں میں ہیں پھول دل میں گھاؤ

تم آئے تو ساتھ ہی تمہارے

بچھڑے ہوئے یار یاد آئے

اک زخم پہ تم نے ہاتھ رکھا

اور مجھ کو ہزار یاد آئے

وہ سارے رفیق پا بجولاں

سب کشتۂ دار یاد آئے

ہم سب کا ہے ایک ہی قبیلہ

اک دشت کے سارے ہم سفر ہیں

کچھ وہ ہیں جو دوسروں کی خاطر

آشفتہ نصیب و دربدر ہیں

کچھ وہ ہیں جو خلعت و قبا سے

ایوان شہی میں معتبر ہیں

سقراط و مسیح کے فسانے

تم بھی تو بہت سنا رہے تھے

منصور و حسین سے عقیدت

تم بھی تو بہت جتا رہے تھے

کہتے تھے صداقتیں امر ہیں

اوروں کو یہی بتا رہے تھے

اور اب جو ہیں جا بجا صلیبیں

تم بانسریاں بجا رہے ہو

اور اب جو ہے کربلا کا نقشہ

تم مدح یزید گا رہے ہو

جب سچ تہ تیغ ہو رہا ہے

تم سچ سے نظر چرا رہے ہو

جی چاہتا ہے کہ تم سے پوچھوں

کیا راز اس اجتناب میں ہے

تم اتنے کٹھور تو نہیں تھے

یہ بے حسی کس حساب میں ہے

تم چپ ہو تو کس طرح سے چپ ہو

جب خلق خدا عذاب میں ہے

سوچو تو تمہیں ملا بھی کیا ہے

اک لقمۂ تر قلم کی قیمت

غیرت کو فروخت کرنے والو

اک کاسۂ زر قلم کی قیمت

پندار کے تاجرو بتاؤ

دربان کا در قلم کی قیمت

ناداں تو نہیں ہو تم کہ سمجھوں

غفلت سے یہ زہر گھولتے ہو

تھامے ہوئے مصلحت کی میزان

ہر شعر کا وزن تولتے ہو

ایسے میں سکوت، چشم پوشی

ایسا ہے کہ جھوٹ بولتے ہو

اک عمر سے عدل و صدق کی لاش

غاصب کی صلیب پر جڑی ہے

اس وقت بھی تم غزل سرا ہو
جب ظلم کی ہر گھڑی کڑی ہے
جنگل پہ لپک رہے ہیں شعلے
طاؤس کو رقص کی پڑی ہے
ہے سب کو عزیز کوئے جاناں
اس راہ میں سب جیے مرے ہیں
ہاں میری بیاض شعر میں بھی
بربادئ دل کے مرثیے ہیں
میں نے بھی کیا ہے ٹوٹ کر عشق
اور ایک نہیں کئی کیے ہیں
لیکن غم عاشقی نہیں ہے
ایسا جو سبک سری سکھائے
یہ غم تو وہ خوش مآل غم ہے
جو کوہ سے جوئے شیر لائے
تیشے کا ہنر قلم کو بخشے
جو قیس کو کوہ کن بنائے
اے حیلہ گران شہر شیریں
آیا ہوں پہاڑ کاٹ کر میں
ہے بے وطنی گواہ میری
ہر چند پھرا ہوں در بدر میں
بیچا نہ غرور نے نوازی
ایسا بھی نہ تھا سبک ہنر میں

تم بھی کبھی ہم نوا تھے میرے

پھر آج تمہیں یہ کیا ہوا ہے

مٹی کے وقار کو نہ بیچو

یہ عہد ستم جہاد کا ہے

دریوزہ گری کے مقبروں سے

زنداں کی فصیل خوشنما ہے

کب ایک ہی رت رہی ہمیشہ

یہ ظلم کی فصل بھی کٹے گی

جب حرف کہے گا قم بہ اذنی

مرتی ہوئی خاک جی اٹھے گی

لیلائے وطن کے پیرہن میں

بارود کی بو نہیں رہے گی

پھر باندھیں گے ابروؤں کے دوہے

پھر مدح رخ و دہن کہیں گے

ٹھہرائیں گے ان لبوں کو مطلع

جاناں کے لیے سخن کہیں گے

افسانۂ یار و قصۂ دل

پھر انجمن انجمن کہیں گے

فراز نے جلاوطنی کے دور آخر میں واشنگٹن کے ایک مشاعرے میں جس میں پاکستانی شعراء کی شرکت تھی، ان کے نام اپنی یہ نظم لکھی، اس نظم کا لہجہ نسبتاً خاصا کڑوا ہے، تاہم ایسی شاعری بیکار نہیں جاتی

پروفیسر فتح محمد ملک کہتے ہیں

"واشنگٹن کے مشاعرے میں پاکستانی شعراء کی آمد کے موقع پر لکھی گئی نظم "اے میرے وطن کے خوش نواؤ" میں پاکستانی شاعروں سے گلہ مند ہیں کہ وہ پاکستان کی سیاسی اور تہذیبی زندگی پر آمریت اور استبداد کے بھیانک اثرات سے مجرمانہ چشم پوشی کے ارتکاب پر نادم نہیں ہیں"36

11) بود لک ۱۹۹۴

ڈراما اردو ادب کی معروف صنف ہے اور ٹیلی ویژن اور ریڈیو ڈراما اس صنف کی زندہ تصویر ہے، اردو ڈرامانے لکھنو کے دربار میں آنکھ کھولی پارسیوں کے ہاتھوں میں پاؤں پاؤں چلنا سیکھا، پھر طالب بنارسی، احسن لکھنوی، بیتاب بنارسی اور آغا حشر کاشمیری جیسے ڈرامانگاروں نے اس کا ناک ونقشہ درست کیا۔ راستے میں اردو ڈرامے کو امتیاز علی تاج جیسا رہبر ملا جو اسے فن کی بلندی پر لے گیے دوسری طرف ریڈیو اور فلم کی آمد اور تھیٹر کی گھٹتی ہوئی مانگ عنفوان شباب میں اسٹیج ڈرامے کی جان کے درپے تھی، ایسے میں ریڈیو نے ڈرامے کو پناہ دی اور جب ریڈیو کی روایت کمزور ہونے لگی تو ٹیلی ویژن نے ڈرامے کی روایت کو امر کر دیا۔ احمد فراز نے چونکہ ایم اے کیا ایڈورڈ کالج (پشاور) میں تعلیم کے دوران ریڈیو پاکستان کے لیے فیچر لکھنے شروع کر دے تھے اسی دوران فراز نے ریڈیو پاکستان پشاور کے لئے منظوم ڈرامے بھی لکھے فراز کے منظوم ڈرامے جن کی طرف ناقدین نے ابھی تک زیادہ توجہ نہیں دی، وہ بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں اپنے منظوم ڈراموں میں بھرپور روحانی فضا پائی جاتی ہے فراز کے منظوم ڈراموں میں نغمگی، غنائیت کے ساتھ ساتھ افکار وخیالات بڑے واضح اور صاف نظر آتے ہیں فراز نے جس دردمندی کے ساتھ اپنے احساسات وجذبات کو اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے وہی دردمندی ان کے منظوم ڈراموں میں بھی جھلکتی ہے ان کے ڈراموں میں شدت وحرارت پائی جاتی ہے، انھوں نے اپنے ڈراموں میں ہیئت، اور نثری نظم کے فارم کو بڑی ہی فنکاری اور چابکدستی کے ساتھ برتا ہے

بود لک" فراز کے منظوم ڈراموں کا مجموعہ ہے فراز نے اس مجموعہ کو ڈاکٹر رفیق جان کے نام کیا ہے۔ یہ مجموعہ 1994 میں منظر عام پر آیا اس مجموعہ پر فارغ بخاری نے اظہار خیال کیا جبکہ اس مجموعے کا دیباچہ خود فراز نے لکھا ہے

مجموعہ کے شروع میں مندرجہ ذیل شعر بھی نقل کیا ہے

مرے تمام دوست اجنبی رفاقتوں میں گم

مری نظر میں ترے خدوخال تیرے خواب

اس ڈرامے کے اہم کردار

بودلک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وادی کا مضبوط بیٹا

قلش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بودلک کا فلسفی دوست

ژگولہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بودلک کی منتخب دلہن

پہلا بڑا

دوسرا بڑ یہ سب وادی کے اکابرین ہیں

تیسرا بڑا

یہ منظوم ڈرامہ بودلک کافرستان کے روایتی کرداروں اور اور افریقی مصنفین کا گویا ملغوبہ ہے، اس منظوم ڈرامے کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ فراز نے کسی افریقی مصنف کا کھیل The oda Oak T پڑھا تھا، اس کھیل کے پڑھنے کے بعد فراز کو لگا کہ اس کا اردو میں منظوم ترجمہ کر دیا جائے، اور انھوں نے اس کا ترجمہ کرنا شروع بھی کر دیا تھا تاہم وہ اختتام کو نہ پہنچ سکا، آدھا ادھورا ہی رہا بلکہ کچھ دنوں کے بعد اس آدھے ادھورے منظوم ترجمے کا مسودہ بھی فراز کے پاس سے گم ہو گیا تاہم جب احمد فراز کو ریڈیو پاکستان پشاور کا ڈائریکٹر بنایا گیا اس موقع پر فراز کو چند ساتھیوں کے ہم راہ چترال جانے کو کہا گیا تا کہ چترال میں موجود وادیٔ کافراستان میں بسنے والے لوگوں کی بود و باش، رہن سہن اور طرز زندگی کے بارے میں مواد اکٹھا کریں فراز نے اس وادی میں دس پندرہ دن گزارے وہاں سے واپسی کے بعد فراز نے اس سفر کی روداد رقم کرنی شروع کی تاہم وادیٔ کافرستان کی روداد کا مسودہ بھی کسی طرح فراز کے پاس سے گم ہو گیا جو آخر تک نہ مل سکا، مگر فراز کے ذہن میں کافرستان کی دوشیزاؤں کا رقص بیٹھ چکا تھا جس کا ذکر انھوں نے اپنی نظم "کشان بی بی" میں کیا ہے جو کہ ان کے مجموعے "نایافت" میں موجود ہے ،اس کے بعد ریڈیو پاکستان پشاور نے جشن تمثیل کے لئے منظوم کھیل کا تقاضا کیا تو فراز نے کافرستان کے رسم و رواج کے حوالے سے یہ منظوم ڈرامہ لکھنا شروع کیا اس حوالے سے فراز خود لکھتے ہیں

"پشاور پہنچتے ہی میری پہلی تخلیق "کشان بی بی " تھی جو میری کتاب "نایافت " میں شامل ہے۔۔۔ دوسری تخلیق "بودلک "کا منظوم ڈرامہ ہے جو کافرستان کے بعض روایتی کرداروں اور کچھ افریقی مصنف کے oda oak کا ملغوبہ ہے ۔ میں اسے نہ تو ترجمہ کہہ سکتا ہوں اور نہ ہی Adaptation"37

فراز نے اس ڈرامے کا آخری حصہ کافی جلد بازی میں لکھا وہ خود کہتے ہیں

"کھیل کے آخری حصے تو اس طرح لکھے گئے کہ ادھر ریڈیوں پاکستان کا نقل نویس کاغذ اور قلم لیے تیار بیٹھا ہوتا اور ادھر میں منظوم سطروں کی پرچیاں لکھ لکھ کر اس کے حوالے کرتا اور مسودے کی کاپیوں کے بنتے ہی ڈرامہ آرٹسٹ اس کی رہرسل کرنے لگتا"38

اس ڈرامے کے نشر ہونے کے بعد لوگوں میں کافی تنقید بھی ہوئی کچھ لوگوں نے تو اس ڈرامے پر فحش نگاری کا الزام بھی لگایا جبکہ کچھ نے اس کو تازہ ہوا کے جھونکے سے تعبیر کیا۔ بودلک کا پیش لفظ خود احمد فراز نے ہی " وہ کافر جو۔۔۔۔۔ " کے نام سے لکھا ہے ڈرامے کا اختتام لوگوں کے ہجوم کے ساتھ کچھ اس طرح ہوتا ہے۔

گائے جا

دختر امن۔۔۔ تو گائے جا

تیری ماں زندگی سونپ کر تجھ کو

خود مر گئی

اور ترا باپ ممنوع سچ کا نشانہ بنا

گائے جا۔۔۔ دختر امن۔۔۔۔ تو

گائے۔۔۔ گائے جا۔۔۔۔ اے جہالت کی ظلمت میں پہلی

کرن گائے جا۔۔۔ گائے جا۔۔۔۔ گائے جا

(ڈرامہ ختم ہوتا ہے اور لوگوں کا شور دخترِ امن کی آواز پر غالب آجاتا ہے)

(12)"خوابِ گل پریشاں ہے" ۱۹۹۴

خواب گل پریشاں ہے 1994 میں منظر عام پر آیا اس مجموعہ کو فراز نے حمید اخوند کے نام منسوب کیا ہے، ہے اس مجموعے میں 40 غزلیں اور 12 نظمیں اور احمد ندیم قاسمی کا ایک مضمون شامل ہے جبکہ مجروح سلطان پوری نے اس مجموعے میں فراز کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے

" فراز اپنے وطن کے مظلوموں کے ساتھی ہیں انہی کی طرح تڑپتے ہیں، مگر روتے نہیں بلکہ ان زنجیروں کو توڑتے، ٹکڑے بکھیرتے نظر آتے ہیں جو ان کے معاشرے کے جسم کو جکڑے ہوئے ہیں ان کا شعر نہ صرف یہ کہ اعلیٰ ادبی معیار کا ہے بلکہ ایک شعلہ ہے جو دل سے زبان تک لپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے، یہ آئے فیض اور ن۔ م راشد کے بعد مگر اساتذہ سخن میں شمار ہوتے ہیں ایک اچھا شاعر اپنے بعد آنے والوں کو راہ دکھاتا اور متاثر کرتا ہے۔ فراز کا شمار اب ان میں ہے "39

خواب گل پریشاں ہے کے دیباچے میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں

یہ جو بعض لوگ دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ فراز کے ہاں حسن کی نرمیوں کے ساتھ ساتھ تغیر و انقالب کی جو للکار ہے وہ اسے تضادات کا شکار بنا دیتی ہے، تو یہ حضرات اتنا بھی نہیں جانتے کہ حسن و عشق کی منازل سے گزرے بغیر انقلاب کی للکار اعتماد سے محروم رہتی ہے اور وہی شعراء صحیح انقلابی ہوتے ہیں جو انسانی ضمیر کی گہرائیوں کے اندازہ داں ہوتے ہیں، میں تو سمجھتا ہوں کہ فراز کا یہ کمال بھی لائق صد تحسین ہے کہ کڑی آزمائیشوں سے گزرنے کے باوجود اپنی انقلابی شاعری میں بھی سچا شاعر رہا، وہ نعرہ زنی نہیں کرتا، صورت حال کا تجزیہ کرتا ہے اور پڑھنے

سننے والوں کو اپنی سوچ کے مطابق سوچنے پر مجبور کردیتا ہے

40"

اس مجموعے کے شروع میں ان کا مشہور زمانہ شعر بھی لکھا ہوا ہے

دیکھو یہ میرے خواب تھے، دیکھو یہ میرے زخم ہیں

میں نے توسب حسابِ جاں بر سر عام رکھ دیا

اس مجموعے کا آغاز ہی ان کی مشہور غزل "سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں" سے ہوتا ہے، اس غزل کے بعد وہ آگے کہتے ہیں "ابھی کچھ اور کرشمے غزل کے دیکھتے ہیں" فراز اب ذرا لہجے بدل کے دیکھتے ہیں" اس مجموعے میں ڈھاکہ کے میوزیم کو دیکھ کر لکھی گئی نظم "بنگلا دیش" اور ان کی چند چیدہ نظموں میں سے ایک نظم "کالی دیوار" اور امریک کے وائٹ ہاؤس سے متعلق نظم "سفید حویلی" فراز کے اسی مجموعے میں ہے

اس مجموعے میں فراز نے استادانہ رنگِ شاعری اختیار کیا ہے، کلاسکی شعراء کی تقلید میں ان کی زمینوں میں غزلیں کہیں ہیں، یہاں واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ فراز محبت کے شاعر اور امن کے داعی ہیں

اسی مجموعے میں فراز کی نظم "بنگلہ دیش" ہے جس کے بارے میں ملک زادہ جاوید کہتے ہیں

"ان کی ایک نظم "بنگلہ دیش" ہے جو کہ ڈھاکہ کے میوزیم کو دیکھ کر احمد فراز نے لکھی، اس نظم میں تنقید اور ملال دونوں تاثرات ابھرتے ہیں جو کہ نظم کی وسعت میں اضافہ کرتے ہیں"41

یہ میوزیم تو ہے اس روز بد کا آئینہ

جو نفرتوں کی تہوں کا حساب رکھتا ہے

کہیں لگا ہوا انبارِ استخواں تو کہیں

لہو میں ڈوبا ہوا آفتاب رکھتا ہے

کہیں مرے سپہ سالار کی جھکی گردن

عدو کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا سماں

مرے خدا مری بینائی چھین لے مجھ سے

میں کیسے دیکھ رہا ہوں ہزیمتِ یاراں

میں سر جھکائے ہوئے درد کو چھپائے ہوئے

پلٹ کر آئی تو ہر رہگزر اندھیری تھی

میں سوچتا ہوں ابھی تو چراغ روشن تھے

کبھی یہ شہر مرا تھا زمین میری تھی

اس مجموعے میں موجود ایک نظم "کالی دیوار" ہے جس کا شمار ان کی چند اہم نظموں میں ہوتا ہے جو کہ امریکی یلغار کے خلاف لکھی گئی تھی اس نظم کے بارے میں انور خواجہ کہتے ہیں

"یہ وہ دیوار ہے جو واشنگٹن کے قبرستان میں تعمیر کی گئی، جس میں ان سپاہیوں کے نام لکھے ہیں جو ویت نام کے جنگ میں کام آئے اور ان کی لاشیں نہی ملیں ان کے ماں باپ وہاں آتے ہیں اور اپنے بچوں کے نام اس دیوار پر کندہ دیکھ کر دل کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں"42

جب کہ اس نظم کے پس منظر کے بارے میں اشفاق حسین لکھتے ہیں

"فراز صاحب جب پہلی بار واشنگٹن آئے تو ڈاکٹر عبد اللہ ان کو شہر کی سیر کرانے لے گئے، اور جب انھوں نے ویتنام میموریل دیکھا تو فراز صاحب پر ایک لمبی خاموشی طاری ہو گئی، شام کو گھر آنے کے بعد انھوں نے "کالی دیوار" کے نام سے یہ نظم لکھی 43"

فراز کی دوسری چند بہترین نظموں کے ساتھ ساتھ "کالی دیوار" بھی بین الاقوامی سطح پر ہونے والے مظالم کے خلاف بہترین مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے، نظم کا لفظ لفظ ظالم کے خلاف مزاحمتی جذبات کا اظہار اور مظلوم کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کا بہترین نمونہ ہے، فراز کہتے ہیں

"کل واشنگٹن شہر کی ہم نے سیر بہت کی یار
گونج رہی تھی سارے جگ میں جس کی جے جے کار
ملکوں ملکوں ہم گھومے تھے بنجاروں کی مثل
لیکن اس کی سج دھج سچ مچ دلداروں کی مثل
ایک سفید حویلی جس میں بہت بڑی سرکار
یہیں کریں سوداگر چھوٹی قوموں کا بیوپار
یہیں پہ جادوگر بیٹھا جب کہیں کی ڈور ہلائے
ہر بستی ناگاساکی، ہیروشیما بن جائے

فراز کے خیال میں "سفید حویلی" یعنی وائٹ ہاؤس میں سارے کے سارے بیوپاری بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کو انسانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ وہ جابر اور درندے ہیں، جن سے وحشی بھی پناہ مانگتے ہیں۔ یہاں وہ جادوگر بیٹھے ہوئے ہیں جو ہاتھ کے اشارے سے ظلم و فساد کا بازار گرم کر کے چھوٹی، کمزور اور مفلس قوموں پر ناجائز قبضہ جماتے ہیں۔ ان کے وسائل چھین کر ان کو اندھے غار میں ڈھکیل دیتے ہیں۔

اس حویلی سے کچھ دور ہی اک کالی دیوار
لوگوں کی وہ بھیڑ لگی تھی چلنا تھا دشوار
اس کالی دیوار پہ کندہ دیکھے ہزاروں نام
ان ناموں کے بیچ لکھا تھا "شہدائے ویتنام"
دور دور سے جمع ہوئے تھے طرح طرح کے لوگ
آنکھوں آنکھوں ویرانی تھی چہروں چہروں سوگ
بیکل بہنیں گھائل مائیں کرلاتی بیوائیں

ساجن تم کس دیس سدھارے پوچھیں محبوبائیں
اپنے پیاروں، دلداروں کا او جھل مکھڑا ڈھونڈیں
اِس کالی دیوار پہ ان کے نام کا ٹکڑا ڈھونڈیں
دلوں میں غم، پلکوں پر شبنم، ہاتھ میں پھول اٹھائے
اِس ناموں کے قبرستاں کا بھید کوئی کیا پائے
نا تربت نا کتبہ کوئی نا ہڈی نا ماس
پھر بھی پاگل نیناں کو تھی پیا ملن کی آس
کہیں کہیں دیوار پہ چسپاں ایک سفید گلاب
جیسے ماں کا کوئی آنسو جیسے باپ کا خواب
سبھی کے دِل میں کانٹا بن کر کھٹکے ایک سوال
کس کارن مٹی میں ملائے ہیروں جیسے لال
پیلے دیس میں ہم نے کیا کیا اندھیارے برسائے
اُس کے جیالے تو کٹ مر کر روشنیاں لے آئے
لیکن اتنے چاند گنوا کر ہم نے بھلا کیا پایا
ہم بد قسمت ایسے جن کو دھوپ ملی نا چھایا
مکھ موتی دے کر حاصل کی یہ کالی دیوار
یہ کالی دیوار جو ہے بس اک خالی دیوار
یہ کالی دیوار جو ہے ناموں کا قبرستان
واشنگٹن کے شہر میں دفن ہیں کس کس کے ارمان

(13)غزل بہانہ کروں ۱۹۹۹

غزل بہانہ کروں احمد فراز کا تیرواں شعری مجموعہ ہے جو کہ ۱۹۹۹ء میں منظرِ عام پر آیا یہ مجموعہ ڈاکٹر مہندر کے نام منسوب ہے اس مجموعے میں تہتر غزلیں شامل ہیں اکثر غزلیں اساتذہ کی زمین میں کہیں گئی ہیں مجموعے کے شروع میں فراز کا یہ شعر لکھا ہوا ہے

کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اسے

غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اسے

یہ مجموعہ الگ مزاج اور جداگانہ رنگ رکھتا ہے خالص غزل کے متلاشی یہاں اپنے ذوق کی تسکین محسو کریں گے اساتذہ کی غزلوں پر غزل کہنا کوئی آسان نہیں تاہم فراز نے اساتذہ کی زمین پر بھی کمال کی غزلیں کہیں ہیں

میر کی زمین پر کہی گئی ایک غزل ملاحظہ ہو

وحشتیں بڑھتی گئیں ہجر کے آزار کے ساتھ

اب تو ہم بات بھی کرتے نہیں غم خوار کے ساتھ

ہم نے اک عمر بسر کی ہے غمِ یار کے ساتھ

میرؔ دو دن نہ جئے ہجر کے آزار کے ساتھ

اب تو ہم گھر سے نکلتے ہیں تو رکھ دیتے ہیں

طاق پر عزت سادات بھی دستار کے ساتھ

اس قدر خوف ہے اب شہر کی گلیوں میں کہ لوگ

چاپ سنتے ہیں تو لگ جاتے ہیں دیوار کے ساتھ

ایک تو خواب لیے پھرتے ہو گلیوں گلیوں

اس پہ تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ

شہر کا شہر ہی ناصح ہو تو کیا کیجئے گا

ورنہ ہم رند تو بھڑ جاتے ہیں دو چار کے ساتھ

ہم کو اس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں

لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

جو شرف ہم کو ملا کوچۂ جاناں سے فرازؔ

سوئے مقتل بھی گئے ہیں اسی پندار کے ساتھ

فراز کی زندگی میں عشق و محبت کا تسلسل ہر دور میں جاری و ساری رہا، انھوں نے ہر دور میں ٹوٹ کر محبت کی۔ ان کی شاعری پر نظر ڈالنے سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مارشل لائی ادوار میں سسٹم کی خرابی اور ڈکٹیٹر شپ کے خلاف ان کی مزاحمت زیادہ عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ لیکن جوں ہی مارشل لا ختم ہو جاتا ہے اور جمہوری حکومت برسرِ اقتدار آتی ہے تو وہ ایک بار پھر رومانی شاعری کی طرف لوٹ جاتے ہیں "غزل بہانہ کروں" میں مزاحمتی عناصر کم اور رومانی عناصر زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے تو وہ کہتے ہیں

یہ محبت ہے سن! زمانے سن!
اتنی آسانیوں سے مرتی نہیں

فراز کی زندگی اگر ایک طرف محبت کے بغیر ادھوری ہے تو دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ پیشہ عشق کی مذمت بھی کرتے ہیں، کیوں کہ جب ان کے سامنے اس باب میں دو چار سخت مقام آتے ہیں تو

وہ مایوس ہو جاتے ہیں، ان کے نزدیک عشق میں محبوب سے صرف ہنسی خوشی نہیں ملتی، بلکہ یہاں محبوب کی سنگدلی، بے رخی، بے وفائی اور جدائیوں کے دکھ سے بھی واسطہ پڑتا ہے، لہذا اس مجموعے کی شاعری میں بھی عشق و محبت اور دونوں کے خلاف رد عمل کا اظہار پایا جاتا ہے

اس سرد مہر کی ستم ایجادیاں تو پوچھ
جو تاپتا ہے میرے خطوں کو جلا کے ہاتھ

فراز اس حوالے سے کھرے انسان ہیں کہ جہاں کہیں وہ اپنی ذات میں خامی دیکھتے ہیں، تو اس کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی خود احتسابی کا سلسلہ اس مجموعے میں بھی دکھتا ہے، اس مجموعے میں فراز نے زیادہ تر محبت کے باب میں اپنی ذات کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ محبت کے باب میں ان کی خوبی ہی یہی ہے کہ وہ صرف محبوب کو بے وفا نہیں کہتے، بلکہ خود بھی جب بے وفائی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو بے دھڑک اس کا اظہار کرتے ہیں۔

اب تجھ سے کیا گلہ ہو کہ اک عمر ہو گئی
ہم کو بھی قصدِ کوچۂ جاناں کیے ہوئے

(14)اے عشق جنوں پیشہ 2007ء

"اے عشق جنوں پیشہ " احمد فراز کا خوبصورت چودھواں اور آخری شعری مجموعہ ہے ۔ یہ مجموعہ 2007ء میں منظرِ عام پر آیا، اس مجموعے کی شاعری کا وہ زمانہ ہے جس زمانے میں جنرل پرویز مشرف نواز شریف کا تختہ پلٹ رہے تھے۔ فراز کی باکمال شخصیت کا کمال یہی ہے کہ انھوں نے نوجوانی سے لے کر بڑھاپے تک نوجوانوں جیسی زندگی گزاری۔ ان کی شاعری کے آخر دور یعنی "اے عشق جنوں پیشہ " میں بھی عشق مجازی کے جلوے پورے آب و تاب کے ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں، وہ شروع سے ایک کے بعد د دوسرے اور دوسرے کے بعد اگلے عشق کی جانب گامزن ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں گوشت پوست کی محبوبائیں ہیں، جو ہر وقت مچلتی رہتی ہیں، وہ محبت کے لئے آفاقی طرزِ فکر اختیار کرتا ہے اور اسے ایک ہی محبوب سے مشروط نہیں کرتے کیوں کہ ان کا ماننا ہے

ہر نیا عشق نیا ذائقہ رکھتا ہے فراز

آج کل پھر تری غزلوں کی ادا اور لگی

"اے عشق جنوں پیشہ کی آخری دو تین غزلوں میں سے ایک طویل غزل میں انھوں نے اپنی زندگی کی سر گزشت اپنے شعری سفر کے تناظر میں بیان کی ہے۔ اس غزل کی مطلع میں انھوں نے کہا ہے کہ " جس کو دوست سمجھتے تھے وہ دوست نما کہلاتے تھے / ہم میں کچھ اہلِ دل بھی اہل دنیا کہلاتے تھے "اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آغاز کار ہی سے انھیں دوستوں کی منافقت اور اہل دل کی دنیاداری کا سامنا کرنا پڑا تھا"44

فراز عشق و محبت کو محبوب رکھتے ہوئے بھی جب محبوب کی سرد مہری و بے وفائی اور فراق کے لمحوں سے گزرتے ہیں تو عشق و محبت سے اکتا جاتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک عشق میں مقاماتِ آہ و فگاں انسان کو نڈھال کر دیتے ہیں، اس لئے تو وہ محبت کے ان مراحل کے حوالے سے کچھ اچھے جذبات نہیں رکھتے پروفیسر ڈاکٹر تبسم کہتے ہیں

"اس (فراز) کی شاعری کے نفسیاتی تجزے سے یہ بات بہر طور
سامنے آتی ہے کہ اس کے لاشعور میں محبت کے حوالے سے
کوئی محرومی ضرور ہے، اس کو کسی ذاتی خلش کا سامنا ضرور ہے،
حیرت کی بات ہے کہ زندگی میں بے شمار اور لاتعداد محبتیں
سمیٹنے والا فراز بھی مکمل طور پر سیر اب نہیں ہو پاتا"

اس حوالے سے اے عشق جنوں پیشہ میں موجود ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

عشق آغاز میں ہلکی سی خلش رکھتا ہے
بعد میں سینکڑوں آزار سے لگ جاتے ہیں

اور ایک جگہ کہتے ہیں

ہر برس تازہ کیا عہدِ محبت کو عبث
اب کھلا ہے کہ یہ تہوار مٹانے کا نہ تھا

عشق و محبت کے باب میں ان کے یہاں شروع سے آخر تک محبوب کی بے وفائی سے گلے شکوے موجود ہیں۔ فراز کہیں دبی زبان میں اور کہیں بر ملا محبوب کی بے وفائی کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں، ان کو گلہ ہے کہ محبوب اکثر اوقات دوسروں کی جھوٹی باتوں پر تو یقین کر لیتا ہے، مگر عاشقِ صادق کی سچائی کی اس کے سامنے کوئی اہمیت نہیں ہوتی

ہم ہیں خاموش کہ مجبورِ محبت تھے فراز
ورنہ منسوب ہیں سرکار سے باتیں کیا کیا

اسی مجوعے میں ایک جگہ کہتے ہیں

جانتے ہیں وہ تنک خو ہے، سو اپنا احوال
ہم سنا دیتے ہیں اوروں کا بہانہ کر کے

محبوب کے ساتھ فراز کی خود احتسابی ہمیشہ دیکھنے کو ملتی ہے جو اس مجموعے میں بھی نظر آتی ہے کہ انھیں اس بات کا احساس ہے کہ محبت کے باب میں محبوب کے ساتھ انھوں نے بھی منافقت سے کام لیا ہے۔

اگر محبوب نے محبت میں کوتاہی برتی ہے تو فراز نے بھی مکمل طور پر وفاداری نہیں نبھائی، اس حوالے سے وہ اپنی ذات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور اپنی منافقت کا کھل کر اظہار کرتے ہیں اے عشق جنوں پیشہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

ہزار صورتیں آنکھوں میں پھرتی رہتی ہیں
مری نگاہ میں ہر بار اب کہاں تو بھی
یار سے ہم کو تغافل کا گلہ کیوں ہو کہ ہم
بارہا محفلِ جاناں سے اٹھ آئے خود بھی

اے عشق جنوں پیشہ میں خوبصورت علامات، استعارات، کنایہ اور تشبیہات سے کام لیا گیا ہے

بھری بہار میں اک شاخ پر کھلا ہے گلاب
کہ جیسے تونے ہتھیلی پہ گال رکھا ہے

فراز نے اپنی شاعری میں مقتل کا استعارہ بکثرت استعمال کیا ہے اس مجموعے میں موجود ایک شعر ملاحظہ ہو

بزم جاناں میں تو سب اہلِ طلب جاتے ہیں
کبھی مقتل میں بھی دکھلائیں تماشا جا کر

مختصر یہ کہ فراز کا آخری مجموعہ ایک ایسا شعری کارنامہ ہے، جس میں نئے معانی، نیا پیرہن،، منفرد ردیف و قافیہ اور حرف و معانی کا ایک طلسم ہوشربا ہے جو گرفت میں لیکر بہائے لئے جاتا ہے اور گویا کہ ایک جادو ہے جو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ اس مجموعے کو دوست پبلی کیشنز نے 2007 میں شائع کیا، صادقین نے سرورق کی ڈزائن کی اور پروفیسر شمیم حنفی نے دیباچہ لکھا، اس مجموعے کی خاص بات اچھوتے ردیف وا قافیہ ہیں جنھیں موضوع و مواد، جذبہ وخیال، فکر اور طرزِ فکر، الفاظ و تراکیب کی نغمگی کے علاوہ بحر ووزن اور موسیقیت کی لڑی میں پرو کر زندگی عطا کر دی گئی۔

حوالہ جات

1. محبوب ظفر، احمد فراز شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد2006۔ ص:19
2. پروفیسر فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری، نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار۔ دوست پبلی کیشنز اسلام آباد 2012 ص:100
3. ماہ نو , لاہور،(احمد فراز نمبر۔ جلد62: شمارہ 1۔ جنوری2009۔ صفحہ نمبر 71)
4. (ماہ نو , لاہور،(احمد فراز نمبر۔ جلد62: شمارہ 1۔ جنوری2009۔ صفحہ 87)
5. (فن کی معراج، نسیم حبیب، مشمولہ ارتباط سہ ماہی، استنبول(فراز نمبر) جلد:3، شمارہ2 نومبر2012۔ ص: 46)
6. انعام حسین، احمد فراز کی شاعری پر ایک نظر، مشمولہ ماہ نو، احمد فراز نمبر۔ جلد62: شمارہ 1۔ جنوری2009 ۔ ص140)
7. (انعام حسین، احمد فراز کی شاعری پر ایک نظر، مشمولہ ماہ نو، احمد فراز نمبر۔ جلد62: شمارہ 1۔ جنوری 2009۔ ص140)
8. قیوم نظر۔ فلیپ کور، میرے خواب ریزہ ریزہ۔ کتابی دنیا دہلی 2002)
9. (مسعود اشعر، یہ نوحہ نہیں ہے، مشمولہ، احمد فراز شخصیت اور فن "اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد 2006ص:61
10. (پروفیسر حمیدہ شاہین، سلسلہ ٹوٹا نہیں درد کی زنجیر کا، مشمولہ، ماہ نو,لاہور،(احمد فراز نمبر۔ جلد62: شمارہ 1۔ جنوری2009ص:119)
11. ڈاکٹر سید حسن عباس، فراز کی چند نظمیں، مشمولہ، احمد فراز شخصیت اور فن، مرتبین: زیتون بانو، تاج سعید، ص:341
12. پروفیسر فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری، نغمہ دلدار یا شعلہ بیدار۔ دوست پبلی کیشنز اسلام آباد 2012 ۔ ص۔54)
13. ڈاکٹر شاہ محمد مری۔ ترے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائیگا، مشمولہ ادبیات (احمد فراز نمبر جلد:18 شمارہ 81 دسمبر۔2008)ص:165

14.(احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت اور عصری شعور،از اشرف کمال، مشمولہ ماہ نو احمد فراز نمبر۔ جلد62: شمارہ1۔ جنوری2009)

15.(یادوں کا ایک سنہرا ورق۔ از ڈاکٹر اشفاق حسین، وجدان پبلی کیشنز لاہور۔2009ص41)

16.(یادوں کا ایک سنہرا ورق۔ از ڈاکٹر اشفاق حسین، وجدان پبلی کیشنز لاہور۔2009ص:34)

17.(مسعود مفتی۔۔ اور پھر وہ بھی زبانی میری، مشمولہ، فنون،لاہور، شمارہ:4،جولائی۔ دسمبر1993ء ص: 105

18.ڈاکٹر محمد سلیم، احمد فراز، مشمولہ، ماہ نو(احمد فراز نمبر جلد62: شمارہ1۔ جنوری2009))ص:74

19.(اشفاق حسین، احمد فراز، یادوں کا ایک سنہرا ورق، وجدان پبلی کیشنز لاہور۔2009ص:38)

20.پروفیسر فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار،۔ دوست پبلی کیشنز اسلام آباد 2012: ص:57

21.شہباز نقوی، احمد فراز کی شاعری کے دھنک رنگ مشمولہ، ماہ نو(فراز نمبر، جلد62:شمارہ1۔ جنوری 2009)ص:228

22.پروفیسر فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری، نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد 2012 ۔ص:172

23.اشفاق حسین، احمد فراز کی شاعری، نغمۂہ دلدار یا شعلۂ بیدار،۔ دوست پبلی کیشنز اسلام آباد 2012 ص:94

24.ڈاکٹر سلامت اللہ، ترقی پسندی اور انسان دوستی، مشمولہ۔51ء کا بہترین ادب، ص:73

25.(شمیم اکرام الحق، فراز۔۔ ملامتوں اور محبتوں کے درمیان ایک شخص دلربا سا، مشمولہ، ادبیات(احمد فراز نمبر)ص:181)

26.احسان اکبر، فرازِ فن، مشمولہ، کتاب، بیاد احمد فراز، ص:23

27.صابر لودھی، احمد فراز، رومان سے مزاحمت تک، مشمولہ ماہ نو(فراز نمبر)۔ جلد62: شمارہ1۔ جنوری2009 ۔ص:44

28.(پروفیسر حمیدہ شاہین، سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے درد کی زنجیر کا، مشمولہ، ماہ نو(فراز نمبر)۔۔ جلد62: شمارہ1۔ جنوری2009ص:119)

29.(قمر رئیس، احتجاجی جذبات اور مزاحمتی احساس، مشمولہ، ادبیات (احمد فراز نمبر) جلد:18 شمارہ 81۔ دسمبر۔2008ص:77)

30.(خلیق انجم، ایک بے باک حق گو اور محبت بھری آواز، مشمولہ، اردو دنیا، ص:34)

31.(ڈاکٹر قرۃالعین طاہرہ کا فراز سے انٹرویو، بعنوان، احمد فراز سے مکالمہ، مشمولہ، کتاب، بیاد احمد فراز۔ ص: 198)

32.(پروفیسر فتح محمد ملک۔ احمد فراز کی شاعری نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار،۔ دوست پبلی کیشنز اسلام آباد 2012 ۔ص:34)

33. شہر سخن آراستہ ہے، کلیات احمد فراز، اسلام، آباد2008ص:1525۔1526

34. کنور مہند سنگھ بیدی سحر۔ پس انداز موسم۔ بیک کور پیج۔ کاک پرنٹرس ڈہلی2002

35.(ڈاکٹر شگفتہ فراز۔ سر خیل تھا، وہ قافلۂ نو بہار، مشمولہ وہ جو شہر سخن تھا، احمد فراز شخصیت اور فن۔ ص: 143)

36.(پروفیسر فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار، ص78)

37. پیش لفظ؛ احمد فراز۔ بود لک، مشمولہ شہر سخن آراستہ ہے۔ ص:1426

38. پیش لفظ؛ احمد فراز۔ بود لک، مشمولہ شہر سخن آراستہ ہے۔ ص:1426

39. مجروح سلطان پوری۔ خواب گل پریشاں ہے، بیک کور پیج۔ کاک پرنٹرس، دہلی2002ء

40. احمد ندیم قاسمی، دیباچہ خواب گل پریشاں ہے۔ ص:11۔ کاک پرنٹرس، دہلی2002ء

41. "ملک زادہ جاوید، احمد فراز، مشمولہ، امکان (احمد فراز نمبر)ص:54

42. انور خواجہ، احمد فراز۔۔۔ ایک سدا بہار شاعر۔ مشمولہ، زاویہ احمد فراز نمبر جلد:8 شمارہ۔5-6ص:69

43. اشفاق حسین، احمد فراز، یادوں کا ایک سنہرا ورق، وجدان پبلی کیشنز لاہور۔2009ص:69

44.(پروفیسر فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری نغمۂ دلدار یا شعلۂ بیدار، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد 2012ص؛17)

چھٹا باب

احمد فراز کی شاعری کا تنقیدی جائزہ

احمد فراز بیسویں صدی کے بین الاقوامی سطح کے شعری منظر نامے میں خوبصورت، منفرد اور توانا آواز کے حامل شعراء کی صفِ اوّل میں شمار کیے جاتے ہیں، انھوں نے نہ صرف رومان اور معاملات حسن و عشق کو موضوع سخن بنایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی معاشرتی ناہمواریوں، جبر و تشدد کے ماحول، غاصب اور استحصالی قوتوں، نااہل حکمرانوں، مارشل لائی آمریت، غریب عوام کی حق تلفی اور بین الاقوامی سطح پر مطلق العنانی کے خلاف بھرپور احتجاج اور مزاحمت کا اظہار کیا۔ سب سے اہم بات یہ کہ فراز نے روایت کا احترام بھی کیا اور انھیں نئے سانچوں میں ڈھال کر پیش کرنے کا عمل بھی جاری رکھا، انھوں نے انسانی نفسیات کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا یہی وجہ ہے کہ جس دور میں انسان جس کرب و آشوب سے بھی گزرا یا انسان کی فطرت میں جو بھی ایسے انھوں نے دخیل پائے ان سب کا اظہار ان کی شاعری میں ملتا ہے , وہ زندگی کو تجربات کی کسوٹی پر پرکھنا جانتے ہیں اور زندگی کی بدلتی ہوئی سمت کے ساتھ ساتھ اپنے شاعرانہ رویے اور انداز بیان کو بھی بدلتے رہتے ہیں تا کہ انسانی وجود کی ہر شئے اس کی گرفت میں رہے اس اعتبار سے احمد فراز زندگی کے نباض کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ لیکن نباض

بننے سے پہلے وہ ہر انسانی جذبہ، کیفیت اور دکھ کو اپنی ذات میں اتارتے ہیں اور یہی ایک اچھے اور بڑے تخلیق کار کی شناخت ہے۔

احمد فراز نے شاعری کی اس روایت میں بڑے بڑے دل ربا اضافے کئے ہیں، انھوں نے واردات قلبی کی ہر کیفیت کو یوں تصور کیا کہ ہر آنکھ نے اس میں اپنا چہرہ دیکھا، یہی وجہ ہے کہ فراز کے بے شمار اشعار صرف ذاتی ڈائریوں اور خطوں میں ہی نہیں بلکہ دلوں اور زندگیوں میں بھی اترے ہوئے ہیں۔ فراز کبھی بھی نا امید نہیں ہوتے اور نہ ہی زندگی کے مسائل و مصائب سے ہار مانتے ہیں بلکہ مسائل و مصائب سے لڑنے کا حوصلہ ان میں موجود ہے وہ زندہ رہنے کا گر جانتے ہیں اور بڑے اعتماد اور انہماک سے مسائل و مصائب کو روندتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں.

میں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تو نے

کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے

فراز کی شاعری تقریبا ساٹھ سال پر محیط ہے ان ساٹھ سالوں میں ان کی شاعری مختلف ادوار سے گزرتی ہے ذیل میں ان کی شاعری کے ادوار کو پیش کیا جارہا ہے

فراز کی شاعری کے ادوار:

پہلا دور: 1947 تا 1958ء

فراز کی شاعری کا پہلا دور 47 سے 58 تک بنتا ہے اس دور میں احمد فراز کا پہلا مجموعہ "تنہا تنہا" منظر عام پر آیا اس مجموعہ کی اشاعت نے احمد فراز کے سنہرے دور کا آغاز کیا۔

دوسرا دور: 1958 تا 1972ء

اس دوسرے دور میں احمد فراز کے تین شعری مجموعے۔ "درد آشوب"، "نایافت" اور "شب خون" منظر عام پر آئے، اس دور میں فراز قومی اور عالمی دونوں سطح پر شہرت حاصل کر چکے تھے اور ہر خاص وعام، ان کے شاعرانہ قدو قامت سے واقف ہو چکا تھا

تیسرا دور: **1973 تا 1976ء**

اس دور میں احمد فراز کے دو مجموعے "میرے خواب ریزہ ریزہ" اور جاناں جاناں "منظر عام پر آئے، اس دور میں احمد فراز تقسیم بنگال سے پیدا شدہ صورت حال اور ملک میں لگنے والے مرشل لاء کے حوالے سے شعر کہتے نظر آتے ہیں، علاوہ ازیں اس دور میں سیاست دانوں کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے پاکستان جس قسم کے بگاڑ کا شکار رہا فراز نے ان کے خلاف احتجاج اور مزاحمتی رد عمل کا بھرپور اظہار کیا ہے،

چوتھا دور: **1977 تا 1988ء**

اس دور میں فراز کے تین شعری مجموعے "بے آواز گلی کوچوں میں "نابینا شہر میں آئینہ "اور پس اندازِ موسم "شائع ہوئے، اس دور میں احمد فراز نے جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف شدت سے آواز اٹھائی ہے۔

پانچواں دور: **1989 تا 1999ء**

اس دور میں فراز کے دو شعری مجموعے "غزل بہانہ کروں" اور "خوابِ گل پریشاں ہے" منظرِ عام پر آئے۔ فراز کی شاعری کا یہ وہ دور ہے جب پاکستان میں ایک طویل آمریت کا دور گزرنے کے بعد جمہوریت بحال ہوئی اور پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت برسر اقتدار آئی، فراز جو کہ پاکستان پیپلز پارٹی اور جمہوریت کے حمایتی تھے اس لئے اس دور میں حالات کے بدلتے منظر سے انتہائی خوش دکھائی دیتے ہیں اور جمہوریت کے آغاز کے ساتھ ہی ان کی شاعری کے ترانے بھی بدل گئے، چنانچہ احتجاج اور مزاحمت کی وہ شدت جو مارشل لاء کے دور میں تھی اس دور میں دیکھنے کو نہیں ملتی بلکہ اس دور میں پھر سے وہ محبت

کے گیت الاپنے لگتے ہیں اور عشقیہ شاعری کی طرف لوٹ کر آتے ہیں چنانچہ "خوابِ گل پریشاں ہے" کی ابتدا ہی ان کی مشہور عشقیہ غزل "سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں" سے ہوتی ہے

چھٹا(آخری)دور: 2000تا2007ء

احمد فراز کی شاعری کا آخری دور 2000 سے لیکر 2007 تک بنتا ہے اس دور میں ان کا سب سے عمدہ اور آخری شعری مجموعہ "اے عشق جنوں پیشہ "منظر عام پر آتا ہے ، اس دور میں جہاں احمد فراز جنرل پرویز مشرف کی ڈکٹیٹر شپ کے خلاف مزاحمت کرتے نظر آتے ہیں، وہیں اس دور کی شاعری میں عشقِ مجازی کے جلوے بھی پورے آب و تاب کے ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

جب ہم احمد فراز کی غزلوں اور نظموں کو پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیالات میں نہ صرف ندرت ہے بلکہ ان کے اظہار کے لیے الفاظ کا جو انتخاب کیا گیا ہے اور ان کے بیان کے لیے جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے وہ اسلوب ان کی شاعری کو منفرد بنا دیتا ہے تو سب سے پہلے ہم احمد فراز کی غزل گوئی کے حوالے سے بحث کریں گے۔

فراز کی غزل گوئی:

غزل اردو شاعری کی سب سے جاندار اور وقیع صنف سخن ہے جو زمانے کے ہر سرد و گرم کو جھیلتی ہوئی، اپنی تمام لطافتوں، نزاکتوں، رمزیت، اشاریت اور ایمائیت کے ساتھ آج تک اپنی انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے، اس سخن کا خمیر عرب و عجم اور ہندوپاک کی بہترین شعری روایات کے امتزاج سے اٹھا ہے۔ غزل محض ایک صنف سخن نہیں بلکہ ہمارے تہذیبی مزاج کی ترجمان اور ہماری تہذیب کی ایک علامت ہے ، غزل کا ایک خاص شعری مزاج ہے جس کی فضا، جذبات و احساسات کے مختلف النوع رخوں اور رنگوں سے تعبیر ہوئی ہے اور جس کے مرکز میں انسان کا بنیادی جذبۂ عشق ایک خاص نظام اقدار سے وابستہ ہو کر غزل کی کائینات کا مرکزی استعارہ بنتا ہے۔ اردو غزل کے نگار خانے میں شمع و پروانہ ، برق و خرمن، شانہ و کاکل، بادہ و ساغر، شیشہ و سنگ، قفس و آشیاں، گل و بلبل، رباب و طاؤس، چمن و گلزار اور شہر و گاؤں وغیرہ ہزار ہا علامتیں اور استعارے زندگی کی بوقلمونیوں کو پیش کرنے کے

ساتھ ساتھ چیزوں کے رشتئہ اضداد و میں ربط و معنی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ چونکہ احمد فراز کی شاعری کا پہلا دور 1947ء سے 1958 تک ہے یہ دور ہندو پاک میں غزل کے لیے نہایت اہم دور تھا کیوں کہ اسی دور میں 1947ء کے فسادات نے حساس ذہنوں کو متاثر کیا، جب تک انگریز کی حکومت رہی سامراجیوں سے نجات، ظلم و ستم کے خلاف احتجاج اور نئی زندگی پانے کا تصور شعر و شاعری کا محرک بنا رہا مگر آزادی کے ملتے ہی کسی پائیدار زندگی کے تصور کی منزل پریشاں خیالیوں میں گم ہو کر رہ گئی اور غزل نے احتجاج کا رنگ اختیار کر لیا۔ چانچہ احمد فراز نے جب اپنی شاعری کا آغاز کیا تو اظہار کے کئی پیمانے موجود تھے غزل میں بھی جدتیں پیدا ہو رہی تھیں، ترقی پسند تحریک کے پیغام ہجرت کے احساس اور مثالی ریاست کے خوابوں کی شکستگی نے سوچنے والے بلند ہمت شاعروں کے دل میں طوفان سا برپا کر دیا تھا، درد کی کیفت شاعری میں نئے نئے لہجے پیدا کر رہی تھی اپنے عہد کے ذوق کی تسکین کے لئے احمد فراز نے بھی خوبصورت اور پر تاثیر غزلیں کہیں اور ان غزلوں میں اپنے اور اپنے عہد کے کرب کو سمونے کی کامیاب کوشش بھی کی۔ کنور مہند سنگھ بیدی سحر نایافت کے فلیپ کور پر لکھتے ہیں

" فراز کی شاعری غم دوراں اور غم جاناں کا ایک حسین سنگم ہے،
ان کی غزلیں اس تمام کرب و الم کی غمازی کرتی ہیں جس سے
ایک حساس اور رومانٹک شاعر کو دوچار ہونا پڑتا ہے" 1

فراز بنیادی طور پر غزل کے ہی شاعر ہیں، غزل میں انھیں اولیت حاصل ہے۔ نظم کے مقابلے میں غزل بڑی ہنر مندی سے کہنے کا فن رکھتے ہیں ۔ دو مصرعوں میں اپنی بات پوری نظم کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے کہہ جاتے ہیں اور وہ بھی بڑی سادگی اور مؤثر انداز میں اتنا مؤثر کہ بات دل میں گھر کر جاتی ہے۔

وہ ایک خوش فکر اور خوش آہنگ شاعر تھے ان کی شاعری کے نیم انقلابی آہنگ نے ان کے لہجے میں ایک الگ اور نیا تیور پیدا کر دیا تھا۔ فراز ایک کامیاب غزل گو تھے حالات حاضرہ پر ان کی گہری نظر تھی اور اپنی غزل میں انھوں نے موجودہ زندگی کے تمام مسائل کو سمو لیا تھا، انکی ایک بڑی خوبی ان کے لہجے کا

سکون تھا ایسا لگتا ہے کہ غزل کا مزاج ان کے اندر رچ بس گیا ہو، یہی وجہ ہے کہ فراز کی غزل کے اشعار لوگوں کے ذہن میں نقش رہتے ہیں، ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

کوئی سخن برائے قوافی نہیں کہا
اک شعر بھی غزل میں اضافی نہیں کہا

ہم نے خیالِ یار میں کیا کیا غزل کہی
پھر بھی یہی گُماں ہے کہ کافی نہیں کہا

بھری بہار میں اک شاخ پر کھلا ہے گلاب
کہ جیسے تو نے ہتھیلی پہ گال رکھا ہے

سنا ہے اس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں
سو ہم بہار پہ الزام دھر کے دیکھتے ہیں

ابھی ابھی تو جدائی کی شام آئی تھی
ہمیں عجیب لگا زندگی کا ڈھل جانا

جانے کس حال میں ہم ہیں کہ ہمیں دیکھ کے سب
ایک پل کے لئے رکتے ہیں گزر جاتے ہیں

دل کا دکھ جانا تو دل کا مسئلہ ہے پر ہمیں
اس کا ہنس دینا ہمارے حال پر اچھا لگا

چھپ چھپ کے کوئی چست کرے تنگ قبا کو
ہنس ہنس کے اتارے کوئی زیور مرے آگے

میں نے پوچھا تھا کہ آخر یہ تغافل کب تک؟
مسکراتے ہوئے بولے کہ سوال اچھا ہے

احمد فراز کی غزلیہ شاعری جمالیاتی سحر کی شاعری ہے ان کی غزلوں میں جو حسن کاری، دلفریبی اور رعنائی ہے وہ انھیں سے مخصوص ہے ان کے لہجے میں ایسی نغمگی ہے جس کا تاثر دیر تک قائم رہتا ہے ان کے اسلوب کے بانکپن اور البیلے پن نے انھیں ان کے ہم عصروں میں ممتاز و منفرد بنا دیا ان کی شاعری میں پاکستان کے سیاسی سماجی ماحول کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ دور جدید کے شاعر ہونے کے باوجود ان کے اشعار میں قدیم و جدید کا امتزاج نمایاں ہے ان کے اشعار میں الفاظ پھولوں جیسے سجے اور موتیوں کی طرح جڑے محسوس ہوتے ہیں جو اپنی مہک اور چمک سے دل و دماغ کو معطر اور منور کر جاتے ہیں، صنف شاعری میں انھیں امتیاز حاصل تھا، عموما بول چال کے الفاظ بھی ان کے اشعار میں جگہ پا کر معنویت کے اعتبار سے جامع اور باوقار نظر آتے ہیں، انھوں نے اپنی غزل کے آغاز میں رومانوی موضوعات اپنائے اور پھر وہ سیاسی حقیقت پسندی کی طرف آگئے اس مراجعت سے ان کے ادبی مقام و مرتبے میں اور اضافہ ہوا۔ فتح محمد ملک اپنے مضمون "احمد فراز کا شہر آشوب" میں لکھتے ہیں

"اپنے شعری مزاج اور اپنے ادبی نظریہ کی بدولت، فراز روایتی
حمد و ثنا اور رسمی توصیف کے بجائے رسول کریم صلی اللہ علیہ و
سلم کے انقلابی کردار سے کسب نور کا خوگر ہے"2

فراز نے اپنی غزلوں کے حوالے سے دنیا میں پیار و محبت کے سبق کو عام کیا اور اپنے ارد گرد کے ماحول سے محبت کی ہے، انسانی رشتوں کا احترام اور ان سے پیار کیا ہے، فراز نے عشق کے شعلے کو اپنے دل میں ہمیشہ جواں رکھا۔ ان کی شاعری میں وصال سے زیادہ ہجر کے کرب کا احساس ملتا ہے جو کہ اردو شاعری

میں محبوب کے فراق کا درد بڑی شدت کے ساتھ بیان ہوتا چلا آرہا ہے۔ فراز نے اپنے محبوب کی جستجو کی شاعری کے حوالے سے انسانی زندگی کو پیار و محبت کا پیغام دیا ہے۔ عشق کو زندگی کی کامیابی کا اساسہ سمجھا ہے، عشق و محبت کو ہی زندگی کا سب سے اہم حصہ قرار دیا ہے، فراز نے اپنی شاعری کے ذریعہ دنیا کو محبت کا درس دیا ہے فراز کا ماننا ہے کہ محبت کے بغیر زندگی کے فلسفہ کو سمجھنا بہت مشکل ہے، فراز نے زندگی کی ہر ایک کامیابی کے پیچھے عشق و محبت کو ہی اہمیت دی ہے۔ بذات خود انھوں نے عشق کیا اور کہا بھی "جو عشق نہیں کر سکتا وہ اس دنیا میں کچھ بھی نہیں کر سکتا"

لٹ چکے عشق میں اک بار تو پھر عشق کرو
کس کو معلوم کہ تقدیر سنور بھی جائے

اے خدا آج اسے سب کا مقدر کر دے
وہ محبت کہ جو انساں کو پیمبر کر دے

نو واردان مدرسہ عشق کے لئے
درسِ وفا کا قاعدہ آساں ضرور ہو

کہاں کے مکتب و ملا کہاں کے درس و نصاب
بس اک کتاب محبت رہی ہے بستے میں

محبت اپنا اپنا تجربہ ہے
یہاں فرہاد و مجنوں معتبر نہیں

فراز کی غزلوں میں تشنہ آرزؤں کے لئے در دو سوز کا عمق بھی ہے اور گہرائی اور گیرائی و گداختگی کے ساتھ ساتھ فلسفۂ فکر و غمِ روز گار کا کرب بھی نمایاں ہے، اور مجبوری و مہجوری کا غم انگیز احساس بھی ہے ۔انھوں نے اپنی غزلوں میں معاشرے کی ساری بے اعتدالیوں ، طبقاتی نظام کی کشمکش اور رشتوں کے درمیان دوری کو موضوع بنایا اور کھل کر حکومت کے خلاف احتجاج کیا

جب ساز سلاسل بجتے تھے ہم اپنے لہو سے سجتے تھے
وہ رسم ابھی تک باقی ہے یہ رسم ابھی تک جاری ہے

غزل کا حسن اس وقت کھلتا ہے جب اس میں غنائیت کا نکھار شامل ہو گویا کہ غزل اور غنائیت کا عنصر جس قدر نمایاں ہو گا وہ غزل کی سماعتوں کو آسودگی عطا کرتی ہوئی دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جائیگی اور جذبات کے پانیوں میں ارتعاش پیدا کر دیگی، احمد فراز کے یہاں غزل اور غنائیت آپس میں شیر وشکر ہیں ،ان کی تقریباً ہر غزل غنائیت سے لبریز ہے انھوں نے غزل میں موسیقی پیدا کرنے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مترنم بحریں، گاتی بجاتی ردیفیں اور موسیقی آمیز الفاظ ملتے ہیں، اس حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

وہ خار خار ہے شاخِ گلاب کی مانند
میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اسے

زندہ دلانِ شہر کو کیا ہو گیا فراز
آنکھیں بجھی بجھی ہیں تو چہرے مرے مرے

جس کو دیکھو وہی زنجیر بپا لگتا ہے
شہر کا شہر ہوا داخلِ زندان جاناں

غزل اور رومانوی فضا احمد فراز کا بہت اہم اور توانا حوالہ ہے ، ان کی غزل میں رومانی فضا اس لئے بھی صاف ستھری ہے کہ وہ محبت میں رکھ رکھاؤ کے قائل ہیں۔ بات محبوب کے جمال کی ہو یا اس کے وصال کی بات کا سلیقہ اور قرینہ معیار کو مطابق کر دیتا ہے ۔ فراز کی غزل کے کرداروں میں خطیب شہر ، ساقی، قابیل، مجرم ،ناخدا، رہزن اور محتسب ان کے نظریات کی ترسیل کرتے ہیں

یوں تو ہر شخص ہے اندیشہ **رہزن** کا اسیر
کارواں نیت رہبر سے بھی غافل نہ رہے
دہکتی دھوپ میں خلقت تھی گوش بر آواز
بجز **خطیب** مگر کوئی سائباں میں نہ تھا

مرے ضمیر نے **قابیل** کو نہیں بخشا
میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے

وہ جو **قاتل** تھے وہ عیسی نفسی بیچتے ہیں
وہ جو مجرم ہیں انھیں اہل عدالت دیکھوں

فرازؔ کی شاعری غم دوراں اور غم جاناں کا ایک حسین سنگم ہے۔ ان کی غزلیں اس تمام کرب و الم کی غمازی کرتی ہیں جس سے ایک حسّاس اور رومانٹک شاعر کو دوچار ہونا پڑتا ہے، فراز کی غزل میں عشق و محبت کی واردات، معمالات عشق کا بیان، محبوب کے حسن کی چکا چوند ملاقات، گلے شکوے، رسم وراہ، وفا و بے وفا، قول و قرار، جدائی اور وصال سب لذتیں موجود ہیں، یہی وجہ ہے کہ احمد فراز کی غزل حسی اور جذباتی سطح پر پڑھنے والوں پر اپنا اثر چھوڑتی ہے وہ عصر جدید میں عورت سے وفا کا تقاضا کرتے ہیں، تا کہ محبت کا بھرم قائم رہ سکے۔ احمد فراز ایسی پر تاثیر محبتوں کا نصاب لکھنے والے شاعر ہیں جن کے بغیر غزل کا ماضی حال اور مستقبل ادھورا ہے۔ فراز کی غزلوں میں جو فکریاتی عناصر ملتے ہیں وہ اپنی نوعیت کے نئے اضافے ہیں، انھوں نے کلاسکی حسن کو نئے معنی ہی نہیں دیے بلکہ رومان کو نفسی و ذہنی رویہ کی

پہچان کے طور بھی استعمال کیا۔ ان کی نیم رومانی شاعری کا ایک حصہ ان کی اپنی تنہائی کا احساس بھی ہے جو بہت حد تک فیض کی تنہائی سے مشابہ ہے یہی وجہ کہ فراز نے کلاسکی دائرے میں رہ کر اپنی آواز کو منفرد بنایا ہے اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں

قربتوں میں بھی جدائی کے بہانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقت شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لئے
اب یہی ترک تعلق کے بہانے مانگے

اپنا یہ حال کے جی ہار چکے لٹ بھی چکے
اور محبت وہی انداز پرانے مانگے

اس غزل میں فراز نے محبوب کی بے وفائی کا ذکر کرتے ہوئے اس سے ترک تعلق کا تقاضہ کیا ہے اس طرح فراز کے یہاں روایتی غزل گو شعراء کی طرح بے وفائی کا ذکر ملتا ہے۔ اردو غزل کا روایتی محبوب بے رخی اور تغافل شعاری میں بے مثال تھا، فراز کا محبوب بھی اسی طرح کا ہے، محبوب کی جدائی نہیں سہہ پاتے تو اپنے دل کے ہاتھوں تنگ آکر محبوب کی بے رخی اور تغافل کو بھی گوارہ کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں ساتھ ہی ساتھ فراز محبوب کو فراموش نہیں کر پاتے بلکہ جدائی کے لمحوں میں اسی کا خیال دل میں لئے پھرتے ہیں اس لئے فراز کا رویہ روایتی غزل کے عاشق جیسا ہے۔ گویا کہ ان کی غزلوں میں اردو غزل کی کلاسکی اور جدید ساختوں کے تمام رنگ ملتے ہیں لیکن جب ہم احمد فراز کی غزلوں کی ساخت کی منفرد پہچان قائم کرنے اور اسے نام دینے کی کوشش کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ احمد فراز کی

غزلوں کو کسی ایک ٹھوس اور جامد ساخت کے اندر قید نہیں کیا جا سکتا ہے پھر بھی کہا جا سکتا ہے کہ احمد فراز کی غزلوں کی ساخت، جذباتی ساخت ہے، گویا کہ احمد فراز اپنی غزلوں میں خارجی اور داخلی، جس طرح کے جذبات اور تجربات، کیفیات اور محسوسات کا اظہار کرتے ہیں، پہلے انھیں اپنے رنگ میں رنگتے ہیں اس کے بعد اس کو شعر کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں، احمد فراز کا یہ رویہ عمومی رویہ ہے، اسی بنا پر ہ کہا جا سکتا ہے کہ احمد فراز کی غزلوں کی ساخت کی نوعیت جذباتی ہے، ساتھ ہی ساتھ ان کی غزل جذباتی اعتبار سے اہمیت کی حامل بھی ہے ان کے ہر شعر میں جذباتیت کی الگ الگ صورتیں نظر آتی ہیں ،لہذا فراز کی غزل کی جذباتی ساخت میں گہرائی بھی ہے اور رنگا رنگی بھی، رنج و غم کے جذبات کو انھوں نے موثر طریقوں سے پیش کیا ہے، دکھ کے جذبات ان کے یہاں کبھی محبوب کے ہجر کا مرثیہ بن کر سامنے آتے ہیں کبھی یاد رفتگاں بن کر کبھی ٹوٹے دل کی صدا بن کر، کبھی اپنی زمین سے بچھڑنے کا اذیت ناک تجربہ بن کر، کبھی فسادات کی ہولناک آگ بن کر، کبھی غم دوراں بن کر اور کبھی آگہی کا کرب اور جدید دور کی بخشی ہوئی تنہائی بن کر ظاہر ہوتے ہیں۔ غرض فراز نے انسانی زندگی کے مسائل کو ہر زاویہ سے دیکھا، جانچا، محسوس کیا اور پھر ان تمام دکھوں کو اپنی ذات میں اتار کر شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ ذیل میں فراز کی غزلوں سے چند جذباتی اشعار پیش کیے جا رہے ہیں ملاحظہ کیجیے۔

عقل وہ ناصح کہ ہر دم لغزشِ پا کا خیال
دل وہ دیوانہ یہی چاہے کہ نادانی کرے

سو حوالوں سے تجھے یاد کروں جانِ فراز
جانِ جاں، جان جہاں، جانِ سخن، جانِ فراز

زندگی پھر لہو رلائے گی
یادِ یاراں ہے بے خبر شاید

کچھ تو مرے پندارِ محبت کا بھرم رکھ
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لئے آ

دل بدن کا شریک حال کہاں
ہجر پھر ہجر ہے وصال کہاں

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لئے آ

تاہم یہ بات ذکر کرنا بھی فائدہ سے خالی نہ ہو گا کہ احمد فراز کی غزلوں کی جذباتی ساخت سے ٹھوس معانی کا اخراج نہیں ہوتا، بلکہ سیال، تکثیری اور متغیر معانی کا اخراج ہوتا ہے، اسی لئے فراز کے اشعار میں جذبہ سے مضمون و مفہوم کی بہت سی کرنیں پھوٹتی ہیں، مثلاً عصر حاضر کے مسائل و مصائب، ذات و کائینات، موت وحیات، رنج و غم، سیاست و ثقافت، ہمت و حوصلہ، فسادات، انسان دوستی، رومانیت، ترقی پسندی، جدت پسندی، مذہب، مایوسی اور ناامیدی، امید، حسن و عشق، فطرت، عوامی جذبات اور وطن پرستی وغیرہ کے حوالے سے احمد فراز کے خیالات الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر کس طرح سامنے آتے ہیں اس کا اندازہ الگ الگ عنوانات سے اس طرح لگایا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے ذیل میں چند اشعار پیش کیے جارہے ہیں جن میں رنج و غم، حسن و عشق، انسان دوستی، فسادات، ہجر اور بے گھری کے حوالے سے فراز نے اپنے جذبات کو بیان کیا ہے

رنج و غم کے جذبات کے حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں

فراز ہو کہ وہ فرہاد ہو یا کہ منصور
انھیں کا نام ہے ناکامِ آرزو جو ہوئے

کبھی ان لالہ قباؤں کو بھی دیکھا ہے فراز

پہنے پھرتے ہیں خوابوں کے کفن تم جیسے

شہرِ محبت ہجر کا موسم عہدِ وفا اور میں
تو تو اس بستی سے چلا گیا اور میں

اہلِ جہاں ہماری روش سے ہیں بے خبر
ہم پیرہن دریدہ نہیں، دل دریدہ ہیں

حسن و عشق کے جذبات کے حوالے سے اشعار ملاحظہ ہوں

سامنے اس کے دکھے نرگس شہلا بیمار
روبرو اس کے بھرے سرو بھی پانی لوگو

زلف زنجیر تھی ظالم کی تو شمشیر بدن
روپ سا روپ جوانی سی جوانی لوگو

اپسرا تھی، نہ حور تھی، نہ پری
دلبری میں مگر زیادہ تھی

صورت تھی کہ ہم جیسے صنم ساز بھی گم تھے
مورت تھی کہ ہم جیسے پجاری نہیں بھولے

ہندو پاک کی تقسیم کے موقعہ پر فسادات کی جو خانہ ویرانیاں ہوئیں، احمد فراز کے دل پر ان کا گہرا اثر مرتب ہوا، اور کشت وخوں کا جو بازار گرم ہوا احمد فراز نے اس بازار میں بکتے، لٹتے اور کٹتے ہوئے لوگوں کی حالت پر ماتم کچھ اس طرح کیا ہے

کچھ سر بھی کٹ گرے ہیں پہ کہرام تو مچا
یوں قاتلوں کے ہاتھ سے تلوار بھی گری

اب وہاں خاک اڑاتی ہے ہوا
پھول ہی پھول جہاں تھے پہلے

فسادات کے نتیجے میں سامنے آنے والی ہجرت اور اپنی زمین سے بچھڑنے کے دکھ کو بھی احمد فراز نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ احمد فراز اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ جن کی جڑیں اپنی زمین سے اکھڑتی ہیں ان کے لئے ہر ایک زمین تنگ ہو جاتی ہے انھوں نے ہجرت کے دل سوز واقعات و تجربات کو انفرادی اور اجتماعی دونوں طور پر پیش کیا

رہگیروں کی خاموشی کو غور سے سن
یوں ہیں جیسے ماتم کرتے جاتے ہیں

بظاہر ایک ہی شب ہے فراق یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

جو ہم سفر سر منزل بچھڑ رہا ہے فرازؔ
عجب نہیں ہے اگر یاد بھی نہ آؤں اسے

احمد فراز نے مارشل لاء کے دور میں خود ساختہ جلاوطنی اختیار اس دور میں فراز کو وطن کی یاد ستاتی ہے اس جلاوطنی نے انھیں نئے نئے موضوعات دئے اور یاد وطن نے ان کے کلام میں چاشنی پیدا کر دی۔

خانہ ویرانی تو ہوتی ہے مگر ایسی کہاں

اپنی آنکھوں سے خود اپنا گھر نہ پہچانا پڑے

یہاں بھی پھول سے چہرے دکھائی دیتے تھے
یہ اب جو ہیں دیوار و در نہ تھے ایسے
بستی والے ایسے خوفزدہ کب تھے
اب تو خود سے بھی سرگوشی ہوتی ہے

وہ محبتوں کے، احتجاج کے اور انسان دوستی کے شاعر ہیں اس حوالے سے قمر رئیس لکھتے ہیں

"قلم کی ناموس اور انسانیت کی حرمت کا تحفظ ہی احمد فراز کی شاعری کا دستور العمل رہا ہے لیکن اپنے شعری لہجے کے امتیازات کو پانے کے لئے انھیں بڑی ریاضت کرنا پڑی ہے غزل ہو کہ نظم شعری پیکروں کی نرمی اور سبک روی ان کے یہاں تازگی یا تاثر کی ایک نئی فضا پیدا کرتی ہے"3

انسان دوستی کے جذبات کے حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں

آوارہ نہ پھر شام غریبی کے مسافر
آ اور مرے دل کی سرائے کو وطن کر

کوئی اسے نہ سنائے ہمارا حال خراب
مبادا اس کو بھی افسوس ہوا سو ہوا

وہ انسان کو نا امیدی کی دہلیز پر نہیں لے جاتے بلکہ ہر موقعہ پر ہمت و حوصلہ کی تلقین کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہمت و حوصلہ کے حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

میں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تو نے

کس قدر حوصلہ، ہارے ہوئے انسان میں ہے

شکستگی میں بھی پندار دل سلامت ہے

کہ اس کے در پہ پہنچے مگر صدا نہیں کی

احمد فراز چونکہ دور جدید کے مقبول ترین شاعر تھے ان کی شاعری میں تنوّع، رنگا رنگی، نکتہ آفرینی، اور جدتِ ادا پائی جاتی ہے، ان کی غزلوں کی بحریں دریا کی موجوں کی طرح رواں دواں ہیں انھوں نے اردو ادب کو عمدہ شاعری سے نوازا ہے ان کی جدت طرازی، اور دور جدید دور کے کرب کے حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں

ہم کو اس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں

لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

آج اس نے شرفِ ہمسفری بخشا تھا

اور کچھ ایسے کہ مجھے خواہش منزل نہ رہے

تری آنکھوں کو جاناں کیا ہوا ہے

کبھی دیکھے نہ تھے بیمار قاتل

آخر کو ضرورت ہی خریدار کی نکلی

مریم سی وہ لعبت بھی تو بازار کی نکلی

انھوں نے غزل میں اپنی زبان اپنی تہذیب اور اپنی روایات بر قرار رکھتے ہوئے ایک نئی معنویت پیدا کی وہ کہتے ہیں۔

غم دنیا بھی غم یار میں شامل کر لو

نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

شرابوں کے شرابوں میں ملنے کو اردو کی شعری روایت کے منافی قرار دیا گیا کیوں کہ قدیم شعری روایت میں انگریزی کے کاکٹیل کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن عوام نے اس تبدیلی کو پسند کیا۔ فراز نے جہاں بھی روایتی غزل کو موجودہ ہر پل بدلتی ہوئی اقدار سے جوڑا تو بالکل ہی ایک نئی صورت حال پیدا ہوگئی، جس نے نوجوان نسل کو اس کی اپنی زندگی سے روشناس کرادیا۔

اب کے ہم بچھڑے تو شائد کبھی خوابوں میں ملیں

جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملے

فراز کے یہاں عصرِ حاضر کی پیچیدگیاں، بے اعتدالیاں، تضاد اور نفسیاتی کشمکش کو بھی موضوع سخن بنانے کی روش ملتی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں۔

دیکھا مجھے تو ترکِ تعلق کے باوجود

وہ مسکرادیا یہ ہنر بھی اسی کا تھا

احمد فراز نے اپنے دل کش انداز، نفاست، سلیقہ مندی اور مدھم آہنگ کی وجہ سے کافی مقبولیت حاصل کی۔ ان کی غزلوں میں جو احتجاج ابھرتا ہے اس میں اپنے شہر کا نوحہ، دم توڑتی ہوئی اقدار، تہذیب کی پامالی، رشتوں کا بکھراؤ، تنہائی کا کرب، ملک کا بٹوارہ، ہجرت، اہل سیاست، اور مذہبی ٹھیکے داروں کی اجارہ داری کے موضوعات جابجا نظر آتے ہیں، انھوں نے ان موضوعات کو مختلف علامتوں، استعاروں اور تلمیحات کی مدد سے پیش کیا ہے، منصف، مجرم، انصاف، سزا، مقتل، قاتل و مسیحا، کاسہ، عہد ستم، کربلا، اور شہر وغیرہ جیسے الفاظ وتراکیب کا استعمال ان کی غزلوں مختلف انداز میں ہوا ہے۔

چند شعر ملاحظہ کیجئے

کیا خبر تجھ کو کہ کس وضع کا بسمل ہے فراز

وہ تو **قاتل** کو بھی الزامِ مسیحائی دے

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

اور پھر سب نے یہ دیکھا کہ اسی **مقتل** سے
میرا قاتل میری پوشاک پہن کر نکلا

دیکھنا سب **رقص بسمل** میں مگن ہو جائیں گے
جس طرف سے تیر آئیگا ادھر دیکھے گا کون

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

میں تہِ **کاسہ** ولب تشنہ رہوں گا کب تک
تیرے ہوتے ہوئے، اے صاحبِ دریا میرے
ستم تو یہ ہے کہ **عہد ستم** کے جاتے ہی
تمام خلق مری ہم نوا نکلتی ہے

اک دہلیز پہ جا کر دل خوش ہوتا تھا
اب تو **شہر** میں ہر اک در افسوس کا ہے

فراز کی غزلوں میں " شہر " کا لفظ جابجا استعمال ہوا ہے انھوں نے بہت سارے اشعار میں لفظ " شہر " کو علامت اور استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے ، لفظ شہر ان کی غزلوں میں وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔

فراز کے شہر کی کیاریوں میں درد کے گلاب بھی کھلتے ہیں اور خون کی بارشیں بھی ہوتی ہیں ، ان شہروں میں خطیبوں ، واعظوں اور دستار فضیلت رکھنے والوں کے گروہ بھی ہیں اور بے ضمیری کے لبادے میں ملبوس بے حسی کے مجسمے بھی ، گویا کہ زندگی کے مختلف کردار ہیں جو فراز کے شہر کے گلی کوچوں میں سانس لیتے ہوئے ، چلتے پھرتے نظر آتے ہیں انھیں کرداروں کی وجہ سے ہی فراز کی شاعری میں تلخی آجاتی ہے۔ احمد فراز کی غزلوں میں خوابوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا نوحہ بیان کیا گیا ہے دوسروں کی طرح فراز نے بھی صبح آزادی کا خواب دیکھا تھا لیکن فراز کا وہ خواب ٹوٹ کر بکھر گیا۔ فراز اس صبح کو ، صبح کاذب سے تشبیہ دیتے ہیں۔

یہ صبح کاذب تورات سے بھی طویل تر ہے
کہ جیسے صدیاں گذر گئیں آفتاب دیکھے

کہاں کہ آنکھیں کہ اب تو چہروں پہ آبلے ہیں
اور آبلوں سے بھلا کوئی کیسے خواب دیکھے

احمد فراز کے کلیات میں جابجا غالب کی زمینوں میں کہی گئیں غزلیں پائی جاتی ہیں ، کہیں ان کی زمینوں میں قافیوں کو تبدیل کرکے غزلیں ملتی ہیں تو کہیں ردیفوں میں تھوڑی سی تبدیلی کرکے خوبصورت غزلیں کہیں ہیں ، ذیل کے اشعار میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں

غالب کہتے ہیں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

توفراز نے اسی ردیف میں تھوڑے سے تغیر کے ساتھ اپنی پسندیدہ غزل کچھ اس طرح کہی۔

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے درد کی گاہک ہے چشم ناز اس کی
سو ہم بھی اس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کو بھی ہے شعر و شاعری سے شغف
سو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے رات اسے چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بام فلک سے اتر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں
سنا ہے اس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے رات سے بڑھ کر ہیں کاکلیں اس کی
سنا ہے شام کو سائے گزر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کی سیہ چشمگی قیامت ہے

سو اس کو سرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں
سو ہم بہار پہ الزام دھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے آئنہ تمثال ہے جبیں اس کی
جو سادہ دل ہیں اسے بن سنور کے دیکھتے ہیں

سنا ہے جب سے حمائل ہیں اس کی گردن میں
مزاج اور ہی لعل و گہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے چشم تصور سے دشت امکاں میں
پلنگ زاویے اس کی کمر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

وہ سرو قد ہے مگر بے گل مراد نہیں
کہ اس شجر پہ شگوفے ثمر کے دیکھتے ہیں

بس اک نگاہ سے لٹتا ہے قافلہ دل کا
سو رہروان تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کے شبستاں سے متصل ہے بہشت
مکیں ادھر کے بھی جلوے ادھر کے دیکھتے ہیں

رکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

کسے نصیب کہ بے پیرہن اسے دیکھے
کبھی کبھی در و دیوار گھر کے دیکھتے ہیں

کہانیاں ہی سہی سب مبالغے ہی سہی

اگر وہ خواب ہے تعبیر کر کے دیکھتے ہیں

اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں

فراز آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

یہ غزل فراز نے ایک مشاعرے میں پڑھی جس میں سردار جعفری بھی موجود تھے، یہ غزل سننے کے بعد سردار جعفری نے آخر میں کہا" اب سارے شاعروں کو اپنا قلم توڑ دینا چاہئے ، اب اس کے بعد کسی کو شعر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر اسی قافیہ میں تھوڑی سے تبدیلی کرتے ہوئے ایک اور غزل کہی۔

ابھی کچھ اور کرشمے غزل کے دیکھتے ہیں

فراز اب ذرا لہجہ بدل کے دیکھتے ہیں

جدائیاں تو مقدر ہیں پھر بھی جان سفر

کچھ اور دور ذرا ساتھ چل کے دیکھتے ہیں

رہ وفا میں حریف خرام کوئی تو ہو

سو اپنے آپ سے آگے نکل کے دیکھتے ہیں

تو سامنے ہے تو پھر کیوں یقیں نہیں آتا

یہ بار بار جو آنکھوں کو مل کے دیکھتے ہیں

یہ کون لوگ ہیں موجود تیری محفل میں

جو لالچوں سے تجھے مجھ کو جل کے دیکھتے ہیں

یہ قرب کیا ہے کہ یک جاں ہوئے نہ دور رہے

ہزار ایک ہی قالب میں ڈھل کے دیکھتے ہیں

نہ تجھ کو مات ہوئی ہے نہ مجھ کو مات ہوئی

سو اب کے دونوں ہی چالیں بدل کے دیکھتے ہیں

یہ کون ہے سر ساحل کہ ڈوبنے والے

سمندروں کی تہوں سے اچھل کے دیکھتے ہیں

ابھی تلک تو نہ کندن ہوئے نہ راکھ ہوئے

ہم اپنی آگ میں ہر روز جل کے دیکھتے ہیں

بہت دنوں سے نہیں ہے کچھ اس کی خیر خبر

چلو فراز کوئے یار چل کے دیکھتے ہیں

اس کے بعد ردیف میں تھوڑی سی تبدیلی کرتے ہوئے ایک اور غزل غالب کی اسی بحر میں کہی

مسافرت میں بھی تصویر گھر کی دیکھتے ہیں

کوئی بھی خواب ہو تعبیر گھر کی دیکھتے ہیں

وطن سے دور بھی آزادیاں نصیب کسے

قدم کہیں بھی ہوں تصویر گھر کی دیکھتے ہیں

اگرچہ جسم کی دیوار گرنے والی ہے

یہ سادہ لوح کہ تعمیر گھر کی دیکھتے ہیں

کوئی تو زخم اسے بھولنے نہیں دیتا

کوئی تو یاد عناں گیر، گھر کی دیکھتے ہیں

ہم ایسے خانہ بر انداز، کنجِ غربت میں

جو گھر نہیں تو تصاویر گھر کی دیکھتے ہیں

بنائے دل ہے کسی خوابگاہِ زلزلہ پر

سو اپنی آنکھوں سے تقدیر گھر کی دیکھتے ہیں

فراز جب کوئی نامہ وطن سے آتا ہے

تو حرف حرف میں تصویر گھر کی دیکھتے ہیں

چونکہ غالب، فراز کے پسندیدہ شاعر تھے اس لیے ان کی زمینوں میں غزلیں تو کہی ہیں اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا اقرا بھی کیا

نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں

عجب سفر ہے کہ بس ہم سفر کو دیکھتے ہیں
فراز ہم سے سخن دوست فال کے لیے بھی
کلامِ غالبِ آشفتہ سر کو دیکھتے ہیں

"احمد فراز کی غزل دراصل صنف غزل کی تمام روشن روایات کے جدید اور سلیقہ مندانہ اظہار کا نام ہے " فراز کی غزل تکمیل کی انتہا بتائی جاتی ہے ، ان کی شناخت کا بنیادی حوالہ غزل ہی ہے غزل بھی ایسی جو اپنا شجرہ نسب رکھتی ، ہے غزل کی روایت ان کے یہاں بند تالاب کی طرح نہیں بلکہ ایک متحرک اور روان دواں چشمے کے مانند ہے جو عصری آگہی کے سوتوں سے مل کر بڑھنے کے عمل کو تیز کرتی ہے ان کی غزل کا چہرہ ہمیشہ شاداب اور تر و تازہ دکھائی دیتا ہے, احمد فراز کی غزلوں میں موسیقیت اور غنائیت کا نہایت دلآویز رچاؤ ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں نیا آہنگ نیا لہجہ اور نیا تحرک موجود ہے، غزل میں خاص روانی اور تسلسل پایا جاتا ہے ، جیسے لہریں سفر کر رہی ہوں کیوں کہ اس میں ترنم اور شیریں آوازوں کا ایک جہانِ نو آباد ہے احمد فراز کی شاعری کے حوالے سے فتح محمد ملک لکھتے ہیں

"گردو پیش کی زندگی کی ناہمواریوں اور سفاکیوں سے متعلق تلخ
نوائی کے ساتھ ساتھ فراز نے ہمارے زمانے کی غنائی شاعری کو
تہہ دار اور پر ثروت بنادیا ہے "4

جب سے اردو شاعری کی داغ بیل پڑی ہے بہت سی دیگر روایتوں میں سے ایک روایت یہ بھی ہے جو غزل کی ذات سے چسپاں ہو کر رہ گئی یعنی محبوب کے لئے صیغۂ مذکر ہی استعمال ہو گا لیکن احمد فراز نے محبوب کے لئے مؤنث کا صیغہ کئی مقامات پر بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے "خواب گل پریشاں ہے" میں ایک مکمل غزل اس نئی تبدیلی کی ایک کامیاب مثال دکھائی دیتی ہے اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ادھر ادھر کے بھی کردار آتے جاتے رہے
مرے سخن کا مگر مرکزی خیال تھی وہ

وہ پیرہن تھی مگر جسم وجاں رہی میری
کہ جو بھی جیسا بھی موسم تھا حسب حال تھی وہ

یہ عمر بھر کا اثاثہ اسی کے نام تو ہے
اگرچہ میری رفاقت میں چند سال تھی وہ

فراز یاد ہے اب تک سپردگی اس کی
ز فرق تا بقدم خواہش وصال تھی وہ

احمد ندیم قاسمی نے احمد فراز کی غزل گوئی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے

"احمد فراز کی غزل در صنف غزل کی تمام روشن روایات کے جدید اور سلیقہ مندانہ اظہار کا نام ہے ،اس کا ایک ایک مصرعہ ایسا گتھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک لفظ کی تبدیلی کی گنجائش بھی باقی نہیں چھوڑتا اس کی غزل تکمیل perfection کی انتہا ہے 5"

ان کی غزلوں میں باطنی زندگی کی عکاسی اور ترجمانی موجود ہے، لہٰذا ان کے یہاں فکری اور تخلیقی قوتوں کا نہایت متوازن امتزاج دکھائی دیتا ہے، کیوں کہ انھوں نے غزل کی روایتی ریزہ خیالی اور پراگندہ ذہنی کیفیات سے اپنے آپ کو ہمیشہ دور رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں جہاں جدید مضامین و افکار کی فراوانی ہے وہیں نادر تشبیہات اور عمیق استعارات کی بہتات ہے بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ان کی شاعری میں تشبیہات کا ایک جہانِ نو آباد ہے وہ ایک وہبی شاعر ہیں ان کا شعری وجدانِ تخیل ہمہ وقت نئی وسعتوں اور اظہار کے نئے سانچوں کا متلاشی رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تشبیہات اور استعارات میں تخلیقی رنگ موجود ہے۔

آخر کو ضرورت ہی خریدار کی نکلی
مریم سی وہ لعبت بھی تو بازار کی نکلی
کل ہجر کی شب روز قیامت کی طرح تھی

دن نکلا نہ جاں ہی ترے بیمار کی نکلی

احمد فراز نے غزل کی کوملتا، دھیمے آہنگ، اور نزاکت کا خاص خیال رکھا ہے، ان کے یہاں عشق میں پیش آنے والی کیفیات وواقعات اور قلبی واردات کا بیان نہایت موزوں الفاظ میں موجود ہے اور جہاں کہیں بھی اضافتوں کی کثرت سے غزل کا حسن کم ہوتا دکھتا ہے وہیں مضمون کی جاذبیت کا لاحقہ لگا کر غزل کے حسن کو دوبالا کر دیا جاتا ہے۔

تری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

ان کی غزلوں میں بھرتی کے اشعار کہیں بھی نظر نہیں آتے بلکہ ہر شعر الفاظ کی موزونیت ، مضمون کی بندش اور رفن شاعری کے سانچوں میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے ، جس میں کہیں انگلی تک رکھنے کی گنجائش دکھائی نہیں دیتی مثلا یہ شعر ہی لے لیجئے

شعر بھی آیتوں سے کیا کم ہے
ہم پے مانا وحی اترتی نہیں
جس طرح تم گزارتے ہو فراز
زندگی اس طرح گزرتی نہیں

صنف غزل کی روشن تہذیب فراز کی شاعری میں پوری آب وتاب کے ساتھ در آئی ہے "تنہا تنہا"، "جاناں جاناں" اور "درد آشوب" کی شاعری میں احمد فراز کا اسلوب ایک خاص نوعیت کی رومانیت کا حامل ہے ، اس خاص رومانیت میں شاعر کی توجہ کا مرکز اس کی اپنی ذات ، اپنی حسیات اور اپنے تجربات ہوتے ہیں فراز نے اپنے اولین دور میں بھی اس نازک مرحلے کو بڑی چابک دستی کے ساتھ نبھایا

نگاہ یار کا کیا ہے، ہوئی ہوئی نہ ہوئی
یہ دل کا درد ہے پیارے گیا گیا نہ گیا

ان کی غزل میں شیخ وقت کی دعا کی طرح ایک ایسی مماثلت ہے جس نے اظہار کی خوش سلیقگی میں بھی خود کو دیکھا اور ابلاغ کے حسیاتی درجے کو بھی متعین کیا، اور مضامینِ ہجر ووصال، کرب واضطراب ، غم

جاناں و غم زمانہ کو ہر بار نئے انداز سے بیان کیا ہے، یہی احمد فراز کا فکری اجلا پن ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں

اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں

یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز

دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

مختصر یہ کہ احمد فراز اردو غزل کی ایک نئی آواز کا نام تھا جنھوں نے غزل کی روح کو ایک نئی آب و تاب کے ساتھ موجودہ شعری تناظر میں انتہائی کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔ زاہد حسن اپنے مضمون "دنیا ترے بارے میں مرے خواب بہت تھے" میں کہتے ہیں

"اردو غزل کو کم ایسے شاعر میسر آئے ہیں جنھوں نے اس کے خدوخال کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ اسے فکر و نظر کے نئے زاویے، نئے رخ بھی عطا کئے"6

فراز کی نظم نگاری:

ساٹھ کی دہائی کی اردو نظم نفی، تشکیک، یاسیت اور الم پرستی سے عبارت ہے۔ ان عوامل کے پس پردہ دگر گوں سیاسی، سماجی حالات اور ان اثرات کی کارفرمائی شامل ہے جو مغربی افکار سے آگہی کی بنا پر سائنسی تعقل کے فروغ کا باعث بن رہے تھے۔ منطقی اثباتیت پسندوں نے مابعد الطبیعات کارد کر دیا تھا یوں روحانی اقدار کے سہارے کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی تھی۔ نفی و تشکیک کا شکار فرد اپنی ذات کی بھول بھلیوں میں گم تھا۔ جس کا ماضی بین الاقوامی سطح پر دو عظیم جنگوں اور مقامی سطح پر 1947ء کے خوں آشام فسادات سے عبارت تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ملک پاکستان میں پہلے مارشل لا کا نفاذ ہوا اور اختیارات فردِ واحد کے ہاتھ میں آگئے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں کو قید وبند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا اور ترقی پسند تحریک عملاً ختم ہو کر رہ گئی۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کے ذریعے سماجی اقدار کو بدلنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ جب یہ تحریک توانہ انداز میں سرگرم عمل تھی اس وقت بھی اس کے خلاف رد عمل سامنے آچکا تھا لیکن یہ رد عمل اس نوعیت کا تھا کہ کچھ نکات پر حلقہ ارباب ذوق کے جدیدیت پسندوں کو اختلاف تھا تو کچھ نکات پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیب حلقے سے وابستہ ادیبوں پر حرف زنی کرتے تھے۔ یعنی ایک دوسرے کی مکمل نفی دونوں میں سے کوئی بھی نہیں کرتا تھا۔ لیکن اب صورت حال مختلف تھی۔ ساٹھ کی دہائی کے نظم نگاروں نے جب "فردیت" کا نعرہ بلند کیا تو ایک لحاظ سے سماج سے رابطہ منقطع کر لیا اور اپنی ہی ذات کی غواصی کو کافی خیال کیا۔

1947 کے بعد ترقی پسند نظریہ فکر کے ساتھ ابھرنے والے شعراء میں جس شاعر کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی وہ احمد فراز ہی ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ احمد فراز نے ترقی پسند سوچ کو اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ انقلابی جذبے کے ساتھ استعمال کیا ہے، احمد فراز نے گرد و پیش کی ناہمواریوں، سیاسی چیرہ دستیوں اور آمرانہ سفاکیوں کی اپنے کٹیلے اور تیز لہجے سے دھجیاں اڑائی ہیں، انھوں نے سیاست دانوں اور حکمرانوں کی نمائشی وطن دوستی کی نقابیں اتار کر ان کے اصلی چہرے عوام کو دکھایے ہیں، اور اس طرح اپنی انسانیت پرستی کا مظاہرہ کیا ہے، انھوں نے نہ تو کبھی وطن کی مصنوعی

شان بڑھانے کے لیے جھوٹی اور نمائشی مدح و ستائش کی ہے اور نہ ہی اس سے اظہار محبت کے بے روح ترانے پیش کیے ہیں، بلکہ اپنے وطن کی آزادی و بقااور استحکام و ترقی کے لیے فکر و نظر کے حقیقی زاویوں کا تخلیقی شعور دیا ہے، ان کے نزدیک ملک پاکستان کی قسمت کا راز ایک ایسے نظام اور معاشرے میں پنہا ہے جو حقیقی طور پر غیر طبقاتی اور عدل و مساوات کا داعی ہو، وہ اپنے اس نظریے پر دل و دماغ کی پوری صحت کے ساتھ آخر تک قائم رہے، انھوں نے اپنی ذات پر ہر طرح کے ظلم و ستم برداشت کیے تاہم قلم کے ناموس اور فن کی حرمت پر حرف نہیں آنے دیا جس کی وجہ سے انکا قلم ہمیشہ ہی سرخ رو رہا، ان کی آزاد نظم "قلم سرخ رو ہے" کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

قلم سرخ رو ہے

کہ جو اس نے لکھا

وہی آج میں ہوں

وہی آج تو ہے

قلم نے لکھا تھا

کہ جب بھے زبانوں پہ پہرے لگے ہیں

تو بازو سنا تو لتے ہیں

کہ جب بھی لبوں پر خموشی کے تالے پڑے ہوں

تو زنداں کے دیوار و در بولتے ہیں

کہ جب حرف زنجیر ہوتا ہے

شمشیر ہوتا ہے آخر

تو آمر کی تقدیر ہوتا ہے آخر

کہ جو حرف ہے زیست کی آبرو ہے

(قلم سرخ رو ہے)

اس طرح احمد فراز کا قلم اپنے عہد کے اجتماعی شعور اور اپنی عصری زندگی کی آبرو کا آئینہ دار ہے ان کی شاعری ان کے عہد کے تاریخ وسماج سے ماخوذ ہے جس میں افلاس، استحصال، جبر وستم کا پردہ چاک کیا گیاہے اور مظلوم ومقہور انسانوں کی کراہتی ہوئی زندگی کے جذبات واحساسات کی عکاسی گئی ہے۔
پاکستان اور بنگلا دیش کی تقسیم کا المیہ " قومی پندار اور قومی تشخص کے جس شدید اور دردناک دھچکے کا سبب بنااس کے چرچے احمد فراز نے اپنی روح کی گہرایوں تک محسوس کیااور اسے محض معروضی سانحہ سمجھ کر غیر شعری چیز خیال نہیں کیا بلکہ اس قومی واردات کو وارداتِ قلب بنایا اور خود احتسابی پر زور دیتے ہوئے المیے کے داخلی وخارجی محرکات وعوامل کا تجزیہ کیاجو احمد فراز کی سچی اور کھری حقیقت شناسی اور حقیقت بیانی کی بین دلیل ہے۔ دو قومی نظریوں کو ضعف پہنچنے اور وحدت کے بکھرنے کا کرب کس قدر روح فرسا تھااس کا اندازہ نظم "سحر کے سورج" کی حسب ذیل لائنوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے

سحر کے سورج

میں اپنے پیکر کی نصف تصویر ہو گیا ہوں

میں آپ ہی اپنی تقصیر ہو گیا ہوں

میں آپ ہی اپنی تحقیر ہو گیا ہوں

میں اسم تقصیر ہو گیا ہوں

میں اپنا آدھا بدن لئے کس طرف کو جاؤں

کسے دکھاؤں

یہ شیشئہ جاں کی کرچیاں

اپنے خواب ریزے کہاں چھپاؤں

میں اپنی وحدت کہاں سے لاؤں

احمد فراز اس المیے کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنے کی بجائے اپنی قوم اور قوم کے ارباب حل وعقد پر ڈالتے ہیں۔ انہیں اس امر کا شعور ہے کہ اپنی کمزوریاں ہی دوسروں کی مضبوطیاں بنتی ہیں۔ دشمنوں کی سازشوں کے مقابلے میں اپنے غلط فیصلے اپنے خلاف سب بڑی سازش ثابت ہوتے ہیں۔ لہذا اوروں کو

دوش دینے سے پہلے اپنے آپ کو دوش دینا زیادہ بنتا ہے۔ نظم "میں تیرا قاتل ہوں" کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

میں ترا قاتل ہوں

اے مشرق مجھے مصلوب کر

میں جو عیسی کے لبادے

میں ترے بیمار فرزندوں کے گھر آیا تھا

کل چارہ گری کے واسطے

میں نے ان سے کیا کیا

میں کہ درماں بن کے آیا تھا

ترے ناسور زخموں کے لئے

بارود کا مرہم

بندوق کا پرچم لئے

میرے بوجھل بوٹ

جن کی چاپ

تیرے چوبداروں سی تھی

اب کی بار ایسے زلزلے لائے

کہ تیرے ہنستے بستے شہر ملبے بن گئے

اس طرح احمد فراز کا قلم سچائی کے اظہار میں کسی مصلحت کو آڑے نہیں آنے دیتا۔ یہ قلم صرف سماجی و تاریخی سچائیوں کو پیش نہیں کرتا بلکہ دائمی مگر سفاک سچائیوں کے اظہار میں بھی فخر و انبساط محسوس کرتا ہے۔ نظم میں "اکیلا کھڑا ہوں" کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

پیمبر!

تری بارگاہ معلٰی میں

عصیاں کے انبار سے سر نگوں

اک گنہگار انساں کھڑا ہے

نہ اس کے بدن پر عبا و قبا ہے

نہ ہاتھوں میں تسبیح کا سلسلہ ہے

نہ ماتھے پہ محراب داغ ریا ہے

یہ وہ بد مقدر ہے

جس کا بدن بارش سنگ خلقت سے

غربال ہے

جس کی گردن میں طوق ملامت پڑا ہے

یہ زندہ گڑا ہے

یہ مجرم ہے ان دائمی اور سفاک سچائیوں کا

کہ جو تونے کاذب جہاں کو عطا کیں

سفاک سچائیوں کے اظہار کے جرم کی "سفاکی" کا عالم یہ ہے کہ احمد فراز کا قلم جھوٹی مذہبیت ' محراب و منبر سے فتویٰ گر و فتنہ پرداز اور دینار و درہم کے حرص میں صحیفوں کے ورق فروخت کرنے کے بہیمانہ عمل کے پس پشت پوشیدہ ریاکاری کی نقابیں اٹھانے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے چنانچہ فراز جھوٹی روحانیت کی تاریکی کو سچی روحانیت کی روشنی میں بدلنے کے لیے "روشنی کے پیمبر" سے حوصلے کی فریاد کرتے ہیں

اے روشنی کے پیمبر

یہ شوریدہ سر

حرف زن ہے

کہ محراب و منبر سے

فتویٰ گر و فتنہ پردازِ دیں

حرف حق بیچتے ہیں

فقیہان مسند نشیں

حرص دینار و درہم میں

تیرے صحیفے کا اک اک ورق بیچتے ہیں

یہ خلقت کا خوں

اور اپنی جبیں کا عرق بیچتے ہیں

پیمبر !

مجھے حوصلہ دے

کہ میں ظلم کی قوتوں سے

اکیلا لڑا ہوں

کہ میں اس جہاں کے جہنم کدے میں

اکیلا کھڑا ہوں

فراز پیمبر زماں و مکاں سے حوصلے کی خیرات اس لیے مانگتے ہیں کہ انھیں اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ متاع بے بہا انھیں کے در اور گھر سے مل سکتی ہے، چنانچہ انھیں یہ سرمایہ شرف و بقا خانو دہ رسول کی ایک لازوال اور سب سے عظیم انقلابی شخصیت "امام حسین" سے مل جاتا ہے چنانچہ ان کی نظم "سلام اس پر" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

حسین !

اے میرے سر بریدہ

بدن دریدہ

سدا ترا نام بر گزیدہ

میں کربلا کے لہو لہو دشت میں تجھے

دشمنوں کے نرغے میں

تیغ دردست دیکھتا ہوں

مسافران رہِ وفا لٹا چکے ہیں

اور اب فقط تو

زمین کے اس شفق کدے میں

ستارہ صبح کی طرح

روشنی کا پرچم لئے کھڑا ہے

فتح محمد ملک کہتے ہیں

"فراز نے ہمیشہ مذہب کی رسمیات سے کہیں بڑھ کر اسلام کی حقیقی انقلابی روح کو اپنے گردوپیش کی زندگی میں کارفرمادیکھنے کی تمناؤں کی صورت کا فریضہ سر انجام دیا ہے ، ایسے میں وہ مسلمانوں کے ادب میں مجاز اور حقیقت کی عشقیہ روایت کو عصری زندگی کے تقاضوں کے مطابق تفسیر کرنے میں مصروف رہے ہیں"7

احمد فراز تاریخ کے اس قدر زیرک اور باشعور قاری ہیں اور تاریخ کی لازوال کروٹوں اور فیصلہ کن موڑوں کے اتنے گہرے نبض شناس ہیں کہ انھیں تاریخ عالم میں کربلا کا کردار محض ایک داستان یاواقعہ معلوم نہیں دیتابلکہ انسانی رفعتوں کی تاریخ کے سفر کا تاریخ ساز آغاز دکھائی دیتاہے اور کربلا انھیں عظیم انسانیت کا بلیغ ستارہ نظر آتی ہے، نظم "سلام اس پر" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں

یہ ایک منظر نہیں ہے

اک داستاں کا حصہ نہیں ہے

اک واقعہ نہیں ہے

یہیں سے تاریخ

اپنے تازہ سفر کا آغاز کر رہی ہے
یہیں سے انسانیت
نئی رفعتوں کو پرواز کر رہی ہے

ظاہر ہے کہ کربلا کا کردار اسلام کے کردار کا ایک حصہ ہے، کربلا کو محض ایک واقعہ نہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام بھی فقط ایک واقعہ نہیں ہے لہذا اسلام کا ظہور تاریخی عمل کی ایک ناگزیر ضرورت کا نتیجہ ہے، یوں احمد فراز پر بعض مذہبی حلقوں کی طرف سے جو اسلام سے بے زاری اور اسلام دوری کے فتوے لگتے ہیں ان کی قلعی کھل جاتی ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ احمد فراز بھی اسلام کے انقلابی کردار کی انسانی معنویت کو نسبتاً زیادہ ممتاز درجہ تفویض کرتے ہیں۔ اور فکر کی انقلابی رسائی کبھی لکیر کی فقیر نہیں ہوتی۔ وہ تاریخی اور سماجی تقاضوں کے مطابق مثبت و صالح قدروں کو تو حرز بنا کر رکھتی ہے لیکن منفی اور بیمار اقدار کو مٹانے پر زور دیتی ہے، فراز ایک ایسے شاعر ہیں جو مجرد خیالات کو شعری لباس پہنانے پر یقین نہیں رکھتے بلکہ شعری مواد اور ذہنی تغزیے کو زندگی کے مسائل اور وسائل سے اخذ کرتے ہیں ،انسانی جبلتوں اور انسانی نفسیات کے ساتھ ساتھ انھیں انسانوں کے اقتصادی و سماجی، تہذیبی و تمدنی اور سیاسی و انسانی تقاضوں کا بھی پورا پورا احساس ہے، فکر واحساس کی یہ اجتماعیت ہی ان کی انفرادیت ہے، احمد فراز کی درج بالا آزاد نظموں سے ثابت ہوتا ہے کہ فنی لحاظ سے ان میں نغمہ و غنا کی ایک ایسی خوش گوار فراوانی ہے جس سے آزاد نظم کے مصرعے رسیلے ہو گیے ہیں،

احمد فراز کی نظم ہر حوالے سے غزل کے مقابلے میں مضبوط ہے۔ انھوں نے ہر ہیئت میں نظم لکھی۔ رومانی حوالے سے ان کے ہاں خوبصورت نظمیں ملتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انقلابی روے بھی اپنی جگہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ خاص کر پاکستان کے مختلف المیے مثلاً جو کچھ ضیاء کے دور میں ہوا یا ۵۶ کا المیہ ہو یا اے کا المیہ یا کراچی کے حالات ہوں سب کا ذکر ان کی نظم میں ملتا ہے۔

ہم اُس قبیلہ وحشی کے دیوتا ہیں کہ جو
پجاریوں کی عقیدت پہ پھول جاتے ہیں
اور ایک رات کے معبود صبح ہوتے ہی

وفاپرست صلیبوں پہ جھول جاتے ہیں

نئے موضوعات کی روشنی میں جدید آہنگ کو اپناتے ہوئے قتل وخون کے مناظر، معاشرتی زبوں حالی اور ماحول کی بھرپور عکاسی ان کی نظموں کی شناخت بن گئی

کج کلاہوں سے کہدو کہ اے بے خبرو

طوق گردن سے نہیں طرہ دستار جدا

کوئے جاناں میں خاصہ تھا طرحدار فراز

لیکن اس شخص کی سج دھج تھی سردار جدا

فراز نے معاشرے میں پائے جانے والے عورتوں کے مسائل کو بھی اپنی نظموں میں بیان کیا ہے، ہمارے سماج میں لڑکیوں کو ایک ایسے مرد کے ساتھ رشتہ ازدواج میں باندھ دیا جاتا ہے جسے اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں ہوتا، لڑکی کے ہونٹوں پر شرم وحیا کی مہریں ہوتی ہیں، وہ ماں باپ کے فیصلے پر سر تسلیم خم کرتی ہے، وقت اور تقدیر اسے جس کے ساتھ وابسطہ کر دے وہ اس کے لیے وقف ہو جاتی ہے انھیں چیزوں کو فراز اپنی نظم "منسوبہ" میں ایسی لڑکی سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں، فراز اسے اس فیصلے پر سوچنے کی دعوت دیتے ہیں کیوں کہ ابھی بھی وقت ہاتھ سے نہیں نکلا نظم کا آخری بند ملاحظہ ہوں

سوچ ابھی وقت ہے حالات بدل سکتے ہیں

ورنہ اس رشتئہ بے ربط پہ پچھتائے گی

توڑ ان کہنہ رسومات کے بندھن ورنہ

جیتے جی موت کے زنداں میں اتر جائیگی

احمد فراز نے جن نظموں میں سیاست کے پہلو کو اختیار کیا ہے ان میں محض اپنے ملک پاکستان کی سیاست سے ہی سروکار نہیں رکھا بلکہ دیگر ممالک کی سیاسی تنظیموں کو بھی ہدف ملامت بنایا ہے اور وہاں کی عوام کے دکھوں پر افسوس کا اظہار کیا ہے ان کی نظم "سلامتی کونسل" میں بین الاقوامی تنظیم اقوام متحدہ کو ہدف ملامت بنایا گیا ہے جس کا قیام امن عالم کے تحت عمل میں آیا تھا مگر احمد فراز کے نزدیک اقوام متحدہ میں صرف طاقت ور ممالک کو ہی گویائی کا حق حاصل ہے نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

جب بھی آیا ہے کوئی کشتہ بیداد اسے
مرہم وعدہ فردا کے سوا کچھ نہ ملا
یہاں قاتل کے طرف دار ہیں سارے قاتل
خواہش دیدہ پر خوں کا صلہ کچھ نہ ملا
کاشمیر، کوریا، ویت نام دو منگن کانگو
کسی بسمل کو بجز حرفِ دعا کچھ نہ ملا

(سلامتی کونسل)

احمد فراز ایک اچھے غزل گو ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے نظم نگار بھی ہیں، یہ دونوں صلاحیتیں بہت کم شعراء میں یکجا ہوتی ہیں ایک اچھا غزل گو نظم کی وحدت تاثر، تسلسل اور ارتقائے خیال کو قائم نہیں رکھ سکتا اور ایک اچھا نظم نگار غزل کی خوبصورتی، اس کے اشعار کی اکملیت اور آفاقیت کو پا نہیں سکتا، جبکہ احمد فراز ابتدا ہی سے نظم اور غزل دونوں کے نئے امکانات کے متلاشی رہے۔

احمد فراز کی نظموں میں احتجاجی رنگ و آہنگ غزلوں کے مقابلے میں زیادہ واضح شکل میں ابھر کر آیا ہے غزلوں میں وہی بات جہاں استعاروں اور علامتوں میں کہی گئی تھی وہی نظموں میں اس کی وضاحت نظر آتی ہے، فراز نے اپنے پہلے مجموعے "تنہا تنہا" کی پہلی نظم "شاعر" میں اپنی شاعری کی غرض وغایت کو بہت واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اب فن مرا دربار کی جاگیر نہیں ہے
اب میرا ہُنر ہے مرے جمہور کی دولت
اب میرا جنوں خائفِ تعزیر نہیں ہے
اب دل پہ جو گزرے گی وہ بے ٹوک کہوں گا
اب میرے قلم میں کوئی زنجیر نہیں ہے

(شاعر تنہا تنہا)

احمد فراز کی نظمیں غم دوراں کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں اور ان کی کہی ہوئی بات " جو سنتا ہے اسی کی داستان معلوم ہوتی ہیں ان کی نظموں میں مضامین کے ساتھ ساتھ اسالیب کا تنوع بھی خوب ملتا ہے۔ قلم کی ناموس اور انسان کی حرمت کا تحفظ ہی احمد فراز کی شاعری کا دستور العمل رہا ہے لیکن اپنے شعری لہجہ کے امتیازات کو پانے کے لیے انھیں بڑی ریاضت کرنا پڑی ہے۔ فراز کی نظموں میں احساس کی ایسی شدید تخلیقی توانائی اور حسن ہے کہ عصری حقائق کی ترجمانی کے باوجود آج بھی ان میں ایک انوکھی تازگی محسوس ہوتی ہے، مثال کے طور پر "شہر آشوب" "نئی مسافت کا عہد نامہ" "قلم سرخرو ہے" وغیرہ جیسی نظمیں ان کی بہترین مثالیں ہیں، ان نظموں میں قلم اور قلم کی حرمت کا پرچم بلند نظر آتا ہے۔ فراز کی اکثر نظموں میں آزادی کا نوحہ نظر آتا ہے، کیوں کہ آزادی کے بعد جو صبح طلوع ہوئی وہ نہایت بھیانک اور خون آلود تھی۔ معاشرے کی ساری قدریں پامال ہو رہی تھیں غلط طبقاتی تقسیم نے سماج کو کئی ٹکڑوں میں بانٹ دیا تھا۔ حکومت کی باگ ڈور قاتلوں اور استحصالی قوتوں میں چلی گئی تھیں نظم "اب کس کا جشن مناتے ہو" میں پوری فضا مایوسی اور ناامیدی کی نظر آتی ہے، وطن پرستی، دوستی، ایثار، قربانی، غم خواری، ہمدردی، بلکہ پوری انسانیت کا مجموعہ اس نظم میں شاعر کے آنسوں سے ڈھلتا جاتا ہے اور جیسے جیسے نظم آگے بڑھتی جاتی ہے دکھ کا احساس اور بھی گہرا ہو جاتا ہے

اب کس کا جشن مناتے ہو
اس دیس کا جو تقسیم ہوا

اس خواب کا جو ریزہ ریزہ
ان آنکھوں کی تقدیر ہوا

اس پرچم کا جس کی حرمت
بازاروں میں نیلام ہوئی

اس جنگ کا جو تم ہار چکے
اس رسم کا جو جاری بھی نہیں

آنکھوں میں چھپائے اشکوں کو

ہونٹوں پے دفاع کے بول لئے

اس جشن میں میں بھی شامل ہوں

نوحوں سے بھرا کشکول لئے

(اب کس کا جشن مناتے ہو۔ جاناں جاناں۔)

جب وہ نظم کہتے ہیں تو اس کی بھی ایک ایک لائن برجستہ اور بے ساختہ ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ احمد فراز غزل اور نظم دونوں کے ایک ایسے شاعر ہیں جو دور حاضر کے گنے چنے معتبر ترین شعراء میں سے ہیں۔ تنہا تنہا میں موجود ان کی نظم "بانو کے نام" ملوکیت کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہے، انھوں نے عالمی سطح پر نااتفاقی، خودغرضی، نفرت،

ناانصافی اور انسان دشمنی کے عناصر پائے اور ان پر رد عمل کا اظہار کیا، اس حوالے سے "نابینا شہر میں آئینہ" میں شامل ان کی نظم "سرحدیں" اہمیت کی حامل ہے

کس سے ڈرتے ہو کہ سب لوگ تمہاری ہی طرح

ایک سے ہیں وہی آنکھیں وہی چہرے وہی دل

کس پہ شک کرتے ہو جتنے بھی مسافر ہیں یہاں

ایک ہی سب کا قبیلہ وہی پیکر وہی گل

ہم تو وہ تھے کہ محبت تھا وطیرہ جن کا

پیار سے ملتا تو دشمن کے بھی ہو جاتے تھے

اس توقع پہ کہ شاید کوئی مہماں آجائے

گھر کے دروازے کھلے چھوڑ کے سو جاتے

تھے

ہم تو آئے تھے کہ دیکھیں گے تمہارے قریے

وہ درو بام کہ تاریخ کے صورت گر ہیں

وہ ارینے وہ مساجد وہ کلیسا وہ محل

اور وہ لوگ جو ہر نقش سے افضل تر ہیں

روم کے بت ہوں کہ پیرس کی ہو مونالیزا

کیٹس کی قبر ہو یا تربت فردوسی ہو

قرطبہ ہو کہ اجنتا کہ موہنجو داڑو

دیدۂ شوق نہ محروم نظر بوسی ہو

کس نے دنیا کو بھی دولت کی طرح بانٹا ہے

کس نے تقسیم کئے ہیں یہ اثاثے سارے

کس نے دیوار تفاوت کی اٹھائی لوگو

کیوں سمندر کے کنارے پہ ہیں پیاسے

سارے

(سرحدیں)

فراز نے "دوسری ہجرت"، "منصور"، "سحر کا سورج" اور "بیروت" جیسی نظموں میں لفظوں کے کاسوں میں دل کا لہو انڈیل دیا ہے۔ نظم "سحر کا سورج" ملاحظہ ہو

سحر کے سورج

میں رو رہا ہوں

کہ میرا مشرق لہو لہو ہے

وہ میرا شوق

جو میرا بازو ہے میرا دل ہے مری نمو ہے

جو میرے اطراف کا نشاں

میری آبرو ہے

لہو لہو ہے

سحر کے سورج

میں نصف تاریک

نصف روشن ہوں

کیا ہوا ہے

تجھے گہن لگ گیا

کہ میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے

تری شعاعوں کا نور اندھیروں میں گھٹ گیا ہے

کہ آج ہر رشتۂ رفاقت ہی کٹ گیا ہے

سحر کے سورج

میں اپنے پیکر کی نصف تصویر ہو گیا ہوں

میں آپ ہی آج اپنی تحقیر ہو گیا ہوں

میں اسمِ تصفیر ہو گیا ہوں

میں اپنا آدھا بدن لیے کس طرف کو جاؤں

کسے دکھاؤں

یہ شیشۂ جاں کی کرچیاں

اپنے خواب ریزے کہاں چھپاؤں

میں اپنی وحدت کہاں سے لاؤں

سحر کے سورج

ستم کی آندھی رُکے

تو میں یہ اُجاڑ آنکھیں جھپک سکوں گا

سسک سکوں گا

لہو کی بارش تھمے

تو میں اس دُکھی بدن کو تھپک سکوں گا
ابھی تو میں جانکنی کے دُہرے عذاب میں ہوں
جو بجھ چکے وہ چراغ دیکھوں
کہ اپنے ماتھے کا داغ دیکھوں
سحر کے سورج
مری نظر میں تو ان رفیقوں کے قافلے ہیں
جو گھر سے نکلے تھے سر اُٹھائے قدم جمائے
جو منتظر تھے
کہ رزم گاہِ طلب بُلائے
جو آزمائش کی ہر گھڑی میں
یقین کی مشعلیں جلائے
وطن کی ناموس کے لئے
بے شمار بازو علم اُٹھائے
رواں ہوئے تھے یہ عہد کر کے
کہ ان کی جانیں رہیں کہ جائیں
مگر وفا پر نہ حرف آئے
سحر کے سورج
مری نظر میں انہی رفیقوں کے قافلے ہیں
کہ جن کا پندار ریزہ ریزہ
کہ جن کے ماتھے عرق عرق ہیں
جو پابہ زنجیر
منفعل گردنیں جھکائے

عدو کے نرغے میں

ان اندھیروں کی سرزمیں کی طرف رواں ہیں

جہاں حقارت کے طعن

نفرت کے سنگ

رسوائیوں کے بازار

منتظر ہیں

سحر کے سورج

یہ میں نہ دیکھوں

یہ تو نہ دیکھے

یہ جاں نثاروں شہید یاروں کا چمچماتا لہو نہ دیکھے

یہ میں نہ دیکھوں

یہ تو نہ دیکھے

(سحر کے سورج)

فراز کی نظم " بیروت " میں جہاں عمدہ الفاظ کا استعمال کیا ہے وہیں مظلوموں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار بھی ہے ، احمد فراز کا خاص وصف ہے کہ ان کی ہمدردی اپنے ملک کے مظلوموں تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ پورے عالم کے انسانوں اور مظلوموں کی آہوں کو محسوس کر کے غمزدہ اور بے چین نظر آتے ہیں ،عالمی پس منظر میں ان کی یہ نظم "بیروت "نہایت اہم ہے

یہ سر بریدہ بدن ہے کس کا

یہ جامئہ خوں کفن ہے کس کا

یہ زخم خوردہ ردا ہے کس کی

یہ پارہ پارہ صدا ہے کس کی

یہ کس لہو سے زمین یاقوت بن گئی ہے

یہ کس کی آغوش کس کا تو بات بن گئی ہے
یہ کس نگر کے سپوت ہیں / جو دیار نگار میں کھڑے ہیں

(بیروت)

ان کی شاعری میں امریکہ کے خلاف کھل کر اظہار ملتا ہے "خواب گل پریشاں ہے" میں موجود بڑی اہم نظم "کالی دیوار" ہے جس میں کھل کر امریکہ کی تنقید کی ہے۔

کل واشنگٹن شہر کی ہم نے سیر بہت کی یار
گونج رہی تھی سب دنیا میں جس کی جے جے کار
ملکوں ملکوں ہم گھومے تھے بنجاروں کی مثل
لیکن اس کی سج دھج سچ مچ دل داروں کی مثل
روشنیوں کے رنگ بہیں یوں رستہ نظر نہ آئے
من کی آنکھوں والا بھی یاں اندھا ہو ہو جائے
اونچے بام چراغاں رستے روپ بھرے بازار
جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے خوابوں کا سنسار
ایک سفید عمارت جس کی نگر نگر میں دھوم
اندر دنیا بھر کی کالک باہر سے معصوم
یہی سفید عمارت جس میں بہت بڑی سرکار
یہیں کریں سوداگر چھوٹی قوموں کا بیوپار
یہیں پہ جادوگر بیٹھا جب کہیں کی ڈور ہلائے
ہر بستی ناگاساکی ہیروشیما بن جائے
اسی عمارت سے کچھ دور ہی اک کالی دیوار

لوگوں کا میلہ ایسا لگا تھا جیسے کوئی تیوہار

اس کالی دیوار پہ کندہ دیکھے ہزاروں نام

ان ناموں کے بیچ لکھا تھا شہدائے وتنام

آس پاس تو جمع ہوا تھا خلقت کا انبوہ

سب کی آنکھوں میں سناٹا چہروں پر اندوہ

بیکل بہنیں گھائل مائیں اور دکھی بیوائیں

ساجن تم کس دیس سدھارے سوچیں محبوبائیں

اپنے پیاروں دل داروں کا او جھل مکھڑا ڈھونڈیں

اس کالی دیوار پہ ان کے نام کا ٹکڑا ڈھونڈیں

دلوں میں دکھ آنکھوں میں شبنم ہاتھوں میں پھول اٹھائے

اس ناموں کے قبرستان کا بھید کوئی کیا پائے

نا تربت نا کتبہ کوئی نا ہڈی نا ماس

پھر بھی پاگل نیناں کو تھی پیا ملن کی آس

کہیں کہیں اس کالی سل پر کوئی سفید گلاب

یوں بے تاب پڑا تھا جیسے اندھی آنکھ کا خواب

کانٹا بن کر سبھی کے دل میں کھٹکے ایک سوال

کس کارن مٹی میں ملائے ہیروں جیسے لال

ہو چی من کے دیس میں ہم نے کیا کیا ستم نہ ڈھائے

اس کے جیالے تو آزادی کا سورج لے آئے

لیکن اتنے چاند گنوا کر ہم نے بھلا کیا پایا

ہم بدقسمت ایسے جن کو دھوپ ملی نا سایا

مکھ موتی دے کر حاصل کی یہ کالی دیوار

یہ کالی دیوار جو ہے بس اک خالی دیوار

یہ کالی دیوار جو ہے ناموں کا قبرستان

واشنگٹن کے شہر میں دفن ہیں کس کس کے ارمان

"کالی دیوار" کے حوالے سے فتح محمد ملک اپنی کتاب "احمد فراز کی شاعری نغمہ دلدار یا شعلہ بیدار" میں لکھتے ہیں

" نظم کالی دیوار" ویتنام پر امریکی سامراجی یلغار کے خلاف احتجاج سے عبارت ہے "8

اور نظم "ویت نام" میں بھی امریکی سامراجی یلغار کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں

ویتنام

مجھے یقین ہے

کہ جب بھی تاریخ کی عدالت میں

وقت لائے گا

آج کے بے ضمیر و دیدہ دلیر قاتل کو

جس کے دامان و آستیں

خونِ بے گناہاں سے تر بتر ہے

تو نسلِ آدم

وفورِ نفرت سے روئے قاتل پہ تھوک دے گی

مگر مجھے اس کا بھی یقیں ہے

کہ کل کی تاریخ

نسلِ آدام سے یہ بھی پوچھے گی

اے مہذب جہاں کی مخلوق

کل ترے روبرو یہی بے ضمیر قاتل

ترے قبیلے کے بے گناہوں کو

جب تہہ تیغ کر رہا تھا

تو تو تماشائیوں کی صورت

خموش و بے حس

درندگی کے مظاہرے میں شریک

کیوں دیکھتی رہی اسے

تری یہ سب نفرتیں کہاں تھیں

بتا کہ اس ظلم کیش قاتل کی تیغ برّاں میں

اور تری مصلحت کے تیروں میں

فرق کیا ہے؟

تو سوچتا ہوں

کہ ہم سبھی کیا جواب دیں گے۔

اردو ادب خصوصا جدید شاعری میں سفر کے تجربے کو کسی بھی شاعر نے ایک سفر نامے کے طور پر کبھی قلم بند نہیں کیا" کشان بی بی" احمد فراز کا نظمیہ سفر نامہ ہے جو کہ ایک مکمل سفر نامہ ہے پورے اختصار کے ساتھ ہونے کے باوجود مکمل لوازمات سفر نامے کے ساتھ ایک اہم تخلیقی تجربہ ہے، اس سفر نامے میں وادیٔ کیلاش کے سفر نے احمد فراز کی نظموں میں ایک نیا رنگ اور نیا آہنگ بھرا ہے انھوں نے منظر نگاری اور واقعہ بیانی کے تسلسل میں کیلاش کے لوگوں کی محبتوں کا عکس بھی نمایاں طور پر دکھایا ہے۔

نظم کا آخری حصہ ملاحظہ ہو

بتانِ آذری کا رقص جاری تھا

فضا پر سحر طاری تھا

ہر اک کی آنکھ میں تل کی طرح

وہ کافرستاں کی قلوپطرہ

مگر ہم میں کوئی سیزر نہ انتونی

ضیا گوتم سہی

لیکن کشاں بی بی

وہ کافر جو ضیا کو بھی نہ سونپی جائے ہے مجھ سے

نہ جانے کس طرح یہ شب ڈھلی

لیکن سحر دم

جب پرندوں کے چہکنے کی صدا آئی

کشان بی بی

سیہ ملبوس میں لپٹی

جبیں پر کوڑیوں کا تاج

گالوں پر گھنی زلفیں

کنیزوں کی طرح اپنی رفیقوں کو لیے

رخصت ہوئی ہم سے

بصد اندازِ استغنا و دارائی

تو ہم سارے تماشائی تھے پتھر

اور پتھر تھے تماشائی

(کشان بی بی)

احمد فراز کی یہ نظم کشان بی بی نہ صرف ایک نئی طرز کا سفر نامہ ہے بلکہ حسن کے سامنے بے بس ہو کر بتانِ آزری کے رقص بے پایاں ک لازوال مثال بھی ہے، جہاں حسن محور رقص اور شاعر بے بس ہے

احمد فراز کی مذکورہ نظم داخلی وقت کے بیرونی دباؤ کی عکاسی ہے جس میں موجودہ دور کی شعری توانائی کو حاصل کرکے اساسِ شعریت کو بیدار کیا گیا ہے۔

فراز کی نظموں میں اپنے ملک سے لازوال محبت کا اظہار ہوتا ہے اور وہ ہر کٹھن وقت میں اپنی شاعری سے قوم کو سہارا دیتے ہوئے نظر آتے ہیں سقوطِ ڈھاکہ کے موقع پر قوم کے غم میں پوری طرح شریک تھے اور حوصلہ دیرے تھے۔

ہر طرف رواں دواں ظلمتوں کی آندھیاں

حادثے قدم قدم، راستے دھواں دھواں

مشعلیں بجھا گئیں روز و شب کی آندھیاں

پھر بھی اے مسافرو تم رہو رواں رواں

جس طرح غزل میں انھوں نے "شہر" کی علامت کو استعمال کیا ہے اسی طرح نظموں میں بھی "شہر" کی علامت کو استعمال کیا ہے مگر نظموں میں شہر کے کردار المیاتی کردار ہیں اور یہی المیاتی کردار فراز کی شاعری کے ایک بڑے حصے کو اپنے ساتھ سمیٹے ہوئے نظر آتے ہیں "بے آواز گلی کوچوں میں" اور پھر اس کے بعد "نابینا شہر میں آئینہ" ایسے مجموعے ہیں جو اس المئے کے کئ پہلو سامنے لاتے ہیں فراز نے اپنے شہر اور شہر کے لوگوں کی کیفیت کے بارے میں "بے آواز گلی کوچوں میں" میں لکھا ہے

سارا شہر بلکتا ہے

پھر بھی کیسا سکتا ہے

ہر کوئی تصویر نما

دور خلا میں تکتا ہے

گلیوں میں بارود کی بو

یا پھر کون مہکتا ہے

سب کے بازو یخ بستہ

سب کا جسم دہکتا ہے

(بے آواز گلی کوچوں میں)

فراز کی طویل نظموں میں، شاعر، کھنڈر، منصور، میری آنکھیں، مرا چہرہ لاؤ، شہر آشوب، لبِ گویا، سحر کے سورج، من و تو، پیشہ ور قاتلو، محاصرہ، اور شہر نامہ، وغیرہ میں مزاحمتی عناصر عروج پر ہیں۔

فراز نے ہر دور میں فوجی ہو یا جمہوری، سیاست دانوں، فوجی حکمرانوں، جمہوریت پرستوں، سرمایہ داروں، یا دیگر کرپٹ عناصر کے خلاف آواز اٹھانے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی مجموعی ناہموار صورت حال پر اظہار خیال کیا ہے، ان کی مزاحمت کا سب سے بڑا حوالہ مارشل لائی حکومت کے خلاف احتجاج اور مزاحمت ہے، انھوں نے ہر مارشل لائی حکومت کے خلاف آواز اٹھائی اور آمروں کی سختی سے مزمت کی، جنرل ایوب خان، جنرل یحییٰ خان، جنرل ضیاءالحق اور جنرل پرویز مشرف تمام کے ساتھ ان کی لڑائی ایک الگ نوعیت کی تھی۔

اسلوب کے حوالے سے دیکھا جائے تو فراز کے اسلوب پر علامت اور استعارے کا رنگ غالب نظر آتا ہے ان کی شاعری میں مزاحمتی جذبات کا اظہار مختلف علامتوں، استعاروں اور تلمیحاتی حوالوں سے ہوا ہے ان کے یہاں زیادہ مزاحمتی انداز ہے اور وہ بھی حکمران طبقے کے خلاف اس لئے ان کے اسلوب میں بھی حکمرانوں کے حوالے سے مختلف علامتیں اور استعارے موجود ہیں، یہ استعارے اور علامتیں الگ الگ نوعیت کی حامل ہیں، ان کے یہاں حکمران کے لئے غمخوار، شہریار، قاتل، سنگ، چارہ گر، غنیم، صیاد، بادل، امیر شہر، ملاح، رہبر، اور دشمن جیسے استعارے اور علامتیں ملتی ہیں

اک یہ بھی تو اندازِ علاج غم جاں ہے

اے چارہ گرو درد بڑھا کیوں نہیں دیتے

امیر شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب کبھی بنام وطن

جو ابر تھا تو اسے ٹوٹ کر برسنا تھا
یہ کیا کہ آگ لگا کر ہوا روانہ وہ

پھر قفس میں شور اٹھا قیدیوں کا اور صیاد
دیکھنا اڑا دیگا پھر خبر رہائی کی

فراز کے علامتی اور استعاراتی نظام میں ان کے وطن پاکستان کے لئے بھی مختلف علامتیں موجود ہیں۔ وہ اپنے ملک کے لئے گلستاں، چمن، شہر، ماں، میکدہ اور میخانہ جیسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں

دیکھنا لُو چلی کہ بادِ مراد
دوستو پھر چمن سلگتا ہے

یہ کیا گلشن ہے جس گلشن میں لوگو
بہاروں کا کوئی موسم نہیں ہے

اک فقیہ شہر کو کیا دوش دیجے جب سبھی
میکدے کے دشمنوں میں ہوں قدح خواراں سمیت

سنو کہ جب کوئی آئینِ گلستاں ہی نہیں

تو کوئی کیسے کرے باغبانئ صحرا

ماں مٹی نے خوں مانگا تھا اور بیٹے
پانی سے تالاب کو بھرتے جاتے ہیں

اب کہ شب گزری تو اک تیری میر بات نہیں
شہر کا شہر چراغ سحر ہے خاموش

مندرجہ بالا اشعار میں "چمن۔گلشن، میکدہ، گلستاں، ماں اور شہر جیسے الفاظ اپنے ملک پاکستان کے لیے علامت کے طور پر استعمال کیے گیے ہیں۔ فراز کی شاعری میں عوام کی خاموش اطاعت کے خلاف بھی شدید رد عمل نظر آتا ہے، ان کے یہاں یہ تمام عناصر "تنہا تنہا" سے لیکر "اے عشق جنوں پیشہ "تک مسلسل نظر آتے ہیں فراز نے چونکہ ساری عمر عوام دوستی کے جذبے کو مد نظر رکھتے ہوئے گزاری اور ہر لمحہ عوام کا ساتھ دیا، عوام ہی کے حقوق کے لیے آمروں، جابروں اور سیاست دانوں کے ساتھ لڑتے جگھڑتے رہے، اس لیے وہ عوام سے بھی توقع رکھتے تھے کہ عوام بھی ان کی آواز میں آواز ملایے۔ ان کو کبھی یہ گوارا نہیں ہوا کہ عوام محض خاموش تماشائی بن کر ظلم و ستم کا تماشا دیکھتے رہیں، چنانچہ انھوں نے مارشل لائی ادوار میں عوام کو جگانے کی ضرورت شدت سے محسوس کی اور مختلف نظمیں لکھیں۔ مصلحت کوش اہل قلم کے خلاف فراز کا رویہ کافی سخت رہا، یہ سلسلہ "تنہا تنہا" سے لیکر "اے عشق جنوں پیشہ "تک مسلسل جاری و ساری نظر آتا ہے، چنانچہ وہ قت کے تقاضے کے مطابق اپنے ہم پیشہ و ہم مشرب کو آواز دیتے ہیں اور جابر حکمران اور حالات کی ناہمواری پر قلم اٹھانے کی تلقین کرتے ہیں، لیکن ان میں زیادہ تر مصلحت کی چادر اوڑھ کر کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں، ان کو سخت تکلیف ہوتی ہے جب ان کے اہل قلم دوست بک جاتے ہیں یا امید لطف پہ دربار میں سربسجود ہو جاتے ہیں اس حوالے سے ان کی نظم "خیر مقدم "کافی اہم ہے

قصیدہ نویسوں نے مل کر یہ سوچا

کہ پھر آج وہ ساعتِ جانستاں آگئی ہے

جب اُن سے کوئی اُن کا آقا جُدا ہو رہا ہے

وہ آقا؟

کہ جس کی مسلسل کرم گستری سے

کوئی خادمِ خاص ہو یا کہ ادنیٰ ملازم

کسی کے لبوں پر کبھی کوئی حرفِ شکایت نہ آیا

وہ آقا کہ جس کی کشادہ دلی نے خزانے لٹائے

وہ آقا کہ جس کی سخاوت نے سب کے دلوں اور دماغوں

سے حاتم کے مفروضہ قصّے بھلائے

اگرچہ وہ نوشیرواں کی طرح شہر میں کوبکو

بھیس بدلے نہیں گھومتا تھا

مگر پھر بھی ہر سمت امن واماں تھا

اگرچہ جہانگیر کی طرح اُس نے

کوئی ایسی زنجیرِ زر قصرِ شاہی کے باہر نہ لٹکائی تھی

جس کی ہلکی سی جنبش بھی انصافِ شاہی میں طوفاں اُٹھاتی

مگر پھر بھی ہر گھر میں عدل و مساوات کا سائباں تھا

اگرچہ کبھی وہ جھروکے میں بیٹھے

رعایا کو رُوئے مبارک کے درشن سے مجبورِ سجدہ نہ کرتا

مگر پھر بھی ہر دل پہ وہ حکمراں تھا

وہ جانِ جہاں تھا بڑا مہرباں تھا

قصیدہ نویسوں نے سوچا

کہ آخر وہ لمحات بھی آ گئے ہیں

جب اُن سے بچھڑنے کو ہے اُن کا دیرینہ آقا

تو وہ آج اُسے کون سا ایسا نایاب تحفہ کریں پیش جس سے

رہیں تا ابد یاد آقائے عالی کو

اپنے وفادار پاپوش بردار خادم

قصیدہ نویسوں نے سوچا

کہ وہ یوں تو عہدے میں ہیں

قصرِ شاہی کے جارُوب کش سے بھی کہتر

مگر عالمِ کلک و قرطاس کے بادشہ ہیں

وہ چاہیں تو اپنے قلم کے اشارے سے

ذرّوں کو ہم رُتبۂ مہر و مہتاب کریں

وہ چاہیں تو اپنے تخیل کے جادو سے

صحراؤں کے خشک سینوں کو پھولوں سے بھر دیں

وہ چاہیں تو اپنے کمالِ بیاں سے

فقیروں کو اورنگ و افسر کا مالک بنا دیں

وہ چاہیں تو اپنے فسونِ زباں سے

محلاّت کے بام و دیوار ڈھا دیں

وہ چاہیں تو یکسر نظامِ زمانہ بدل دیں

کہ وہ عالمِ کلک و قرطاس کے بادشہ ہیں

یہی ہے وہ ساعت کہ وہ اپنے

محبوب آقا کی تعریف و توصیف میں

آسمان و زمیں کو ملائیں!

کہ وہ اپنی اپنی طبیعت کے جوہر دکھائیں

کہ وہ اپنے آقا سے بس آخری مرتبہ داد پائیں
مگر پھر قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ وہ تو ہیں عہدے میں ایوانِ شاہی
کے جاروب کش سے بھی کہتر
انہیں کیا کوئی آئے یا کوئی جائے
کہ اُن کا فریضہ تو ہے صرف
آقائے حاضر کی خدمت گزاری
کہ ان کا فریضہ فقط تاج اور تخت کی ہے پرستش
تو پھر مصلحت ہے اِسی میں
کہ اپنے قصیدوں سے آقائے نو کا کریں خیر مقدم!

اس کے علاوہ "سفید چھڑیاں" اور "اے میرے وطن کے خوش نواؤ" ایسی نظمیں ہیں جن میں مصلحت کوش اہل قلم کے خلاف بغاوت کا رنگ نظر آتا ہے چنانچہ مصلحت کوشوں کے لیے فراز "حرف فروش، ضمیر فروش، بردہ فروش، منافق، غدار بہروپیے اور نقاب پوش جیسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں نظم "سفید چھڑیاں ملاحظہ ہو

جنم کا اندھا
جو سوچ اور سچ کے راستوں پر
کبھی کبھی کوئی خواب دیکھے
تو خواب میں بھی
عذاب دیکھے
یہ شاہراہ حیات جس پر
ہزارہا قافلے رواں ہیں
سبھی کی آنکھیں

ہر ایک کا دل

سبھی کے رستے

سبھی کی منزل

اسی ہجوم کشاں کشاں میں

تمام چہروں کی داستاں میں

نہ نام میرا

نہ ذات میری

مرا قبیلہ

سفید چھڑیاں

مختصر یہ کہ ان کی شاعری زندگی کی مختلف جہتوں کا پورے نظم وضبط کے ساتھا احاطہ کرتی ہے ، وہ نہ صرف ملکی سطح پر، بلکہ بین القوامی سطح پر بھی ظلم وستم کے خلاف نبرد آزما رہے ، وہ ظلم وجبر کے خلاف آواز بلند کرنا ضروری قرار دیتے ہیں اور ان اکا یہ رویہ آنے والے زمانے میں حیاتِ نو کے لیے نئے امکانات روشن کرتا ہے ، وہ بہادری اور دلیری کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے ہیں اور ہر قسم کی منفی طاقتوں کے ناپاک عزائم کے خلاف مردانہ وار ڈٹ جاتے ہیں ان کے یہاں یاسیت ، مایوسی اور قنوطیت کے بجایے امید ورجائیت کا پیغام موجود ہے۔

حوالہ جات

1. کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ نایافت کافلیپ۔ کاک پرنٹرس دہلی۔2002
2. فتح محمد ملک، تحسین وتردید لاہور سنگ میل پبلی کیشنز1995ص149
3. (بے آواز گلی کوچوں میں بیک فلیپ بحوالہ ماہ نو2008ص:219
4. (بحوالہ احمد فراز نمبر "ماہ نو" جنوری2009ڈائرکٹوریٹ جنزل آف فلمز اینڈ پبلیکیشنز وحدت روڈلاہور:ص337)
5. (دیباچہ "خواب گل پریشاں ہے "احمد ندیم قاسمی بحوالہ ماہ نو جنوری2009ڈائرکٹوریٹ جنزل آف فلمز اینڈ پبلیکیشنز وحدت روڈلاہور:ص330))
6. (دنیاترے بارے میں مرے خواب بہت تھے: زاہد حسن۔ماہ نو جنوری2009ڈائرکٹوریٹ جنزل آف فلمز اینڈ پبلیکیشنز وحدت روڈلاہور:ص187)
7. فتح محمد ملک: احمد فراز کی شاعری نغمہ دلدار یاشعلہ بیدار گلوبل پرنٹر،2012۔ص:23
8. فتح محمد ملک: احمد فراز کی شاعری نغمہ دلدار یاشعلہ بیدار گلوبل پرنٹر،2012۔ص:19

ماحصل

برصغیر ہندوپاک کی تقسیم ایک ایساحادثہ ہے، جس کا اثر برصغیر ہندوپاک میں آج تک محسوس کیاجارہاہے، تقسیم کی وجہ سے دنیاکی سب سے بڑی آبادی مذہب ونسل کے نام پر نقل مکانی پر مجبور ہوئی ، جس کے نتیجے میں ہجرت کے دوران بدترین فسادات عمل میں آئے ، انسانیت حیوانیت میں تبدیل ہوچکی تھی، پورابرصغیر بدترین دور میں داخل ہوچکا تھا یہ عہد ترقی پسند تحریک کے شباب کازمانہ تھااور اس کے اثرات ادب کے علاوہ سیاست، ثقافت اور سماج پر بھی مرتب ہورہے تھے، مذکورہ دور پاکستان کے لئے ایک مبسوط پاکستانی قوم کی تشکیل کادور تھا، چونکہ ایک نیاملک جو دنیاکے نقشے پرابھی ابھی ابھرا تھا، وہ قومی خدوخال مرتب کرنے کی کوشش کررہاتھالیکن وہ ابھی بھی اپنے پیروں پر کھڑانہیں ہوسکاتھا کہ اس کی بدقسمتی کے دن شروع ہوگئے، سیاسی افراتفری اور ملکی سطح پر پھیلی بدامنی اور بے چینی کی ایسی کیفیت تھی جس کافائدہ اٹھاکر وہاں 1958ء میں تربیت پارہی جمہوریت کاگلا گھونٹ کر مارشل لانافذ کردیاگیا، جس کاردعمل ملاجلارہامعاشرے کے ایک طبقے نے یہ امید قائم کرلی کہ شائد پاکستان اب کسی نہ کسی راستے کا انتخاب کرہی لیگا، حالانکہ یہ محض خوش فہمی تھی۔ اس موقع پر کچھ ادیب حضرات تو مصلحت کی خاطر خاموشی اختیار کرگئے۔ کچھ بک گئے، جھک گئے۔ ڈر کے مارے دل کی بات زبان پر لانے سے کترانے لگے۔ لیکن کچھ شاعر وادیب ایسے بھی

سامنے آگئے کہ ہمت اور حوصلے کے ساتھ اس دور کے تمام ناقابلِ قبول امور کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کااظہار کرنے لگے۔ فرازؔ جیسے حساس دل رکھنے والے شاعر بھی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اُنھوں نے اس دور حکومت کی ناقص پالیسیوں، سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کی بے حسی، برائے نام جمہوریت، عدم مساوات، ظلم وستم، انسانی حقوق کی پامالی اور آمریت کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ انھوں نے ہر طرح سے اس سیاسی انارکی، کی مخالفت کی ان حضرات نے احتجاج کی آواز بلند

کی جن میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی حبیب جالب اور احمد فراز وغیرہ اہم ہیں، جو اپنے مخصوص لہجے میں جبر واستبداد کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔

احمد فراز14 جنوری 1931ء کو صوبۂ سرحد میں واقع نوشہرہ (پشاور) میں پیدا ہوئے۔احمد فرازؔ کا تعلق کوہاٹ کے ایک معروف اور کثیر التعداد خانوادے میاں خیل سے تھاجو ایک معزز سید خاندان سمجھا جاتاہے، ان کے آباؤ واجداد میں حاجی بہادر نامی ایک صوفی منش بزرگ گزرے تھے آپ کے پر داداکا مزار کوہاٹ شہر کے وسط میں آج بھی خاص و عام کی زیارت گاہ ہے اور اس سے متصل ایک قبرستان ہے جو ان کا آبائی قبرستان ہے جس میں صرف آپ کے گھرانے کے لوگ مدفون ہیں۔احمد فراز نے ادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں ، فراز کے والد اردو اور فارسی کے بڑے ادیب تھے جس کی وجہ سے ان کے یہاں شیخ سعدی ، بیدل ، حافظ شیرازی ، اور مرزا غالب کے چرچے بچپن سے وہ سنا کرتے تھے۔

فراز کو شاعری ورثے میں ملی تھی ، فراز کی شاعرانہ قد و قامت میں ان کے والد کا بڑا ہاتھ ہے ،فراز کے والد برق کوہاٹی پشاور کے محلہ ناصر طاہر وردی عرف کوچہ رسال دار عقب قصہ خوانی میں جنم لینے والی اس خطے کی اولین ادبی انجمن "بزم سخن "کے لئے سر گرم عمل تھے اس زمانے میں برق کوہاٹی کے ادبی حریف ضیاء جعفری " دائرۂ ادبیہ " چلاتے تھے ، برق کوہاٹی " بزم سخن "کے اور ضیا جعفری " دائرۂ ادبیہ " کے صدر نشین تھے ، فراز کا شاعری کے ابتدائی دور میں " بزمِ سخن "میں اٹھنا بیٹھنا تو تھا ہی اس کے ساتھ ساتھ وہ دائرۂ ادبیہ میں بھی شرکت کرتے رہے ۔مذکورہ بالا دونوں انجمنوں کے اختتام پر پشاور کی ادبی محفلیں فارغ بخاری کے قائم کردہ ان کے مکان کی بیٹھک میں منعقد ہونے لگیں ، پشاور کے شعر و ادب کی ترقی ترویج میں اس بیٹھک کا بڑا ہاتھ ہے یہ ادبی بیٹھک قصہ خوانی ،پشاور کے محلہ خدا داد میں واقع تھی ، تقریبا پچیس برس تک یہ بیٹھک علم وفن کا مرکز بنی رہی اس بیٹھک میں احمد فراز کی ادبی سر گرمیاں شروع ہوئیں۔فراز بھر پور سیاسی شعور کے

مالک تھے ، وہ پاکستانی سیاست اور سیاست دانوں کی نفسیات سے خوب واقف تھے ، قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں ہونے والے سیاسی اتار چڑھاؤ پر شروع سے ہی ان کی نظر گہری تھی چونکہ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا اس لئے بھی عوام دشمن سیاست دان اور سرمایہ دار زیادہ ان کے زیر عتاب رہے ، دوسرے یہ کہ جو لوگ شریک سفر نہ تھے زمام کار کا ان کے ہاتھوں میں آنا سب کے لئے پریشانی اور غم وغصے سے خالی بات نہیں تھی ۔

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے زمانے میں فراز نے مختلف ادباء و شعرا کو ظلم وجبر کے خلاف آواز اٹھانے کی ترغیب دی ، انھوں نے نہ صرف ببانگِ دہل آواز بلند کی بلکہ دوسروں کو بھی حرف حق کہنے پر مجبور کیا ۔احمد فراز دراصل ایک باغی شاعر ہیں اور ان کی سب سے بڑی بغاوت اس استحصالی معاشرے اور نظام سے ہے جو مفلسوں ، لاچاروں ، مزدوروں اور غریبوں کے ہاتھ سے نوالہ چھین کر خود کا پیٹ بھرتا ہے وہ جگہ جگہ ایسے نظام کو للکارتے نظر آتے ہیں ، انھوں نے ان تلخ حاقائق کو بیان کرنے میں خوشنما لفظوں کے پردہ کا ستعمال بہت کم کیا ہے ، یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر نظموں میں تلخیوں کی صاف گونج سنائی دیتی ہے۔ احمد فراز کو مظلوموں کی آہیں بہت متاثر کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کسانوں کی زبوں حالی ، مزدوورں کی کسمپرسی ، غریبوں کی پسماندگی ، مظلوموں کی بے بسی ، سفید پوشوں کی تنگ دستی ، خط غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی فاقہ کشی کی دل سوز تصویریں اپنی نظموں میں ایسی کھینچی ہیں کہ قاری کا دل بھر آئے ، ان کے پہلے مجموعے "تنہا تنہا " میں شامل نظم " اے بھوکی مخلوق اسی قبیل سے ہے۔ ترقی پسندیت احمد فراز کی شاعری کا ضروری وصف ہے بلکہ وہ عملی طور پر بھی اس میں شریک رہے ، انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین پشار کے لئے سکریٹری کے فرائض بھی انجام دئے۔

فراز کا شعری شعور بھی بیسویں صدی کے درمیانی دور کی پیداوار ہے اور یہ ایسا دور ہے جس میں عالمی اور مقامی سطح پر ہر قسم کی قدروں میں ان گنت تبدیلیاں ہوئی ہیں ، انھوں نے ان ہی ہم عصر زندگی کے تلخ سماجی حقائق کو اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔ احمد فراز نے اپنی غزل کے ذریعے جدید موضوعات فراہم

کئے، ساتھ ہی ساتھ نئی اور تازہ تراکیب کا استعمال کر کے ان تراکیب کے موجد بھی بنے۔ دراصل فراز کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے نئی تراکیب کے استعمال کرنے میں روایت سے رشتہ کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، روایت سے رشتہ قائم رکھنے کی بناپر فراز کی تراکیب میں جدت اور تازگی پیدا ہوگئی۔ انھوں نے جہاں بیسویں، اکیسویں صدی کی بھرپور نمائندگی کی وہیں حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا ان کی شاعری کو صرف کلاسیکی یا صرف رومانی شاعری نہیں کہا جاسکتا ہے بلکہ دورِ حاضر کے لطیف ذہنی ردِّ عمل کا سچا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

آزادی کے بعد خاص کر ساٹھ کی دہائی میں نئی غزل کھل کر سامنے آتی ہے اور ہندو پاک میں اس کا زبردست احیاء ہوتا ہے۔ اسی دوران 1958 میں جب احمد فراز کا پہلا شعری مجموعہ "تنہا تنہا" شائع ہوا اسی دوران ناصر کاظمی کا شعری مجموعہ "برگِ نے" ابن انشا کا "چاند نگر" اور خلیل الرحمن اعظمی کا شعری مجموعہ "کاغذی پیرہن" بھی منظرِ عام پر آیا۔ تنہا تنہا" برگِ نے"، "چاند نگر" اور کاغذی پیرہن" کے منظر عام پر آنے کے بعد نئی شعری فضا کی تعمیر ہوئی اور نئی شعری تازگی کا احساس شعرا میں عام ہوا، اس دور کی شاعری میں روایتی انداز سے احتراز کیا گیا تھا اور موضوعات و لفظیات کے نئے تجربات کئے گئے تھے، نئی نسل کے شعراء نے اسلوب، علامت پسندی اور پیکریت کو اپنا مقدر تصور کیا اور زمانے کے اردگرد کی ایسی اشیاء جن سے صدیوں کا رشتہ تھا تاہم کلاسکی شاعری میں انھیں قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا تھا کو نئی شاعری میں جگہ دی اس طرح ادب کا جمود ٹوٹا اور نئی شاعری وجود میں آئی۔

فراز کی شاعرانہ تخلیقات میں تاحال چودہ شعری مجموعے اور اور "شہر سخن آراستہ ہے" کے نام سے ایک کلیات ہے۔

1985ء میں جب احمد فراز کا پہلا شعری مجموعہ "تنہا تنہا" منظر عام پر آیا وہیں سے ان کی شاعری کے سنہرے دور کا آغاز ہوا، یہ مجموعہ دیکھتے دیکھتے نوجوان نسل کا ترجمان بن گیا اس مجموعے میں جو نظریات پیش کئے گئے تھے وہ نوجوانوں کے دل کے بہت قریب تھے۔ یہ مجموعہ دیکھتے دیکھتے نوجوان نسل کا ترجمان بن گیا، اس مجموعے میں شکووں کی جذباتی لے کثرت سے دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس مجموعے کی اکثر نظمیں سرمایہ دارانہ نظام، اونچ نیچ اور طبقاتی کشمکش کے خلاف ہیں۔

"درد آشوب" فراز کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو 1966ء میں منظر عام پر اس مجموعے کو شاعری کی بہترین کاوش قرار دیا گیا اور اس مجموعے پر احمد فراز کو پاکستان رائٹرز گلڈ کے تحت آدم جی آوارڈ سے نوازا گیا، درد آشوب میں انقلابی نظریہ تھا اس مجموعہ کی شاعری کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے اندر نہ صرف نیا اسلوب اختیار کئے ہوئے تھا بلکہ ساری اردو شاعری کو ایک نیا لہجہ اور نیا احساس دلا رہا تھا۔

"نایافت" فراز کا تیسرا شعری مجموعہ ہے، یہ مجموعہ اس وقت منظر عام پر آیا جب پاکستان میں جمہوریت کا آغاز ہو چکا تھا اس مجموعے میں احمد فراز نے زیادہ تر نظموں کی جانب توجہ دی۔

"شب خون" احمد فراز کا چوتھا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ اس دور کی پیداوار ہے جب فراز باقی لوگوں کی طرح خود کو محب وطن ہونے کا ثبوت دیرہت تھے، انھوں نے وطن کی محبت میں امن کے گیت گائے اور بے شمار ترانے لکھے، جو ""شب خون" " میں شامل ہیں، ان کا یہ پورا مجموعہ ہندو پاک جنگ اور تقسیم بنگال سے متعلق ہے،

"مرے خواب ریزہ ریزہ" فراز کا پانچواں مجموعہ ہے، اس مجموعے میں فراز کے چار منظوم ڈرامے ہیں یہ ڈرامے فراز نے اس زمانے میں لکھے تھے جبکہ وہ پاکستان ریڈیو میں بر سر ملازمت تھے۔ پاکستان ریڈیو کے لئے جو ڈرامے لکھے تھے انھیں کو فراز نے "مرے خواب ریزہ ریزہ" کے نام سے شائع کیا،

"جاناں جاناں" فراز کا چھٹا شعری مجموعہ ہے جو کہ ۱۹۷٦ء میں منظر عام پر آیا، جس وقت فراز کا یہ شعری مجموعہ منظر عام پر آتا ہے اس وقت وہ پاکستان نیشنل سنٹر کے ڈائریکٹر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ ذوالفقار علی بھٹو کے جمہوری حکومت کا دور تھا اور ذوالفقار علی بھٹو فراز کے آئیڈیل تھے، لیکن اس کے باوجود اس زمانے میں جمہوری حکومت کے خلاف مزاحمت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

"بے آواز گلی کوچوں میں" احمد فراز کا ساتواں مجموعہ کلام ہے اس مجموعے میں فراز کے قید تنہائی کی چند عبارتیں موجود ہیں، اور پاکستان کی سیاسی بدحالی کو انھوں نے "ایک بد نما صبح کے نام" سے کچھ نظمیں پیش کی ہیں۔ یہ مجموعہ کلام اپنے دور کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

"نابینا شہر میں آئینہ" فراز کا آٹھواں شعری مجموعہ، اس مجموعے میں فراز انسان دوستی کے مفہوم کو سمجھانے کے لئے سرگرم عمل دکھائی دیتے۔

"سب آوازیں میری ہیں "احمد فراز کا نواں ہے جو کہ تراجم پر مشتمل ہے اس میں کل چھتیس نظمیں شامل ہی

"پس انداز موسم "احمد فراز کا دسواں شعری مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں احمد فراز کی شاعری کا گہرا رنگ دکھائی دیتا ہے، چنانچہ اس مجموعے میں فیض احمد فیض جیسی جارحیت اور اور حبیب جالب کی طرح طنزیہ لہجہ ملتا ہے۔ پس انداز موسم میں اوجڑی کیمپ کے المیے کے حوالے سے لکھی گئی نظم **"شہر نامہ"** احمد فراز کی بلند حوصلگی کا ثبوت ہے۔

"بودلک" فراز کے منظوم ڈراموں کا مجموعہ ہے، یہ منظوم ڈرامہ بودلک کافرستان کے روایتی کرداروں اور اور افریقی مصنفین کا گویا کہ ملغوبہ ہے۔

"خواب گل پریشاں ہے "فراز کا بارہواں شعری مجموعہ ہے اس مجموعے کا آغاز ہی ان کی مشہور غزل "سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں " سے ہوتا ہے، اس مجموعے میں فراز نے استادانہ رنگِ شاعری اختیار کیا ہے، کلاسکی شعراء کی تقلید میں ان کی زمینوں میں غزلیں کہیں ہیں۔

"غزل بہانہ کروں" احمد فراز کا تیرواں شعری مجموعہ ہے، یہ مجموعہ الگ مزاج اور جداگانہ رنگ رکھتا ہے خالص غزل کے متلاشی حضرات یہاں اپنے ذوق کی تسکین محسوکریں گے

"اے عشق جنوں پیشہ "احمد فراز کا نہایت ہی خوبصورت چودھواں اور آخری شعری مجموعہ ہے، اس مجموعے کی شاعری کا وہ زمانہ ہے جس زمانے میں جنرل پرویز مشرف نواز شریف کا تختہ پلٹ رہے تھے، اس مجموعہ میں خوبصورت علامات، استعارات، کنایہ اور تشبیہات سے کام لیا گیا ہے، اس مجموعے کی خاص بات اچھوتے ردیف و اقافیہ ہیں جنھیں موضوع و مواد، جذبہ و خیال، فکر اور طرزِ فکر، الفاظ و تراکیب کی نغمگی کے علاوہ بحر و وزن اور موسیقیت کی لڑی میں پروکر زندگی عطا کر دی گئی۔

فراز ایک واضح نظریہ حیات اور ایک خاص نقطہ نظر رکھتے ہیں جو ان کے گہرے سیاسی، سماجی اور معاشرتی شعور کا آئینہ دار ہے۔ان کی شاعری میں حالات کو بدلنے کا جذبہ بہت واضح ہے، وہ آزادی کے پرستار، مساوات کے حامی اور سرمایہ داری کے دشمن ہیں، محبت، اخوت اور انسان دوستی ان کا مذہب ہے، وہ تقدیر پر تکیہ نہیں کرتے بلکہ اپنی قوتِ بازو سے ساز گار حالات کو بدلنے پر یقین رکھتے ہیں، ان

کے یہاں احساس کی شدت اور جذبے کا خلوص ہے جس سے سوز و درد کا اظہار ہوتا ہے لیکن اس سوز و درد میں مایوسی نہیں ہے بلکہ امید و حوصلہ اور اراہ وولولہ ہے ان کی غزل کا چہرہ ایسا چہرہ بتایا جتا ہے جو ہر دور میں شادابی کی نوید لیکر ابھرنے والا ہے،روبہ زوال قدروں کا دکھ ہو یا غریب الوطنی کا دور احمد فراز نے اپنی غزلوں میں ان احساسات کو اپنے منفرد انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری اشعار کے آئینے میں اپنی تصویر دیکھتا ہے، ان کی غزلوں میں عزم واستقلال ہے جو زندگی کو بیداریٔ غم بخشتے ہیں۔ ان کے سبھی شعر ایک ایسا شعری تجربہ ہیں جہاں شاعر پوری حسیت اور لطافت کو برقرار رکھتے ہوئے جدید روشنی کی تلاش میں سنہری وادیوں کی سیر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ تاریکی سے تیر چلانے کے روادار نہیں ہیں۔ ہر بات بھرپور اجالے میں کہی جاتی ہے۔ ان کے یہاں شدّت وشکایت جیسی متضاد باتیں نہیں ملتیں۔ کہیں کہیں وہ کسی بات سے مجروح ہوتے بھی ہیں تو اپنے زخم کو چھپانے کے لیے وہاں پھول ڈال دیتے ہیں اور کہیں انہیں پھولوں کے درمیان کسی کے زخم کو تلاشا بھی کیفیات کو تلاشنے میں بہت دلچسپی لیتے دکھائی دیتے ہیں۔

وہ ایک خوش فکر اور خوش آہنگ شاعر تھے ان کی شاعری کے نیم انقلابی آہنگ نے ان کے لہجے میں ایک الگ اور نیا تیور پیدا کر دیا تھا۔ فراز ایک کامیاب غزل گو تھے حالات حاضرہ پر ان کی گہری نظر تھی اور اپنی غزل میں انھوں نے موجودہ زندگی کے تمام مسائل کو سمو لیا تھا، انکی ایک بڑی خوبی ان کے لہجے کا سکون تھا ایسا لگتا ہے کہ غزل کا مزاج ان کے اندر رچ بس گیا ہو۔ ان کی شاعری غم دوراں اور غم جاناں کا ایک حسین سنگم ہے۔ ان کی غزلیں اس تمام کرب و الم کی غمازی کرتی ہیں جس سے ایک حسّاس اور رومانٹک شاعر کو دوچار ہونا پڑتا ہے، فراز کی غزل میں عشق و محبت کی واردات، معمالات عشق کا بیان، محبوب کے حسن کی چکاچوند ملاقات، گلے شکوے، رسم وراہ، وفا و بے وفا، قول و قرار، جدائی اور وصال سب لذتیں موجود ہیں۔ "ان کی غزل دراصل صنف غزل کی تمام روشن روایات کے جدید اور سلیقہ مندانہ اظہار کا نام ہے" فراز کی غزل تکمیل کی انتہا بتائی جاتی ہے ، ان کی شناخت کا بنیادی حوالہ غزل ہی ہے غزل بھی ایسی جو اپنا شجرہ نسب رکھتی ہے، ان کی غزلوں میں موسیقیت اور غنائیت کا نہایت دلآویز رچاؤ

ملتا ہے۔ محبت ان کی نظر میں ایک مقدس جذبہ رہا ہے اس کا تعلق محض مردوں اور عورتوں کے تعلق سے نہیں بلکہ یہ وہ لطیف جذبہ ہے جو انسان کو علویت تک پہنچاتا ہے وہ دعا کرتے ہیں

اے خدا سب کا مقدر کر دے
وہ محبت جو انساں کو پیمبر کر دے

ویسے تو فرازؔ نے غزل سے زیادہ شہرت پائی۔ مگر ان کی نظمیں بھی خوب ہیں۔ بعض نظموں کو چھوڑ کر انھوں نے اپنی نظموں کو نعرہ میں نہیں تبدیل ہونے دیا۔ فراز نے اپنے دل پذیر اسلوب سے بطور خاص کام لیا۔ اس لئے فراز کا سیاسی شعر بھی شعر ہی رہتا ہے۔ فراز نے کسی آمر سے سمجھوتہ نہیں کیا اور آزاد انہ طور پر ادب تخلیق کیا۔ انہوں نے ضیاء جیسے آمر کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا۔ ان کی بیشتر عمدہ سیاسی نظمیں ضیاء اور تقسیم پاکستان کے وقت کی یادگار ہیں،
احمد فراز کی نظموں میں احتجاجی رنگ و آہنگ غزلوں کے مقابلے میں زیادہ واضح شکل میں ابھر کر آیا ہے غزلوں میں وہی بات جہاں استعاروں اور علامتوں میں کہی گئی تھی وہی نظموں میں اس کی وضاحت نظر آتی ہے۔ ان کی نظموں میں احساس کی ایسی شدید تخلیقی توانائی اور حسن ہے کہ عصری حقائق کی ترجمانی کے باوجود آج بھی ان میں ایک انوکھی تازگی محسوس ہوتی ہے، مثال کے طور پر "شہر آشوب" "نئی مسافت کا عہد نامہ" "قلم سرخرو ہے" وغیرہ جیسی نظمیں ان کی بہترین مثالیں ہیں۔
فراز گرچہ طبعاً رومانی شاعر تھے لیکن ان کی رومانیت اختر شیرانی سے بہت مختلف ہے۔ ویسے تو بیشتر نظموں میں وہ ایک باغی شاعر نظر آتے ہیں مگر حبیب جالب اور جوش جیسا اسلوب نہیں پایا جاتا۔ بلکہ رومانیت اور بغاوت کے امتزاج سے انہوں نے نیا رنگِ سخن پیدا کیا اس لحاظ سے وہ فیض احمد فیض کے کافی قریب ہو جاتے ہیں

ادب اور زندگی میں صداقت، راست گوئی اور اپنے تہذیبی ورثہ کو جلا دینا اور اپنے فن اور شاعری کو ایک بہتر زندگی، انصاف پسند معاشرہ اور انسانی بہبودی کے لئے استعمال کرنا احمد فراز کے فن اور شعر کا

لازمی حصہ ہے۔ ان کی شاعری انقلابِ زندگی کی شاعری ہے وہ خیر و شر کی ازلی کشمکش میں حق و صداقت کا درس دیتے ہیں تفرقہ پرستی سے انھیں سخت نفرت ہے، ان کی شاعری کی تھیم اور بنیادی مقصد انسانوں سے محبت ہے۔ احمد فرازؔ کی آگہی اور ذہانت اپنے عہد کے نت نئے تقاضوں سے پوری طرح باخبر رہی ہے۔ انھوں نے ظلم و جبر اور استحصال کی سفاک طاقتوں کے مقابلے میں اپنے وطن کے اور ساری دنیا کے دبے کچلے انسانوں کی طرف داری کا عہد کیا ہے اور اس ستم کیش کوچہ میں مجاہدانہ بانکپن سے آگے بڑھتے ہوئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ ان کی شاعری صرف اپنے عہد کے حصار میں گھٹ کر رہ جانے والی نہیں بلکہ آئندہ زمانوں کی کھلی فضا میں پرواز کرنے والی، آنے والی نسلوں کے شعر و ادب پر اپنے سائے گہرے کرنے والی اور اپنی کرنیں مرکوز کرنے والی اور اردو شعریات کی پیشانی پر اپنی نگاہوں کا عکس چھوڑنے والی شاعری ہے

فراز کے علامتی اور استعاراتی نظام میں بالخصوص وہ علامتیں اور استعارے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں جو انھوں نے مارشل لاء کے دور میں استعمال کئے ہیں۔ مارشل لاء کے دور میں اُن کا علامتی نظام وسعت اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے، یہاں کچھ ایسی نئی علامتیں سامنے آتی ہیں جو ان کے یہاں پہلے دیکھنے کو نہیں ملیں مثلا "صبحِ کاذب" جو مارشل لاء کے لئے استعمال ہوا ہے پہلی بار سامنے آیا اس کے علاوہ سناٹا، خورشید، پیڑ، درخت، پرندے، شجر، طیور وغیرہ جیسی علامتیں اور استعارے بھی اس دور سے تعلق رکھتے ہیں

وہ ایسے استعاروں میں بات کرتے ہیں جو خطابت اور تنگ نظرانہ قوم پرستی سے بالاتر ہے، وہ حقیقی معنوں میں بین الاقوامی شاعر ہیں اور اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ ان کی نظمیں اس وقت بھی عشق سے مملو ہوتی ہیں جب وہ وہ بغاوت کرتے ہیں۔" وہ ایک بہادر، نڈر اور انقلابی شاعر تھے، وہ ڈکٹیٹروں کے پہلو میں ایک خنجر تھے۔ احمد فراز کا خاص وصف یہ ہے کہ ان کا شعر بولتا ہے کہ ہوں میں احمد فراز کا شعر ہوں۔ احمد فراز فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے کلاسکی ادب سے رچے بسے تھے فراز اردو فارسی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے

فراز کے اشعار فوراً سمجھ آجانے والے اور دل پر اثر کرنے والے ہوتے ہیں ، سننے والوں کو ایسا لگتا ہے جیسے یہ ان کے اپنے تجربات اور محسوسات ہیں جو خوبصورت شعری آہنگ میں ڈھل گئے ہیں۔ فراز کے اشعار سن کر ہر شخص کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ اس کا اپنا حال بیان کیا جارہا ہو ، یہی فراز کی شاعری کی بڑی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے فراز ایک ہر دل عزیز شاعر بنے باقی رہی سہی کسر ضیاء الحق کے دور آمریت میں پوری ہو گئی جب "پیشہ ور قاتلو" نظم لکھنے کی پاداش میں ان کو گرفتار کیا گیا تو مزا حمتی شاعر کے حوالے سے بھی لوگوں میں مقبول ہوگئے۔ ان کی شاعری وطن اور اہل وطن کے لئے ایک مژدہ جانفزا تھی ان کی نظم ہو کہ غزل دونوں میں وارفتگی اور گہری جذباتیت کی رو دوڑتی نظر آتی ہے انھوں نے جہاں نظم کو نیا لہجہ اور قرار بخشا وہیں انھوں نے غزل کے روپ کو اپنے نازک احساسات اور خوبصورت خیالات سے سنوارا ہے۔

احمد فراز کے کلام کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ تشبیہ سے زیادہ استعارے میں دل چسپی رکھتے ہیں اس لئے بلاخوف و تردد کہا جاسکتا ہے کہ ان کا بنیادی اسلوب علامتی یا استعاراتی ہے ، ان کے استعارات میں ملی ، سیاسی ، معاشرتی ، تہذیبی اور عشق کے تصورات کا بھرپور اظہار ہے ان کی شاعری میں تشبیہ سے استعارے کی طرف واضح ارتقائی سفر نظر آتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا تخلیقی ذہن تشبیہ کے بجائے استعارے یا علامت کی طرف زیادہ مائل ہے لیکن ان کی تشبیہات اور استعارات میں ان کے فن کی طرحداری اور رعنائی بدرجۂ اتم موجود ہے ، ان کے کلام میں استعمال ہونے والے استعارے اور علامتیں اپنی پر اسرار طلسمی معنویت کے پیش نظر نہایت قابلِ قدر ہیں ، جو رومانی ماورائیت کے حامل ہونے کے علاوہ زندگی کے حقائق کو بھی آشکار کرتے ہیں

چھاؤں میں بیٹھنے والے ہی تو سب سے پہلے

پیڑ گرتا ہے تو آجاتے ہیں آرے لیکر

کتابیات

نمبر شمار	مصنف	کتاب	ناشر	سنہ اشاعت
1	احمد فراز	کلیات احمد فرازا	فرید بک ڈپو لمیٹیڈ دہلی	2016
2	سلیم اختر	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	2005
3	نیر صمدانی	اعتبارات (تنقید)	الوقار لاہور	1998
4	ممتاز الحق ڈاکٹر	جدید غزل کا فنی، سیاسی و سماجی مطالعہ	ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	1998
5	قمر رئیس	معاصر اردو غزل	اردو اکادمی دہلی	1996
6	حسین اشفاق	احمد فراز یادوں کا ایک سنہرا ورق	وجدان پبلی کیشنز لاہور	2009
7	محمد ملک، فتح	احمد فراز کی شاعری نغمۂ دلدار یا شعلہ بیدار	دوست پبلی کیشنز اسلام آباد	2012
8	ظفر محبوب	احمد فراز شخصیت اور فن	اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد	2006
9	ارتضی کریم، ڈاکٹر	اردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے رویے	اردو اکادمی، دہلی	2004
10	آغا ظفر حسنین، ڈاکٹر	مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری	ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	2006
11	توصیف تبسم	بند گلی میں شام	عکاس پبلی کیشنز اسلام آباد	2010
12	زیتون بانو، تاج سعید	احمد فراز شخصیت اور فن	دوست پبلیکیشنز، لاہور	2009
13	زاہدہ جبیں	وہ جو شہر سخن تھا، احمد فراز شخصیت اور فن	گوہر پبلی کیشنز لاہور	موجود نہیں
14	فرمان فتح پوری	اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ	وکٹر بک بنک، لاہور	1990
15	ڈاکٹر ساجد امجد	اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات	غضنفر اکیڈمی پاکستان کراچی	1994
16	انور صابر، ڈاکٹر	پاکستان میں اردو غزل کا ارتقاء	، مغربی پاکستان اکیڈمی	2002
17	خلیل الرحمن اعظمی، ڈاکٹر	نئی نظم کا سفر	مکتبہ جامعہ، دہلی	1972
18	حافظ تقی الدین	جرنیل سے جرنیل تک	کلاسیک 42 دی مال، لاہور	2003

19	قیوم نظامی	جرنیل اور سیاست دان تاریخ کی عدالت میں	جہانگیر بکس، کراچی	2006
20	مرتضی انجم	کون کیسے گیا	دارالشعور، لاہور	2013
21	سجاد ظہیر	روشنائی	آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل دہلی	1959
22	یعقوب راہی	باقر مہدی عصری آگہی وشاعری	تکمیل پبلی کیشنز ممبئی، بھیونڈی	2005
23	خلیل الرحمن اعظمی	نیا عہد نامہ	انڈین بک ہاؤس، علی گڑھ	1965
24	شمیم حنفی	غزل کا نیا منظر نامہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	1981
25	کوثر مظہر	ہندوستانی ادب کا معمار وحید اختر	ساہتیہ اکادمی دہلی	2008
26	احمد فراز	خواب گل پریشاں ہے	کاک پرنٹرس، دہلی	2002
27	احمد فراز	نایافت	کاک پرنٹرس، دہلی	2002
28	فتح محمد ملک	تحسین وتردید	لاہور سنگ میل پبلی کیشنز	1995

رسائل وجرائد

نمبر شمار	نام	شمارہ نمبر	سنہ اشاعت
1	ماہنامہ نصرت	شمارہ نمبر 11	اگست 1966
2	ہفت روزہ لیل ونہار	جلد 7 شمارہ 12	31 مارچ۔1957
3	اخبار اردو	جلد 25 شمارہ 9	ستمبر 2008
4	ادبیات اسلام (فراز نمبر)	جلد: 18 شمارہ 81	اکتوبر تا دسمبر۔2008
5	ماہنامہ چہار سو (فراز نمبر)	جلد: 3 شمارہ 30-31	جنوری، فروری 1995
6	ماہِ نو لاہور (فراز نمبر)	جلد 62: شمارہ 1	جنوری 2009
7	فنون لاہور	شمارہ نمبر 4	جولائی۔دسمبر 1993
8	ارتباط، استنبول (فراز نمبر)	جلد: 3، شمارہ 2	نومبر 2012
9	امکان لکھنؤ (فراز نمبر)	48 واں شمارہ	ستمبر تا نومبر 2008
10	ایوان اردو دہلی (فراز نمبر)	جلد 22۔شمارہ 6	نومبر، دسمبر 2004
11	عکاس، اسلام آباد (فراز نمبر)	جلد 15۔شمارہ 4 تا 12	اپریل تا دسمبر 2008
12	زاویہ، امریکہ (فراز نمبر)	جلد: 8 شمارہ۔5-6	جنوری تا اگست 2009

Urdu point.com

www.rekhta.org

www.urdulife.com

www.kitabghar.com

احمد فراز شخصیت اور فن

مقالہ برائے

پی، ایچ، ڈی (اردو)

ریسرچ اسکالر

محمد فضیل اختر

نگران

پروفیسر رفعت النساء بیگم

شعبۂ اردو یونیورسٹی آف میسور،

میسور کرناٹک

مئی2019

Ahmad Faraz Shakhsiyath Aur Fan

Ph.D Thesis (Urdu)

By
Mohammed Fuzail Akhtar

Guide

Prof. Rafathunnisa Begum
Dept. of Studies in Urdu,
University of Mysore
Mysore, Karnataka.

May 2019

ماحصل

برصغیر ہندوپاک کی تقسیم ایک ایسا حادثہ ہے، جس کا اثر برصغیر ہندوپاک میں آج تک محسوس کیا جارہا ہے، تقسیم کی وجہ سے دنیا کی سب سے بڑی آبادی مذہب و نسل کے نام پر نقل مکانی پر مجبور ہوئی ، جس کے نتیجے میں ہجرت کے دوران بدترین فسادات عمل میں آئے ، انسانیت حیوانیت میں تبدیل ہوچکی تھی، پورا برصغیر بدترین دور میں داخل ہوچکا تھا یہ عہد ترقی پسند تحریک کے شباب کا زمانہ تھا اور اس کے اثرات ادب کے علاوہ سیاست، ثقافت اور سماج پر بھی مرتب ہورہے تھے، مذکورہ دور پاکستان کے لئے ایک مبسوط پاکستانی قوم کی تشکیل کا دور تھا، چونکہ ایک نیا ملک جو دنیا کے نقشے پر ابھی ابھی ابھرا تھا، وہ قومی خدوخال مرتب کرنے کی کوشش کررہا تھا لیکن وہ ابھی بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوسکا تھا کہ اس کی بدقسمتی کے دن شروع ہوگئے، سیاسی افراتفری اور ملکی سطح پر پھیلی بدامنی اور بے چینی کی ایسی کیفیت تھی جس کا فائدہ اٹھا کر وہاں 1958ء میں تربیت پارہی جمہوریت کا گلا گھونٹ کر مارشل لا نافذ کر دیا گیا، جس کا ردعمل ملا جلا رہا معاشرے کے ایک طبقے نے یہ امید قائم کرلی کہ شائد پاکستان اب کسی نہ کسی راستے کا انتخاب کرہی لیگا، حالانکہ یہ محض خوش فہمی تھی۔ اس موقع پر کچھ ادیب حضرات تو مصلحت کی خاطر خاموشی اختیار کرگئے۔ کچھ بک گئے، جھک گئے۔ ڈر کے مارے دل کی بات زبان پر لانے سے کترانے لگے۔ لیکن کچھ شاعر وادیب ایسے بھی

سامنے آگئے کہ ہمت اور حوصلے کے ساتھ اس دور کے تمام ناقابلِ قبول امور کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کا اظہار کرنے لگے۔ فرازؔ جیسے حساس دل رکھنے والے شاعر بھی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اُنھوں نے اس دور حکومت کی ناقص پالیسیوں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی بے حسی، برائے نام جمہوریت، عدم مساوات، ظلم وستم، انسانی حقوق کی پامالی اور آمریت کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ انھوں نے ہر طرح سے اس سیاسی انارکی، کی مخالفت کی ان حضرات نے احتجاج کی آواز بلند

کی جن میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی حبیب جالب اور احمد فراز وغیرہ اہم ہیں، جو اپنے مخصوص لہجے میں جبر واستبداد کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔
احمد فراز14 جنوری 1931ء کو صوبۂ سرحد میں واقع نوشہرہ (پشاور) میں پیدا ہوئے۔ احمد فرازؔ کا تعلق کوہاٹ کے ایک معروف اور کثیر التعداد خانوادے میاں خیل سے تھا جو ایک معزز سید خاندان سمجھا جاتا ہے، ان کے آباؤ واجداد میں حاجی بہادر نامی ایک صوفی منش بزرگ گزرے تھے آپ کے پر دادا کا مزار کوہاٹ شہر کے وسط میں آج بھی خاص و عام کی زیارت گاہ ہے اور اس سے متصل ایک قبرستان ہے جو ان کا آبائی قبرستان ہے جس میں صرف آپ کے گھرانے کے لوگ مدفون ہیں۔ احمد فراز نے ادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں ، فراز کے والد اردو اور فارسی کے بڑے ادیب تھے جس کی وجہ سے ان کے یہاں شیخ سعدی ، بیدل ، حافظ شیرازی ، اور مرزا غالب کے چرچے بچپن سے وہ سنا کرتے تھے۔

فراز کو شاعری ورثے میں ملی تھی ، فراز کی شاعرانہ قد و قامت میں ان کے والد کا بڑا ہاتھ ہے ،فراز کے والد برق کوہاٹی پشاور کے محلہ ناصر طاہر وردی عرف کوچہ رسال دار عقب قصہ خوانی میں جنم لینے والی اس خطے کی اولین ادبی انجمن "بزم سخن "کے لئے سر گرم عمل تھے اس زمانے میں برق کوہاٹی کے ادبی حریف ضیاء جعفری " دائرۂ ادبیہ " چلاتے تھے ، برق کوہاٹی " بزم سخن "کے اور ضیا جعفری " دائرۂ ادبیہ " کے صدر نشین تھے ، فراز کا شاعری کے ابتدائی دور میں " بزمِ سخن "میں اٹھنا بیٹھنا تو تھا ہی اس کے ساتھ ساتھ وہ دائرۂ ادبیہ میں بھی شرکت کرتے رہے ۔مذکورہ بالا دونوں انجمنوں کے اختتام پر پشاور کی ادبی محفلیں فارغ بخاری کے قائم کردہ ان کے مکان کی بیٹھک میں منعقد ہونے لگیں ، پشاور کے شعر و ادب کی ترقی ترویج میں اس بیٹھک کا بڑا ہاتھ ہے یہ ادبی بیٹھک قصہ خوانی ،پشاور کے محلہ خدا داد میں واقع تھی ، تقریبا پچیس برس تک یہ بیٹھک علم وفن کا مرکز بنی رہی اس بیٹھک میں احمد فراز کی ادبی سر گرمیاں شروع ہوئیں۔ فراز بھر پور سیاسی شعور کے

مالک تھے ، وہ پاکستانی سیاست اور سیاست دانوں کی نفسیات سے خوب واقف تھے ، قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں ہونے والے سیاسی اتار چڑھاؤ پر شروع سے ہی ان کی نظر گہری تھی چونکہ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا اس لئے بھی عوام دشمن سیاست دان اور سرمایہ دار زیادہ ان کے زیر عتاب رہے ، دوسرے یہ کہ جو لوگ شریک سفر نہ تھے زمام کار کا ان کے ہاتھوں میں آنا سب کے لئے پریشانی اور غم وغصے سے خالی بات نہیں تھی ۔

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے زمانے میں فراز نے مختلف ادباء و شعرا کو ظلم وجبر کے خلاف آواز اٹھانے کی ترغیب دی ، انھوں نے نہ صرف ببانگِ دہل آواز بلند کی بلکہ دوسروں کو بھی حرف حق کہنے پر مجبور کیا ۔احمد فراز دراصل ایک باغی شاعر ہیں اور ان کی سب سے بڑی بغاوت اس استحصالی معاشرے اور نظام سے ہے جو مفلسوں، لاچاروں، مزدوروں اور غریبوں کے ہاتھ سے نوالہ چھین کر خود کا پیٹ بھرتا ہے وہ جگہ جگہ ایسے نظام کو للکارتے نظر آتے ہیں، انھوں نے ان تلخ حاقائق کو بیان کرنے میں خوشنما لفظوں کے پردہ کا ستعمال بہت کم کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر نظموں میں تلخیوں کی صاف گونج سنائی دیتی ہے۔احمد فراز کو مظلوموں کی آہیں بہت متاثر کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کسانوں کی زبوں حالی، مزدوورں کی کسمپرسی، غریبوں کی پسماندگی، مظلوموں کی بے بسی، سفید پوشوں کی تنگ دستی،خط غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی فاقہ کشی کی دل سوز تصویریں اپنی نظموں میں ایسی کھینچی ہیں کہ قاری کا دل بھر آئے،ان کے پہلے مجموعے "تنہاتنہا " میں شامل نظم " اے بھوکی مخلوق اسی قبیل سے ہے۔ترقی پسندیت احمد فراز کی شاعری کا ضروری وصف ہے بلکہ وہ عملی طور پر بھی اس میں شریک رہے، انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین پشار کے لئے سکریٹری کے فرائض بھی انجام دئے۔

فراز کا شعری شعور بھی بیسویں صدی کے درمیانی دور کی پیداوار ہے اور یہ ایسا دور ہے جس میں عالمی اور مقامی سطح پر ہر قسم کی قدروں میں ان گنت تبدیلیاں ہوئی ہیں، انھوں نے ان ہی ہم عصر زندگی کے تلخ سماجی حقائق کو اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔احمد فراز نے اپنی غزل کے ذریعے جدید موضوعات فراہم

کئے، ساتھ ہی ساتھ نئ اور تازہ تراکیب کا استعمال کر کے ان تراکیب کے موجد بھی بنے۔ دراصل فراز کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے نئ تراکیب کے استعمال کرنے میں روایت سے رشتہ کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، روایت سے رشتہ قائم رکھنے کی بنا پر فراز کی تراکیب میں جدت اور تازگی پیدا ہوگئی۔ انھوں نے جہاں بیسویں، اکیسویں صدی کی بھرپور نمائندگی کی وہیں حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا ان کی شاعری کو صرف کلاسیکی یا صرف رومانی شاعری نہیں کہا جاسکتا ہے بلکہ دورِ حاضر کے لطیف ذہنی ردِّ عمل کا سچا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

آزادی کے بعد خاص کر ساٹھ کی دہائی میں نئ غزل کھل کر سامنے آتی ہے اور ہندو پاک میں اس کا زبردست احیاء ہوتا ہے۔ اسی دوران 1958 میں جب احمد فراز کا پہلا شعری مجموعہ "تنہا تنہا" شائع ہوا اسی دوران ناصر کاظمی کا شعری مجموعہ "برگِ نے" ابن انشا کا "چاند نگر" اور خلیل الرحمن اعظمی کا شعری مجموعہ "کاغذی پیرہن" بھی منظرِ عام پر آیا۔ تنہا تنہا" برگِ نے"، "چاند نگر" اور کاغذی پیرہن" کے منظر عام پر آنے کے بعد نئ شعری فضا کی تعمیر ہوئی اور نئ شعری تازگی کا احساس شعرا میں عام ہوا، اس دور کی شاعری میں روایتی انداز سے احتراز کیا گیا تھا اور موضوعات و لفظیات کے نئے تجربات کئے گئے تھے، نئ نسل کے شعراء نے اسلوب، علامت پسندی اور پیکریت کو اپنا مقدر تصور کیا اور زمانے کے اردگرد کی ایسی اشیاء جن سے صدیوں کا رشتہ تھا تاہم کلاسکی شاعری میں انھیں قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا تھا کو نئ شاعری میں جگہ دی اس طرح ادب کا جمود ٹوٹا اور نئ شاعری وجود میں آئی۔

فراز کی شاعرانہ تخلیقات میں تاحال چودہ شعری مجموعے اور اور "شہر سخن آراستہ ہے" کے نام سے ایک کلیات ہے۔

1985ء میں جب احمد فراز کا پہلا شعری مجموعہ "تنہا تنہا" منظر عام پر آیا وہیں سے ان کی شاعری کے سنہرے دور کا آغاز ہوا، یہ مجموعہ دیکھتے دیکھتے نوجوان نسل کا ترجمان بن گیا اس مجموعے میں جو نظریات پیش کئے گئے تھے وہ نوجوانوں کے دل کے بہت قریب تھے۔ یہ مجموعہ دیکھتے دیکھتے نوجوان نسل کا ترجمان بن گیا، اس مجموعے میں شکووں کی جذباتی لے کثرت سے دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس مجموعے کی اکثر نظمیں سرمایہ دارانہ نظام، اونچ نیچ اور طبقاتی کشمکش کے خلاف ہیں۔

"درد آشوب" فراز کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو 1966ء میں منظر عام پر اس مجموعے کو شاعری کی بہترین کاوش قرار دیا گیا اور اس مجموعے پر احمد فراز کو پاکستان رائٹرز گلڈ کے تحت آدم جی آوارڈ سے نوازا گیا، درد آشوب میں انقلابی نظریہ تھا اس مجموعہ کی شاعری کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے اندر نہ صرف نیا اسلوب اختیار کئے ہوئے تھا بلکہ ساری اردو شاعری کو ایک نیا لہجہ اور نیا احساس دلا رہا تھا۔

"نایافت" فراز کا تیسرا شعری مجموعہ ہے، یہ مجموعہ اس وقت منظر عام پر آیا جب پاکستان میں جمہوریت کا آغاز ہو چکا تھا اس مجموعے میں احمد فراز نے زیادہ تر نظموں کی جانب توجہ دی۔

"شب خون" احمد فراز کا چوتھا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ اس دور کی پیداوار ہے جب فراز باقی لوگوں کی طرح خود کو محب وطن ہونے کا ثبوت دیرہت تھے، انھوں نے وطن کی محبت میں امن کے گیت گائے اور بے شمار ترانے لکھے، جو ""شب خون" " میں شامل ہیں، ان کا یہ پورا مجموعہ ہند و پاک جنگ اور تقسیم بنگال سے متعلق ہے،

"مرے خواب ریزہ ریزہ" فراز کا پانچواں مجموعہ ہے، اس مجموعے میں فراز کے چار منظوم ڈرامے ہیں یہ ڈرامے فراز نے اس زمانے میں لکھے تھے جبکہ وہ پاکستان ریڈیو میں بر سر ملازمت تھے۔ پاکستان ریڈیو کے لئے جو ڈرامے لکھے تھے انھیں کو فراز نے "مرے خواب ریزہ ریزہ" کے نام سے شائع کیا،

"جاناں جاناں" فراز کا چھٹا شعری مجموعہ ہے جو کہ ۱۹۷۶ء میں منظر عام پر آیا، جس وقت فراز کا یہ شعری مجموعہ منظر عام پر آتا ہے اس وقت وہ پاکستان نیشنل سنٹر کے ڈائریکٹر کے طور پر کام کر رہے تھے ۔ اگرچہ یہ ذوالفقار علی بھٹو کے جمہوری حکومت کا دور تھا اور ذوالفقار علی بھٹو فراز کے آئیڈیل تھے، لیکن اس کے باوجود اس زمانے میں جمہوری حکومت کے خلاف مزاحمت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

"بے آواز گلی کوچوں میں" احمد فراز کا ساتواں مجموعہ کلام ہے اس مجموعے میں فراز کے قید تنہائی کی چند عبارتیں موجود ہیں، اور پاکستان کی سیاسی بدحالی کو انھوں نے "ایک بدنما صبح کے نام" سے کچھ نظمیں پیش کی ہیں۔ یہ مجموعہ کلام اپنے دور کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

"نابینا شہر میں آئینہ" فراز کا آٹھواں شعری مجموعہ، اس مجموعے میں فراز انسان دوستی کے مفہوم کو سمجھانے کے لئے سرگرم عمل دکھائی دیتے۔

"سب آوازیں میری ہیں "احمد فراز کا نواں ہے جو کہ تراجم پر مشتمل ہے اس میں کل چھتیس نظمیں شامل ہی

"پس انداز موسم "احمد فراز کا دسواں شعری مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں احمد فراز کی شاعری کا گہرا رنگ دکھائی دیتا ہے، چنانچہ اس مجموعے میں فیض احمد فیض جیسی جارحیت اور اور حبیب جالب کی طرح طنزیہ لہجہ ملتا ہے۔ پس انداز موسم میں اوجڑی کیمپ کے المیے کے حوالے سے لکھی گئی نظم **"شہر نامہ"** احمد فراز کی بلند حوصلگی کا ثبوت ہے۔

"بودلک" فراز کے منظوم ڈراموں کا مجموعہ ہے، یہ منظوم ڈرامہ بودلک کافرستان کے روایتی کرداروں اور اور افریقی مصنفین کا گویا کہ ملغوبہ ہے۔

"خواب گل پریشاں ہے "فراز کا بارہواں شعری مجموعہ ہے اس مجموعے کا آغاز ہی ان کی مشہور غزل "سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں "سے ہوتا ہے، اس مجموعے میں فراز نے استادانہ رنگِ شاعری اختیار کیا ہے، کلاسکی شعراء کی تقلید میں ان کی زمینوں میں غزلیں کہیں ہیں۔

"غزل بہانہ کروں "احمد فراز کا تیرواں شعری مجموعہ ہے، یہ مجموعہ الگ مزاج اور جداگانہ رنگ رکھتا ہے خالص غزل کے متلاشی حضرات یہاں اپنے ذوق کی تسکین محسو کریں گے

"اے عشق جنوں پیشہ "احمد فراز کا نہایت ہی خوبصورت چودھواں اور آخری شعری مجموعہ ہے، اس مجموعے کی شاعری کا وہ زمانہ ہے جس زمانے میں جنرل پرویز مشرف نواز شریف کا تختہ پلٹ رہے تھے، اس مجموعہ میں خوبصورت علامات، استعارات، کنایہ اور تشبیہات سے کام لیا گیا ہے، اس مجموعے کی خاص بات اچھوتے ردیف وا قافیہ ہیں جنھیں موضوع و مواد، جذبہ وخیال، فکر اور طرزِ فکر، الفاظ و تراکیب کی نغمگی کے علاوہ بحر ووزن اور موسیقیت کی لڑی میں پرو کر زندگی عطا کردی گئی۔

فراز ایک واضح نظریہ حیات اور ایک خاص نقطہ نظر رکھتے ہیں جو ان کے گہرے سیاسی، سماجی اور معاشرتی شعور کا آئینہ دار ہے۔ان کی شاعری میں حالات کو بدلنے کا جذبہ بہت واضح ہے، وہ آزادی کے پرستار، مساوات کے حامی اور سرمایہ داری کے دشمن ہیں، محبت، اخوت اور انسان دوستی ان کا مذہب ہے، وہ تقدیر پر تکیہ نہیں کرتے بلکہ اپنی قوتِ بازو سے سازگار حالات کو بدلنے پر یقین رکھتے ہیں، ان

کے یہاں احساس کی شدت اور جذبے کا خلوص ہے جس سے سوز و درد کا اظہار ہوتا ہے لیکن اس سوز و درد میں مایوسی نہیں ہے بلکہ امید و حوصلہ اور اراہ وولولہ ہے ان کی غزل کا چہرہ ایسا چہرہ بتایا جتا ہے جو ہر دور میں شادابی کی نوید لیکر ابھرنے والا ہے، روبہ زوال قدروں کا دکھ ہو یا غریب الوطنی کا دور احمد فراز نے اپنی غزلوں میں ان احساسات کو اپنے منفرد انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری اشعار کے آئینے میں اپنی تصویر دیکھتا ہے، ان کی غزلوں میں عزم واستقلال ہے جو زندگی کو بیدارئ غم بخشتے ہیں۔ ان کے سبھی شعر ایک ایسا شعری تجربہ ہیں جہاں شاعر پوری حسیت اور لطافت کو برقرار رکھتے ہوئے جدید روشنی کی تلاش میں سنہری وادیوں کی سیر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ تاریکی سے تیر چلانے کے روادار نہیں ہیں۔ ہر بات بھرپور اجالے میں کہی جاتی ہے۔ ان کے یہاں شدّت و شکایت جیسی متضاد باتیں نہیں ملتیں۔ کہیں کہیں وہ کسی بات سے مجروح ہوتے بھی ہیں تو اپنے زخم کو چھپانے کے لیے وہاں پھول ڈال دیتے ہیں اور کہیں انہیں پھولوں کے درمیان کسی کے زخم کو تلاشنا بھی کیفیات کو تلاشنے میں بہت دلچسپی لیتے دکھائی دیتے ہیں۔

وہ ایک خوش فکر اور خوش آہنگ شاعر تھے ان کی شاعری کے نیم انقلابی آہنگ نے ان کے لہجے میں ایک الگ اور نیا تیور پیدا کر دیا تھا۔ فراز ایک کامیاب غزل گو تھے حالات حاضرہ پر ان کی گہری نظر تھی اور اپنی غزل میں انھوں نے موجودہ زندگی کے تمام مسائل کو سمولیا تھا، انکی ایک بڑی خوبی ان کے لہجے کا سکون تھا ایسا لگتا ہے کہ غزل کا مزاج ان کے اندر رچ بس گیا ہو۔ ان کی شاعری غم دوراں اور غم جاناں کا ایک حسین سنگم ہے۔ ان کی غزلیں اس تمام کرب و الم کی غمازی کرتی ہیں جس سے ایک حسّاس اور رومانٹک شاعر کو دوچار ہونا پڑتا ہے، فراز کی غزل میں عشق و محبت کی واردات، معملات عشق کا بیان، محبوب کے حسن کی چکاچوند ملاقات، گلے شکوے، رسم وراہ، وفا و بے وفا، قول و قرار، جدائی اور وصال سب لذتیں موجود ہیں۔ "ان کی غزل دراصل صنف غزل کی تمام روشن روایات کے جدید اور سلیقہ مند انہ اظہار کا نام ہے" فراز کی غزل تکمیل کی انتہا بتائی جاتی ہے ، ان کی شناخت کا بنیادی حوالہ غزل ہی ہے غزل بھی ایسی جو اپنا شجرہ نسب رکھتی ہے، ان کی غزلوں میں موسیقیت اور غنائیت کا نہایت دلآویز رچاؤ

ملتا ہے۔ محبت ان کی نظر میں ایک مقدس جذبہ رہا ہے اس کا تعلق محض مردوں اور عورتوں کے تعلق سے نہیں بلکہ یہ وہ لطیف جذبہ ہے جو انسان کو علویت تک پہنچاتا ہے وہ دعا کرتے ہیں

اے خدا سب کا مقدر کر دے
وہ محبت جو انساں کو پیمبر کر دے

ویسے تو فرازؔ نے غزل سے زیادہ شہرت پائی۔ مگر ان کی نظمیں بھی خوب ہیں۔ بعض نظموں کو چھوڑ کر انھوں نے اپنی نظموں کو نعرہ میں نہیں تبدیل ہونے دیا۔ فراز نے اپنے دل پذیر اسلوب سے بطور خاص کام لیا۔ اس لئے فراز کا سیاسی شعر بھی شعر ہی رہتا ہے۔ فراز نے کسی آمر سے سمجھوتہ نہیں کیا اور آزادانہ طور پر ادب تخلیق کیا۔ انہوں نے ضیاء جیسے آمر کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا۔ ان کی بیشتر عمدہ سیاسی نظمیں ضیاء اور تقسیم پاکستان کے وقت کی یادگار ہیں،
احمد فراز کی نظموں میں احتجاجی رنگ و آہنگ غزلوں کے مقابلے میں زیادہ واضح شکل میں ابھر کر آیا ہے غزلوں میں وہی بات جہاں استعاروں اور علامتوں میں کہی گئی تھی وہی نظموں میں اس کی وضاحت نظر آتی ہے۔ ان کی نظموں میں احساس کی ایسی شدید تخلیقی توانائی اور حسن ہے کہ عصری حقائق کی ترجمانی کے باوجود آج بھی ان میں ایک انوکھی تازگی محسوس ہوتی ہے، مثال کے طور پر "شہر آشوب" "نئی مسافت کا عہد نامہ" "قلم سرخرو ہے" وغیرہ جیسی نظمیں ان کی بہترین مثالیں ہیں۔
فراز گرچہ طبعاً رومانی شاعر تھے لیکن ان کی رومانیت اختر شیرانی سے بہت مختلف ہے۔ ویسے تو بیشتر نظموں میں وہ ایک باغی شاعر نظر آتے ہیں مگر حبیب جالب اور جوش جیسا اسلوب نہیں پایا جاتا۔ بلکہ رومانیت اور بغاوت کے امتزاج سے انہوں نے نیا رنگِ سخن پیدا کیا اس لحاظ سے وہ فیض احمد فیض کے کافی قریب ہو جاتے ہیں

ادب اور زندگی میں صداقت، راست گوئی اور اپنے تہذیبی ورثہ کو جلا دینا اور اپنے فن اور شاعری کو ایک بہتر زندگی، انصاف پسند معاشرہ اور انسانی بہبودی کے لئے استعمال کرنا احمد فراز کے فن اور شعر کا

لازمی حصہ ہے۔ ان کی شاعری انقلابِ زندگی کی شاعری ہے وہ خیر و شر کی ازلی کشمکش میں حق و صداقت کا درس دیتے ہیں تفرقہ پرستی سے انھیں سخت نفرت ہے، ان کی شاعری کی تھیم اور بنیادی مقصد انسانوں سے محبت ہے۔احمد فرازؔ کی آگہی اور ذہانت اپنے عہد کے نت نئے تقاضوں سے پوری طرح باخبر رہی ہے۔ انھوں نے ظلم و جبر اور استحصال کی سفاک طاقتوں کے مقابلے میں اپنے وطن کے اور ساری دنیا کے دبے کچلے انسانوں کی طرف داری کا عہد کیا ہے اور اس ستم کیش کوچہ میں مجاہدانہ بانکپن سے آگے بڑھتے ہوئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ ان کی شاعری صرف اپنے عہد کے حصار میں گھٹ کر رہ جانے والی نہیں بلکہ آئندہ زمانوں کی کھلی فضا میں پرواز کرنے والی، آنے والی نسلوں کے شعر و ادب پر اپنے سائے گہرے کرنے والی اور اپنی کرنیں مرکوز کرنے والی اور اردو شعریات کی پیشانی پر اپنی نگاہوں کا عکس چھوڑنے والی شاعری ہے

فراز کے علامتی اور استعاراتی نظام میں بالخصوص وہ علامتیں اور استعارے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں جو انھوں نے مارشل لاء کے دور میں استعمال کئے ہیں۔ مارشل لاء کے دور میں اُن کا علامتی نظام وسعت اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے، یہاں کچھ ایسی نئی علامتیں سامنے آتی ہیں جو ان کے یہاں پہلے دیکھنے کو نہیں ملیں مثلاً "صبحِ کاذب" جو مارشل لاء کے لئے استعمال ہوا ہے پہلی بار سامنے آیا اس کے علاوہ سناٹا، خورشید، پیڑ، درخت، پرندے، شجر، طیور وغیرہ جیسی علامتیں اور استعارے بھی اس دور سے تعلق رکھتے ہیں

وہ ایسے استعاروں میں بات کرتے ہیں جو خطابت اور تنگ نظرانہ قوم پرستی سے بالاتر ہے، وہ حقیقی معنوں میں بین الاقوامی شاعر ہیں اور اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ ان کی نظمیں اس وقت بھی عشق سے مملو ہوتی ہیں جب وہ وہ بغاوت کرتے ہیں۔" وہ ایک بہادر، نڈر اور انقلابی شاعر تھے، وہ ڈکٹیٹروں کے پہلو میں ایک خنجر تھے۔ احمد فراز کا خاص وصف یہ ہے کہ ان کا شعر بولتا ہے کہ ہوں میں احمد فراز کا شعر ہوں۔ احمد فراز فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے کلاسکی ادب سے رچے بسے تھے فراز اردو فارسی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے

فراز کے اشعار فوراً سمجھ آجانے والے اور دل پر اثر کرنے والے ہوتے ہیں ، سننے والوں کو ایسا لگتا ہے جیسے یہ ان کے اپنے تجربات اور محسوسات ہیں جو خوبصورت شعری آہنگ میں ڈھل گئے ہیں۔ فراز کے اشعار سن کر ہر شخص کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ اس کا اپنا حال بیان کیا جارہا ہو ، یہی فراز کی شاعری کی بڑی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے فراز ایک ہر دل عزیز شاعر بنے باقی رہی سہی کسر ضیاء الحق کے دور آمریت میں پوری ہوگئی جب "پیشہ ور قاتلو" نظم لکھنے کی پاداش میں ان کو گرفتار کیا گیا تو مزا حمتی شاعر کے حوالے سے بھی لوگوں میں مقبول ہوگئے۔ ان کی شاعری وطن اور اہل وطن کے لئے ایک مژدہ جانفزا تھی ان کی نظم ہو کہ غزل دونوں میں وارفتگی اور گہری جذباتیت کی رو دوڑتی نظر آتی ہے انھوں نے جہاں نظم کو نیا لہجہ اور قرار بخشا وہیں انھوں نے غزل کے روپ کو اپنے نازک احساسات اور خوبصورت خیالات سے سنوارا ہے۔

احمد فراز کے کلام کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ تشبیہ سے زیادہ استعارے میں دل چسپی رکھتے ہیں اس لئے بلاخوف و تردد کہا جاسکتا ہے کہ ان کا بنیادی اسلوب علامتی یا استعاراتی ہے ، ان کے استعارات میں ملی ، سیاسی ، معاشرتی ، تہذیبی اور عشق کے تصورات کا بھرپور اظہار ہے ان کی شاعری میں تشبیہ سے استعارے کی طرف واضح ارتقائی سفر نظر آتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا تخلیقی ذہن تشبیہ کے بجائے استعارے یا علامت کی طرف زیادہ مائل ہے لیکن ان کی تشبیہات اور استعارات میں ان کے فن کی طرحداری اور رعنائی بدرجۂ اتم موجود ہے ، ان کے کلام میں استعمال ہونے والے استعارے اور علامتیں اپنی پر اسرار طلسمی معنویت کے پیش نظر نہایت قابلِ قدر ہیں ، جو رومانی ماورائیت کے حامل ہونے کے علاوہ زندگی کے حقائق کو بھی آشکار کرتے ہیں

چھاؤں میں بیٹھنے والے ہی تو سب سے پہلے

پیڑ گرتا ہے تو آجاتے ہیں آرے لیکر